شمع فروزاں

رب کے دربار میں

شمع فروزاں

نیا عہد —— نئے مسائل

شمع فروزاں

حقائق اور غلط فہمیاں

شمع فروزاں
(حصہ اول)

اُردو کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد اور ملک کے دوسرے معروف اُردو اخبارات میں شائع ہونے والے مقبول عام وخاص کالم کے دو سال (6-2005) کے مضامین کا مجموعہ، جس میں ملکی و بین ملکی پس منظر میں نئے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے، دلآویز اُسلوب، عام فہم زبان اور دلچسپ طرزِ بیان۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بہ اہتمام : ings\Administrator\Desktop\Mahac not found.

ناشر: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارن پور (یو پی)

طبع اول

۱۴۲۹ھ — ۲۰۰۸ء

نام کتاب	شمع فروزاں (حصہ اول)
تالیف	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
ترتیب	مولانا محمد رضوان محفوظ قاسمی
صفحات	۳۲۰
کمپیوٹر کتابت	محمد نصیر عالم سبیلی (''العالم'' اُردو کمپیوٹر سنٹر)

بیت العلم 36-2 بارکس، کوتہ پیٹ حیدر آباد، فون: 0-9959897621

به اہتمام

ings\Administrator\Desktop\Mahac
not found.

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدر آباد
- دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، نزد پانی کی ٹانکی، حیدر آباد
- ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان، حیدر آباد

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

حقائق اور غلط فہمیاں

❑ ❑ ❑ ❑

حرفِ آغاز

یاد ش بخیر، ۱۹۹۹ء کے اواخر سے اس حقیر نے ''مصنف'' میں ''شمع فروزاں'' کا کالم لکھنا شروع کیا، چنانچہ ایک سال میں طبع ہونے والے مضامین کا مجموعہ 'شمع فروزاں' (صفحات: ۲۷۰) ہی کے نام سے ۲۰۰۲ء میں طبع ہوا، جسے میرے عزیز دوست جناب سید میر اکرم علی (حال مقیم امریکہ) نے شائع کیا تھا، اس مجموعہ کے شروع میں میں نے جو ابتدائیہ لکھا تھا وہ معمولی تبدیلی کے ساتھ —— ''اللہ رحمان ورحیم کے نام سے'' کے عنوان سے اس مجموعہ میں شامل رکھا گیا ہے، تاکہ اپنے محسنوں کا ذکر باقی رہے، پھر ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۴ء تک کے مضامین کا مجموعہ پہلے مجموعہ کو شامل کرتے ہوئے پانچ حصوں میں ''راہِ عمل'' کے نام سے فرید بک ڈپو دہلی نے شائع کیا، اس مجموعہ کو مضمون کے لحاظ سے الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جو اس طرح ہے :

- دعوتی وتذکیری مضامین: نقوش موعظت۔
- اسلام سے متعلق غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے بارے میں: حقائق اور غلط فہمیاں۔
- سماج میں پیش آنے والے واقعات کے پس منظر میں: عصر حاضر کے سماجی مسائل۔
- عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی مسائل: نئے مسائل — اسلامی نقطۂ نظر۔
- تعلیم سے متعلق مسائل: دینی وعصری تعلیم — مسائل اور حل۔

اس ذیلی نام کے ساتھ ساتھ پورے مجموعہ کا مشترک نام ''راہ عمل'' ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جیسے اخبارات میں یہ کم سواد تحریریں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح ان مجموعوں کو بھی بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔

۲۰۰۵-۶ء میں لکھے جانے والے کافی مضامین جمع ہو گئے تھے، احباب کا اصرار تھا کہ اسے بھی جلد آجانا چاہئے، میرا ارادہ تھا کہ پانچ سال کے مضامین جمع ہو جائیں، تب انھیں

شائع کیا جائے ، لیکن چوں کہ ’راہِ عمل‘ میں بھی بعض مضامین گم ہو جانے کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکے تھے اور ان دو سالوں کے بھی بعض مضامین محفوظ نہیں رہ سکے، اس لئے خیال ہوا کہ اس کا مرتب ہو جانا ہی بہتر ہے، چنانچہ یہ مضامین دو حصوں میں، قارئین کی خدمت میں پیش ہیں، اللہ تعالیٰ عزیزانِ گرامی مولانا محمد رضوان محفوظ قاسمی اور مولانا ادریس ندوی سلمھما اللہ کو جزائے خیر دے کہ ان حضرات نے بڑی محنت سے ان تحریروں کو اکٹھا کیا اور اب یہ مجموعہ دو حصوں میں کتب خانہ نعیمیہ دیوبند —— جہاں سے میری اکثر کتابیں طبع ہوتی ہیں —— کے واسطہ سے قارئین تک پہنچ رہا ہے، چوں کہ یہ کالم اب ہندوستان گیر سطح پر مشہور ہو چکا ہے اور نیٹ کے ذریعہ بیرون ملک بھی پڑھا جاتا ہے، اس لئے جناب انس صاحب (مالک کتب خانہ نعیمیہ دیوبند) اور دوسرے احباب کی رائے ہوئی کہ ان مجموعوں کے لئے اسی نام کو باقی رکھنا مناسب ہوگا، اس لئے ان کو ’’شمع فروزاں‘‘ ہی سے موسوم کیا گیا ہے، عزیزی مولانا محمد جمیل اختر ندوی سلمہ نے بڑی توجہ سے اس کی پروف ریڈنگ کی ہے، اور مولانا محمد نصیر عالم سبیلی سلمہ نے خوش سلیقگی کے ساتھ اس کی کمپوزنگ کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، قارئین کو اس سے نفع پہنچے اور خود اس حقیر کے لئے یہ ذخیرۂ آخرت بنے، **واللہ ھو المستعان .**

۳؍ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ **خالد سیف اللہ رحمانی**

❑ ❑ ❑ ❑

اللہ رحمان ورحیم کے نام سے!

وہ جاڑے کی ایک خنک ، یخ بستہ اور ڈھلتی ہوئی رات تھی کہ میرے دیرینہ کرم فرما جناب نسیم عارفی صاحب اپنے مخلص دوست اور خوش مذاق آرٹسٹ جناب رحیم صاحب کے ساتھ غریب خانہ پر وارد ہوئے ، حیدرآباد کی صحافت میں اس وقت بھی ''منصف'' کے نام سے ایک اخبار جانا جاتا تھا، مگر اس میں وہ ظاہری حسن اور معنوی کمال موجود نہیں تھا، جو اَب ہے۔

عرصہ سے سننے میں رہا تھا کہ اب اس اخبار کی تقدیر بدلنے والی ہے، نسیم عارفی صاحب ان دنوں شبانہ روز انھیں سرگرمیوں میں سرگرداں تھے اور یہ تشریف آوری بھی اسی نسبت سے تھی، عارفی صاحب نے بتایا کہ ہر جمعہ کو اس اخبار کا مذہبی ایڈیشن شائع ہوا کرے گا، اسی میں ایک مستقل کالم آپ کو لکھنا ہے، میں نے اس مستقل کالم کے لئے ''مینارۂ نور'' کے عنوان کی تجویز پیش کی ، عارفی صاحب چہک سے گئے اور کہنے لگے کہ پورا مذہبی ایڈیشن اسی نام سے موسوم ہونا چاہئے ، البتہ آپ ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے لکھا کریں، میں نے ہامی بھر لی، اس کے بعد نسیم صاب ''بادِ نسیم'' بن کر آتے اور مژدہ سناتے رہے کہ اب جانِ بہار کی آمد آمد ہے۔

آخر خان لطیف خان صاحب کے لطف وعنایت کے طفیل ''منصف'' حیدرآباد کے مطلع صحافت پر ایک نیرّ تاباں بن کر طلوع ہوا اور ایسا خورشید بن کر چمکا کہ دوسروں نے اس سے کرنیں مستعار لیں ، ہمہ رنگ صفحہ اول وآخر، ١٦ صفحات کی ضخامت ، روشن تحریریں، ایک سے ایک تجزیئے اور تبصرے ، گدگدانے والے کارٹون اور ہر دن ایک اور یک شنبہ کو دو دو موضوعاتی سپلیمنٹ ، یہ صرف منصف میں نہیں بلکہ اُردو صحافت میں ایک انقلاب تھا، جو اخبار

کل تک صحافت میں گرد کارواں بھی نہیں تھا، اب وہ میر کارواں بن کر اُبھرا اور پہلی بار ایک اُردو اخبار ملٹی کلر میں اور ۱۶ اور ۲۰ صفحات پر شائع ہو رہا تھا۔

حالاں کہ اصل میں میرے ذوق کی چیز سوال و جواب تھی؛ لیکن چوں کہ فقہی موضوعات پر مقالات اور فتاویٰ لکھنے کا موقع خواہی نخواہی ملتا رہتا ہے اور جب سے میں نے جیسا تیسا لکھنا شروع کیا ہے، اسی دشت کی سیاحی میں وقت گزر رہا ہے، اس لئے میں نے ''شمع فروزاں'' کے کالم کا انتخاب کیا کہ اس بہانے کچھ دعوتی، اصلاحی اور تذکیری تحریریں لکھنے کا موقع ہاتھ آجائے گا اور واقعہ ہے کہ اس پہلو سے خود مجھے بہت فائدہ ہوا، یہ اتفاق ہے کہ بعد میں ''سوال و جوب'' کا کالم بھی میرے محترم دوستوں جناب نسیم عارفی اور جناب متین لالہ صاحب کے اصرار پر میرے ہی حصہ میں آ گیا، گو ان دونوں کالموں کا ہر ہفتہ لکھنا میری عدیم الفرصتی اور کوتاہ علمی کی وجہ سے ایک بارِ گراں ہی ہے، لیکن اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اسی دباؤ میں کچھ کام ہو جاتا ہے اور اُمید رکھتا ہوں کہ یہ چھوٹی اور کھوٹی سی محنت اللہ کی رحمت سے آخرت میں بھی کچھ کام آ جائے گی، **وما ذالک علی اللہ بعزیز۔**

شمع فروزاں میں عام طور پر میں دو طرح کے موضوعات کا انتخاب کرتا ہوں، ایک تو وہ جو روزمرہ پیش آنے والے مقامی، ملکی اور بین ملکی حالات سے متعلق ہوتے ہیں اور ان مسائل کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی سعی کرتا ہوں، دوسرے ایسے مسائل جو سماجی صلاح و فساد سے متعلق ہوں کہ مغرب سے اُٹھتے ہوئے تہذیبی طوفان کے پس منظر میں ان پر لکھنے اور بولنے کی بہت ضرورت ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایک کم سواد شخص کی عجلت میں لکھی ہوئی یہ تحریریں بہت سے اصحابِ ذوق، اہل علم اور دین سے محبت رکھنے والے بھائیوں کو پسند آتی ہیں، اس سلسلہ میں کتنے ہی خطوط اور فون آتے رہتے ہیں، زبانی بھی مضمون نگار کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، بعض موضوعات پر لکھنے کا تقاضا کیا جاتا ہے اور بہت سے خطباء جمعہ میں اس تحریر کو اپنے بیان وتذکیر کا موضوع بناتے ہیں یا انھیں پڑھ کر سناتے ہیں۔

ادھر جب بھی آندھرا پردیش اور اس سے متصل علاقوں کا سفر ہوا، تو بہت سے بھائیوں

نے خواہش کی کہ ان مضامین کا مجموعہ مرتب ہونا چاہئے ، ہمارے عزیز دوست بلکہ بھائیوں سے بڑھ کر بھائی جناب میر اکرم علی صاحب شروع ہی سے 'شمع فروزاں' کی فائل بنارہے تھے اوراس کوطبع کرنے کے خواہش مند تھے، ہمارے خاص رفیق جناب مولانا محمد عارف قاسمی نے میرے ایماء واشارہ کے بغیر ہی ان مضامین کی کمپوزنگ کر رکھی تھی ، چنانچہ اکرم صاحب کی خواہش پر ان مضامین کے عنوانات دیکھے اور اندازہ لگایا تو ڈھائی سال کی یہ تحریریں تقریباً ساتھ آٹھ سوصفحات پر مشتمل ہیں ،اتنی ضخیم کتاب کا خریدنا لوگوں کے لئے دشوار ہوتا ہے، اس لئے احباب کے مشورہ سے بات طے پائی کہ پہلے ایک سال کے مضامین کا مجموعہ طبع کیا جائے ، یہی مجموعہ آپ کے سامنے ہے، اللہ نے چاہا تو آئندہ دوسرے مجموعے بھی قارئین تک پہنچیں گے۔

اس موقعہ پر جناب نسیم عارفی صاحب یقیناً ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان ہی کی تحریک پر ان مضامین کا سلسلہ شروع ہوا، جناب میر اکرم علی صاحب میرے ساتھ بڑی محبت اور خلوص کا برتاؤ رکھتے ہیں اور خود محبت کئے جانے کے لائق ہیں ،نرم خو، روادار، ہر بات پر آمنّا صدّ قنا ، ان مضامین کے سلسلہ میں مجھے خاص طور پر دو اور عزیزوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے ،ایک عزیزی الاعز مولانا شاہد علی قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ کا جو علمی کاموں میں میرے بہت معاون و مددگار ہیں،ان کی وجہ سے مجھے ایک بیماری سی ہوگئی ہے کہ اب خود لکھنے کے بجائے املا کرانے کا عادی ہوگیا ہوں ،عزیزی سلمہ نہ صرف علمی ذوق رکھتے ہیں بلکہ ان کا خط بھی بہت خوبصورت اور واضح ہوتا ہے، اس مجموعہ کی ترتیب گویا ان ہی کی قائم کی ہوئی ہے ، دوسری شخصیت میرے بہت ہی مخلص اور کرم گستر عزیز مولانا محمد عارف حسین قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ (شعبۂ کمپیوٹر منصف) کی ہے، جو بہت ہی خوش ذوقی کے ساتھ کمپوزنگ کا کام کرتے ہیں اور ہم ان سے اور وہ ہم سے فی اللہ محبت کرتے ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو بہتر سے بہتر اجر عطاء فرمائے ، اس وقت مجھے جناب رحیم صاحب مرحوم کی یاد آتی ہے، وہ بڑے باذوق آرٹسٹ، مخلص دوست اور شریف انسان تھے،''منصف'' کی پیشانی پر ان کے ''نقوش''

اب بھی ثبت ہیں، مگر افسوس کہ ''منصف'' کی نشأۃ ثانیہ سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، خدائے رحمان اپنے عبد رحیم کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے۔

یہ مجموعہ ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے زیر اہتمام ''البلاغ پبلیکیشنز'' طبع کررہا ہے، قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ان دونوں اداروں کی ترقی اور بقاء واستحکام کے لئے اور اس کم سواد راقم سطور کی آخرت اور دنیا کے لئے دُعاء فرمائیں۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السميع العليم

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ **خالد سیف اللہ رحمانی**

❑ ❑ ❑ ❑

پیش لفظ

الحمد لله الذی تتم بنعمته وقدرته الصالحات والصلوٰة والسلام علی اشرف المخلوقات وعلی صحبه وازواجه وذریاته الطیبات وبعد !

اللہ پاک اپنے بندوں میں سے —— جن سے کام لینا ہوتا ہے اسے —— چن لیتے ہیں اور ہمہ جہت صلاحیتوں سے نوازتے ہیں اور ان پر کام کی راہیں کھول دیتے ہیں، **والذین جاھدوا فینا لنھدیکم سبلنا** کا وعدہ انھیں لوگوں کے لئے ہیں۔

''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے مؤسس وناظم الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی انھیں عبقری شخصیات میں سے ہیں جن کو حق تعالیٰ نے علمی، فقہی، تحقیقی، اصلاحی اور دعوتی کاموں کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے، شریعت کے رموز واسرار، اسلامی احکام کے مصالح ومدارج اور نظام شرعی کے مزاج ومذاق کے وہ بہترین ترجمان ہیں، دعوت الی اللہ کے ساتھ دفاع عن الدین ان کا خاص موضوع ہے۔

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، پہاڑی شریف، قبا کالونی میں واقع ہے یہاں تحقیقات اسلامی کا ایک عظیم مرکز ہے، جہاں علوم اسلامیہ کا کتب خانہ ہے، جو بلاشبہ خزانہ عامرہ ہے، متقدمین ومتاخرین کی اہم کتابیں موجود ہیں، جن کو مصادر ومراجع کی حیثیت حاصل ہے، یہاں تخصص فی التفسیر، تخصص فی الحدیث اور تخصص فی الدعوۃ والعلوم العصریہ کے شعبے ہیں، یہاں کی مسجد ہمہ دم تلاوت وتعلیم کتاب اللہ سے منور رہتی ہے، ساٹھ، ستر طلبہ مختلف مضامین میں تحقیقی مقالات لکھ رہے ہیں۔

ابھی جب اُمور قضاء کے تربیتی کیمپ کے تعلق سے حاضری ہوئی تو حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے یہ سعادت عطا فرمائی، اس تربیت کیمپ میں ایک دن شہر حیدرآباد کے مؤقر تاجروں کا ایک نمائندہ اجتماع بھی ہوا، جس میں تجارت اور اس سے متعلق شریعت کے احکام

اور بعض دیگر اہم مسائل جیسے اکسپورٹ امپورٹ تجارت، انٹرنیٹ پر خرید وفروخت، بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ، شیرز کی خرید وفروخت وغیرہ پر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے فکر انگیز خطبہ دیا، وقفۂ سوالات میں تاجروں نے مختلف قسم کے سوالات کئے، جن کا تشفی بخش جواب دیا گیا۔

اس سے قبل ایک سال پہلے دعوت الی اللہ کے تعلق سے دعاۃ اسلام کا ایک تربیتی کیمپ منعقد ہوا تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹروں کا ایک ورکشاپ بھی منعقد ہوا اور مولانا موصوف نے ان کے سامنے اس اہم شعبہ کے بنیادی مسائل رکھے، حق تعالیٰ نے مولانا موصوف کو مؤثر خطاب کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے، ساتھ ہی علوم دینیہ میں تحقیقات کی زبردست صلاحیت سے نوازا ہے اور رجال کار کو تیار کرنا المعہد العالی الاسلامی کا مقصد اولین ہے۔

از راہ کرام مولانا موصوف نے اخبار منصف کے ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے لکھے ہوئے چند اہم مضامین کا کمپوز شدہ مجموعہ دکھایا —— دراصل یہ مضامین حالات حاضرہ اور مسلم معاشرہ میں رونما ہونے والے مسائل وواقعات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، ہر عنوان کے ذیل جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قرآنی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مزین ہے، تعبیر اور اُسلوب بیان ایسا ہے کہ جب کسی عنوان کو پڑھنا شروع کیجئے تو پورا کر کے ہی آپ دم لیں گے، نہ صرف یہ کہ انداز بیان سلیس اور عام فہم ہے بلکہ ہر عنوان ایک دعوت عمل ہے اور واقعی فکر وعمل کی راہ طئے کرنے کے لئے یہ ''شمع فروزاں'' ہے۔

اس مجموعے کے چند عنوانات ایسے ہیں کہ جو ہم سبھوں کے لئے عبرت وموعظت ہیں :

- ☆ اراضی پر ناجائز قبضہ۔
- ☆ ہمارے فرائض۔
- ☆ مقابلہ عمل وکردار کا یا درہم ودینار کا؟
- ☆ وطن دوستی یا وطن پرستی؟
- ☆ مذہبی قائدین اور مجرمانہ رویہ۔
- ☆ نکاح — نوجوانوں کی ذمہ داریاں۔
- ☆ آدم خور انسان۔
- ☆ دختر کشی کا نیا طریقہ۔
- ☆ دینی مدارس پر امریکہ کی نظر۔
- ☆ بچوں کو اغوا ہونے سے بچایئے۔

☆ اظہار رائے کی آزادی کس حد تک۔

حضرت مولانا کی معرکۃ الآراء تصانیف: ''کتاب الفتاویٰ، جدید فقہی مسائل، حلال و حرام، اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ، راہ اعتدال، قاموس الفقہ'' سے بھی استفادہ کرتا رہا ہوں۔

حق تعالیٰ مولانا کی جملہ خدمات علمیہ ودعویہ کو قبولیت تامہ نصیب فرمائے۔ آمین

محمد قاسم مظفر پوری

(قاضی شریعت دارالقضاء امارت شرعیہ سوپول، دربھنگہ، بہار)

❑ ❑ ❑ ❑

ہڑتال کا حق — اسلامی نقطۂ نظر

۶/ اگست کو تمل ناڈو کے دو لاکھ سرکاری ملازمین کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ سرکاری ملازمین کو کسی بھی حالت میں ہڑتال پر جانے کا قانونی یا اخلاقی حق نہیں ہے، سپریم کورٹ کے اس فیصلہ پر مزدور تنظیمیں بہت برہم ہیں، ان تنظیموں کے ساتھ ساتھ اٹارنی جنرل سولی جے سوراب جی بھی اس پر سخت ناراض ہیں، اور اسے غیر ضروری اور سمجھ سے بالاتر قرار دے چکے ہیں، لیکن یہ کوئی پہلا فیصلہ نہیں ہے، ۱۹۹۸ء میں کیرالہ ہائی کورٹ نے بھی اس طرح کا فیصلہ کیا تھا اور اکتالیس سال قبل بینک ملازمین کے استغاثہ پر سپریم کورٹ کی آئینی بینچ بھی اس طرح کا فیصلہ صادر کر چکی ہے۔

اصل میں احتجاج جمہوری نظام میں اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کا راستہ بھی ہے اور اگر احتجاج و مظاہرہ حدود و قیود سے آزاد ہو جائے، تو سماج کے لئے نقصاندہ اور مضرت رساں بھی ہے، ہڑتال کا اصل مقصد ظلم و ناانصافی پر احتجاج کرنا ہے، ظلم پر احتجاج اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بات پر ناراضگی کا اظہار یقیناً انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اسلام بھی اس حق کو تسلیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا . (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتا ہے، سوائے اس کے کہ کوئی مظلوم ہو، اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظلم و ناانصافی کے خلاف مناسب طریقہ پر احتجاج و مظاہرہ کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں عدالت سے چارہ جوئی، احتجاجی جلسہ، پرامن احتجاجی ریلی تو شامل ہے ہی، آج کے ذرائع ابلاغ کے پس منظر میں

اخبارات، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے اپنے موقف کی وضاحت اور حکومت کے ناروا رویہ سے اختلاف کا اظہار بھی اس میں داخل ہے، اسی طرح حکومت سے نمائندگی اور دوسرے قانونی ذرائع سے اپنی خفگی اور برہمی کا اظہار بھی اس میں شامل ہے۔

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا 'جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے' کی بھی گنجائش ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچا تا رہتا ہے، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا، استفسارِ حال کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں نے یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گذرنے والا کہتا: اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا، (تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷۵) یہ بھی گویا احتجاج کا ایک طریقہ ہے، فقہاء نے بیوی کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر مہر فوراً قابل ادائیگی تھا اور شوہر نے ادا نہیں کیا تو جب تک شوہر مہر ادا نہ کردے عورت کے لئے یہ درست ہے کہ وہ شوہر کو اپنے نفس پر قدرت نہ دے، یا شوہر کے گھر نہ جائے، اس کے باوجود اس کا حقِ نفقہ شوہر سے متعلق رہے گا، یہ بھی گویا احتجاج ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کل احتجاج کی اکثر صورتیں ایسی ہیں جو بیک وقت کئی طبقوں کے لئے سخت نقصان اور مضرت کا باعث ہوتی ہیں اور وہ قومی اور اجتماعی نقصان کا سبب بنتی ہیں، مثلاً یہی گاڑی کی ہڑتال ہے، یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے، لیکن ہڑتال میں جو ڈرائیور اور متعلقین شریک ہوتے ہیں، وہ عام طور پر نہایت قلیل آمدنی کے اصول پر ان کی زندگی گذرتی ہے، خود ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اجتماعی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتے، دوسرا نقصان کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا ہوتا ہے، مال کی پیدائش جاری رہتی ہے اور اس کی ترسیل اور فروخت رکی رہتی ہے، بعض زراعتی اشیاء تو ایسی ہوتی ہیں کہ سڑنے لگتی ہیں

اور بالکل ہی ضائع ہوکررہ جاتی ہیں اوران دونوں سے بڑھ کرنقصان عوام کا ہوتا ہے، چوں کہ بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور سامان کی رسد کم ہو جاتی ہے، اس لے قیمتیں غیر متوازن ہو جاتی ہیں، دو روپے کی چیز سو روپے میں فروخت ہوتی ہیں، اور لوگ اسے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام کے نظام تجارت میں اس بات کوملحوظ رکھا گیا ہے کہ قیمتوں میں توازن کو متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی لئے ''احتکار'' کو منع کیا گیا، احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، یعنی تاجر اشیاء ضروریہ کوخرید کر روک لے، بازار میں نہ لائے، تاکہ مصنوعی قلت پیدا کی جاسکے، اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں اور دو کی چیز دس میں فروخت کی جائے، رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کی سخت مذمت فرمائی ہے اور شدت سے منع کیا ہے، اسی طرح حدیثوں میں ''تلقی جلب'' سے منع فرمایا گیا ہے، ''تلقی جلب'' کا مطلب یہ ہے پہلے زمانہ میں عام طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، یہی ایک مارکٹ سے دوسری مارکٹ میں سامان کے پہنچنے کا ذریعہ تھا، ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شہر کو کوئی قافلہ آنے والا ہوتو چند سرمایہ کار شہر سے باہر نکل کر پہلے سامان خرید کر لیتے اور کھلے بازار میں سامان پہنچ نہیں پاتا، اس طرح اشیاءِ ضرورت پر چند تاجروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی، اور گرانی میں اضافہ ہوتا، یہ بھی ایسی صورت ہے جو قیمتوں کے فطری توازن کو متاثر کر دیتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، اسی طرح کی ایک اور صورت بھی ہے جس سے منع فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر آتے اور جلد واپس جانا چاہتے ہیں، اس لئے وہ اپنا سامان نسبتاً سستا فروخت کرے، عوام کو یہ فائدہ ہوتا کہ سامان سستا ملتا اور کاشت کاروں کو یہ فائدہ ملتا کہ درمیانی شخص اور بچو لئے کے نہ رہنے کی وجہ سے ان کو پوری قیمت براہِ راست مل جاتی، وہ دیہات سے مال لانے والوں کو کہتے تھے کہ تو اپنا مال ہمارے حوالے کردے، ہم کچھ دنوں ٹھہر کر اسے بہتر قیمت میں فروخت کر دیں گے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ قیمتوں کے فطری اتار کو روکا جائے، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، جس کو حدیث میں ''بیع حاضر للبادي'' سے

تعبیر کیا گیا ہے۔

ان احکام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے طلب و رسد میں توازن برقرار رکھنے اور قیمتوں میں غیر فطری اتار چڑھاؤ کو روکنے کی کیا کچھ تدبیریں کی ہیں؟ ذرائع مواصلات یا کسی خاص شعبہ کی تجارت کی ہڑتال سے سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں غیر متوازن ہوجاتی ہیں، جہاں سامان کی پیدائش ہوتی ہے وہاں کاشت کاروں اور صنعت کاروں کو اصل لاگت بھی حاصل نہیں ہوتی اور دوسرے مقامات پر عوام کو وہی چیز اصل قیمت سے دو چند بلکہ کئی چند قیمتوں میں خرید کرنا پڑتا ہے، یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان اور قومی خسارہ ہے۔

اس سے زیادہ نازک صورتِ حال اس وقت پیدا ہوجاتی ہے جب لازمی خدمات کے کسی شعبہ میں احتجاج ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال، پوسٹ آفس کی ہڑتال وغیرہ، ان شعبوں سے انسان کی ناگزیر ضروریات متعلق ہیں، جن سے عوام کو محروم رکھنا نہایت ہی شقاوتِ قلبی اور ظلم کی بات ہے، اسلام میں انسان کی لازمی ضروریات کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ خدا کی عبادت اور بندگی پر بھی اس کو ترجیح حاصل ہے، اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر وہ نماز نہیں توڑے گا تو کوئی شخص جل یا ڈوب جائے گا، یا گر جائے گا، تو نماز کا توڑنا اور اس شخص کی مدد کرنا واجب ہے، کم وبیش یہی احکام مال وعزت وآبرو کی حفاظت سے متعلق بھی ہیں، اس لئے ازراہِ احتجاج عام لوگوں کو لازمی خدمات سے محروم کردینا قطعاً جائز نہیں۔

احتجاج کی جو روایت ہمارے سماج میں پڑ چکی ہے، اس میں دونوں پہلو تکلیف دہ ہیں، احتجاج کرنے والے اوّل تو ناروا مطالبات پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے احتجاج کے لئے تکلیف دہ اور اجتماعی سطح پر مضرت رساں طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ بھی ناقابل فہم ہوتا ہے، آخر حکومت صلح کرتی ہے ''لواور دو'' کی بنیاد پر معاملہ طے کرتی ہے، لیکن ''بعد از خرابی بسیار''، اس طرح خود حکومت بھی عوام کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا رکھنے کا

ذریعہ بنتی ہے، اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضرر ونقصان بہر قیمت دفع کیا جائے ''الضرر یزال ''
نیز اسلام کی نگاہ میں ایک شخص کے نقصان کے مقابلہ ایک جماعت اور ایک طبقہ کے نقصان کے
مقابلہ پورے سماج کا نقصان زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ ہے، فقہاء لکھتے ہیں: ''**إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما** ''(الاشباہ:۴۴) احتجاج ایک جائز حق
ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کے لئے کچھ حدود وقیود ہوں، وہ ایسا عفریت نہ بن جائے کہ غریب
عوام کو نگل جائے اور قوم وملک کو اجتماعی سطح پر ضرر پہنچنے کا باعث بن جائے!

۵/ستمبر۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

کمتر برائی کا انتخاب

الیکشن کا بگل بج چکا ہے اور معرکۂ انتخاب پوری طرح گرم ہو چکا ہے، سیاسی جماعتیں سنہرے خواب اور سبز باغ دکھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں، وعدوں کی بہتات بھی ہے اور اپنی خدمات کے بارے میں اڈّعات اور دعووں کی فراوانی بھی، —— ہندوستان کے اکثر علاقے آج بھی روشنی سے محروم ہیں، ہزاروں دیہات اور قریہ جات کا سڑکوں سے رابطہ نہیں، بے روزگاری میں روز افزوں اضافہ ہے، جرائم کی ایسی کثرت ہے کہ ملک کے وزیر اعظم کے اعزہ بھی جرائم کی دسترس سے باہر نہیں ہیں، ملک کے بڑے بڑے قائدین کے بارے میں رشوتوں اور جرائم کے اسکامس گذشتہ پانچ سال میں بارش کی طرح منظر عام پر آئے ہیں اور آتے جارہے ہیں، اور کیوں نہ ہو کہ پارلیمنٹ میں بھی اور مختلف ریاستوں کی اسمبلیوں میں بھی پولیس کے نامزد مجرم اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اب وہ تیس، چالیس فیصد تک پہنچ گئے ہیں، ایسے لوگوں سے اس کے سوا اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ لیکن جب کسی چیز کی کثرت ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ دل و دماغ اسے قبول کرنے لگتا ہے، اور اس کی شناعت کا احساس کم ہوتا جاتا ہے، یہی کیفیت اس وقت جرائم پیشہ سیاست دانوں کے سلسلہ میں پیدا ہو چکی ہے، لیکن ان سب کے باوجود برسر اقتدار جماعت بہت ہی ڈھٹائی کے ساتھ ''درخشاں بھارت'' کا نعرہ لگا رہی ہے۔

اپنی کمزوریوں پر پردہ رکھنے اور لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لئے اب ایک نیا سلسلہ سیاست کے افق پر فلمی ستاروں کی بارات سجانے کا شروع ہوا ہے اور قومی علاقائی جماعتیں ایک سے ایک فلمی اداکار اور اداکارہ کو اپنے اسٹیج پر لا رہی ہیں، تاکہ عوام کو بہتر تماشہ دیکھا سکیں اور نوجوانوں کا شوقِ دید بھی پورا ہو، یہ یقیناً سیاسی قیادت کی سطحیت اور گراوٹ کی بات ہے اور اس انحطاط پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے، اگر آئندہ سیاسی جلسوں میں رقاصاؤں سے

رقص کرایا جائے اور گلوکاروں سے گیت سنوائی جائے تو تعجب نہ کرنا چاہئے ، کیوں کہ جب مقصود سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنانا ہے اور کسی نہ کسی طرح عوام کی بھیڑ اکھٹا کرنا ہے، تو پھر کھیل تماشہ کے ماہرین کا کوئی بھی گروہ وسیاست کی بساط پر اتر سکتا ہے اور اپنے کرشموں سے ایک ازدحام جمع کرسکتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے موجودہ الیکشن میں بہت ہی نازک حالات لے کر آیا ہے، فرقہ پرستی اور فاشزم بامِ اقتدار پر چڑھ چکی ہے اور سر توڑ کوشش کر رہی ہے کہ اپنے تختِ اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر کرلے، بہت سی وہ جماعتیں جو سیکولرزم کا نقاب اب تک اوڑھے ہوئی ہیں اور جن کے سیکولرزم نے حکومت کے فرقہ پرستانہ ایجنڈے میں مزاحمت کی تحریک بھی پیدا نہیں کر پا رہی ہے، اقتدار کی حرص وہوس نے ان کو اپنے نظریاتی دشمنوں کے ساتھ ایک کشتی کا سوار بنادیا ہے، بلکہ وہ فرقہ پرست طاقتوں کو اپنا ناخدا تسلیم کر چکے ہیں، دوسری طرف وہ جماعتیں ہیں جو اپنے آپ کو جمہوریت کا نمائندہ قرار دیتی ہیں، لیکن ان کا ماضی کچھ کم داغ دار نہیں، ان کا حال یہ ہے کہ جماعتی سیاست ان کو ان نظریاتی مقاصد سے زیادہ عزیز ہے جس کا وہ اپنی زبان اور اپنے منشور میں اظہار کرتے ہیں، یہ امنگ اور حوصلہ سے عاری ہیں، ان کی مثال ایسی فوج کی ہے جو نیم دلی کے ساتھ کسی فوج کے مقابلہ کے لئے لے جائی جاتی ہے، نہ اس کے دوست متعین ہیں اور نہ دشمن، یہ دوطرفہ آگ ہے، جس کی حرارت انگیزی میں کم وبیش کا فرق تو ہوسکتا ہے، لیکن کوئی اساسی اور بنیادی فرق ان کے طرزِ عمل میں نہیں ہے، اسی لئے ایک صحافی نے اس صورتِ حال کو ''نرم ہندوتوا'' بہ مقابلہ ''سخت ہندوتوا'' کا نام دیا ہے، انتخاب کی راہیں محدود ہیں اور کوئی تیسری ایسی قوت موجود نہیں جس کے بارے میں یہ توقع کی جاسکے کہ وہ ملک کے اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے گی۔

آخر مسلمان ان حالات میں کیا کریں؟ ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم الیکشن سے اپنے آپ کو الگ کرلیں، یہ بہت بڑی عاقبت نااندیشی کی بات ہوگی اور جو تھوڑا بہت لوگ الیکشن کے وقت مسلمانوں کا آنسو پونچھنے اور کچھ جھوٹے سچے وعدے کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی ختم

ہوجائے گا ، اور پھر مسلمان اس ملک میں ایک ذلیل ومقہور گروہ رہ جائیں گے اور سنگھ پریوار اور وی ، ایچ ، پی جس کے منصوبوں میں پہلے سے یہ بات داخل ہے کہ اقلیتوں کو ووٹ کے حق سے محروم کردیا جائے ، یہ عملاً ان کے منصوبہ کو کامیاب کرنے کے مترادف ہوگا، اس لئے الیکشن میں حصہ لینا ایک بہت بڑی ضرورت ہے، اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ووٹ کا حق ضرور ہی استعمال کرے اور یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلمانوں کے ووٹ کو متحد کرنے کی کوشش کریں، ہمارے بکھرے ہوئے ووٹ کی سیاست کے ترازو میں کوئی قیمت نہیں ہوگی، ہمارے متحد ووٹ سے ہی ہم ملک کی سیاست میں اپنا وزن قائم کرسکتے ہیں۔

اس وقت لوک سبھا کی ۵۴۵ سیٹیں ہیں، جن میں سے ۲۰ سیٹیں پارلیمنٹ پُر کرتی ہے، اگر مسلمانوں کی آبادی بیس کڑور مانی جائے تو ۵۴۵ میں سے ۱۱۹ سیٹیں مسلمان کی ہونی چاہئیں جب کہ اب تک مسلمان ممبروں کی تعداد چوبیس سے اڑتالیس تک رہی ہے ، اور وہ بھی مسلمانوں کے نمائندے کم اور جس سیاسی جماعت کے واسطے سے منتخب ہوئے ہیں، ان کے نمائندہ زیادہ رہے ہیں، جنوبی ریاستیں آندھرا، تمل ناڈ، کرناٹک اور کیرالہ کی ۱۲۹ سیٹوں میں سے ۶۰ سیٹوں میں مسلمان ووٹرس کی تعداد ۲۰ فیصد سے زیادہ ہے، ملک کے چودہ اضلاع میں مسلمان ووٹرس کا تناسب ۳۳ فیصد سے زیادہ ہے، یوپی میں مسلمان ووٹرس کا تناسب ۹۳ء۱۵ فیصد اور بہار میں ۱۳ء۱۴ فیصد ہے، بہار کے ضلع پورنیہ میں مسلم آبادی ۵۴ء۱۴، کٹیہار میں ۱۰ء۳۶ اور دربھنگہ شہر میں ۵۴ فیصد ہے، یوپی کے ضلع رام پور میں ۱۲ء۴۷، بجنور میں ۴۵ء۳۹، مرادآباد میں ۶۰ء۳۸، سہارنپور میں ۵۶ء۳۱، مظفر نگر میں ۳۷ء۲۵ اور بہرائچ میں ۲۵ فیصد ہے، لیکن افسوس کہ ان میں سے بہت سے مقامات وہ ہیں، جہاں مسلم ووٹ کے بکھراؤ کی وجہ سے فرقہ پرست جماعتیں الیکشن جیت جاتی ہیں، کم وبیش پارلیمنٹ کے ۴۷ حلقوں میں مسلم ووٹرس کا تناسب ۲۰ فیصد سے زیادہ ہے، اگر ان پارٹیوں اور پارٹی کے امیدواروں کے ووٹ کا تناسب دیکھا جائے جو فتح یاب ہوتی رہی ہیں، تو صاف اندازہ ہوگا کہ اگر مسلمان دانش مندی سے کام لیں اور متحدہ طور پر کسی پارٹی کے حق میں ووٹنگ کریں، تو وہ زیادہ تعداد میں مسلمان امیدواروں کو

پارلیمنٹ میں پہنچا سکتے ہیں اور اگر بادشاہ کا نہیں، تو کم از کم بادشاہ گر کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب سے سوال کیا کہ علم کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: شر کے مقابلہ میں خیر کو جاننا ''معرفة الخير من الشر'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی، کیوں کہ ظاہر ہے کہ جب ایک طرف شر اور دوسری طرف خیر ہو تو خیر کا انتخاب کیا جائے گا اور شر کو چھوڑ دیا جائے گا، پھر فرمایا کہ علم نام ہے دو شر میں سے ایسی چیز کے جاننے کا جو نسبتاً بہتر ہو ''معرفة خير الشرين'' یہ نہایت اہم قاعدہ ہے، جو کتاب وسنت کے مختلف احکام سے ثابت ہے، برائی کو روکنا واجب ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقت سے روکنے پر قادر نہ ہو تو زبان سے ٹوکنے پر اکتفا کرے اور زبان سے ٹوکنا بھی دشوار ہو تو دل سے برا سمجھنے پر اکتفا کرے، اس کا مقصد یہی ہے کہ بعض دفعہ کسی برائی کو روکنے میں انتشار اور اختلاف کا اندیشہ رہتا ہے، تو مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے موقع پر خاموشی اختیار کر لینا بہتر ہے، چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ میرے بعد تم ایسے حکمرانوں کو دیکھو گے جو تم سے اپنے حقوق کو وصول کریں گے، لیکن تمہارے حقوق ادا نہیں کریں گے، ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم انھیں نوکِ شمشیر سے سیدھا کر دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ صبر سے کام لینا، تا آنکہ وہ بھی اللہ کے دربار میں آجائیں اور تم بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشأ یہی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنا حکمرانوں کی بے راہ روی سے زیادہ اہم ہے، اس لئے اسے متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صلوا خلف كل برّ و فاجر'' (اچھے اور برے امام کے پیچھے نماز ادا کر لو) اس ارشاد کا منشأ بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو مقتدی کی نماز کا ضامن قرار دیا ہے، اس لئے امام کو بہتر سے بہتر ہونا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر قرآن پڑھنے والے، سنت سے سب سے زیادہ واقف و آگاہ اور سب سے زیادہ ورع و تقویٰ رکھنے والے کو امام ہونا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاجر کی اقتداء کو بھی جائز قرار دیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے حجاج بن

یوسف جیسے لوگوں کی اقتداء میں بھی نماز ادا فرمائی، اس کا منشأ بھی وہی ہے کہ امت کو انتشار اور بکھراؤ سے بچایا جائے، کیوں کہ بعض دفعہ ایسے لوگ امامت پر فائز ہو جاتے ہیں جو کردار و عمل کے اعتبار سے مجروح ہوتے ہیں، لیکن اگر انھیں ہٹانے کی کوشش کی جائے تو فتنہ و انتشار کا اندیشہ رہتا ہے، ایسی صورت میں امت کو انتشار سے بچانا زیادہ اہم ہے۔

اسلامی قانون کے ماہرین نے اسی بنیاد پر چند قواعد مقرر کیے ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب ہوگا :

يتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام .

عمومی نقصان کو دور کرنے کے لئے خصوصی اور شخصی نقصان کو گوارہ کیا جائے گا۔

جیسے کوئی جاہل شخص ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کر لے تو اس سے اس کو روکا جائے گا، اگر تاجر گراں فروشی شروع کر دے تو اشیاء کا نرخ متعین کیا جا سکتا ہے، تا کہ اس اجتماعی نقصان کو دور کیا جا سکے۔

إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما .

جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارہ کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا۔

اس اصول کو فقہاء نے مختلف الفاظ اور تعبیرات میں بیان کیا ہے، مثلاً یہ کہ ’’ دو شر میں سے کمتر کو اور دو ضرر میں سے ہلکے ضرر کو گوارہ کیا جائے گا‘‘ یا یہ کہ ’’ جہاں دو نقصان درپیش ہو تو کمتر نقصان کو گوارہ کر کے بڑے نقصان سے بچا جائے گا‘‘۔

درأ المفاسد أولى من جلب المصالح .

مصلحت اور منفعت کو حاصل کرنے سے زیادہ اہم مفاسد کو دور کرنا ہے۔

یعنی اگر ایک طرف کسی فائدہ کا حصول ہو، لیکن اس میں دوسرا پہلو نقصان کا ہو، تو نقصان

کے دور کرنے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

غور کیجئے! فقہاء کے اجتہادات ان ہی اصولوں پر مبنی ہیں، اور ایک ایسے وقت میں جب کہ سیاست کے حمام میں تمام لوگ بے لباس ہیں اور مسلمان دو مقابل قوتوں کی ضرر رسانی اور تیشہ زنی کا تجربہ کر چکے ہیں، ضروری ہے کہ وہ دانشمندی سے کام لیں اور زیادہ اور کمتر نقصان کا صحیح تجزیہ کر کے لائحۂ عمل بنائیں، کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ فراستِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے دو ناگزیر برائیوں میں سے کمتر برائی کو گوارہ کریں۔

۱۸/صفر المظفر ۱۴۲۴ھ، ۹/اپریل ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

ووٹ — احکام و آداب

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلام کی حفاظت کے لئے طاقت بھر کوشش اور تیاری کا حکم دیا ہے: ’’**وأعدوا لهم مااستطعتم من قوة** ‘‘(الانفال:۶۰) قوت کا لفظ ایک جامع لفظ ہے، جس میں وہ تمام طاقتیں شامل ہیں، جو نتائج اور فیصلوں پر اثر انداز ہو سکیں، یہ طاقت فوج کی بھی ہوسکتی ہے، افرادقوت اور تعداد کی بھی اور علم و دانش کی بھی، جو ممالک جمہوری طرزِ حکومت کے حامل ہیں، ان کے یہاں ووٹ بھی ایک بڑی طاقت ہے، ووٹ کے ذریعہ بامِ اقتدار پر چڑھا جاسکتا ہے اور ووٹ کی تلوار سے انسان کو بے پناہ بلندیوں سے اتھاہ پستیوں تک گرایا جاسکتا ہے، اس لئے ووٹ بھی ایک طاقت ہے، ایک نعمت ہے اور ایک مؤثر ہتھیار ہے۔

اس لئے ووٹ کے سلسلہ میں دو پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے: ایک یہ کہ موجودہ حالات میں بحیثیتِ مسلمان ہمارے لئے ووٹ دینا ایک مذہبی فریضہ کے درجہ میں ہے اور ووٹ نہ دینا اسی درجہ کوتاہی کا ارتکاب ہے؛ کیوں کہ ووٹ ایک گواہی ہے اور جب حق کو حاصل کرنے اور ظلم کو روکنے کے لئے گواہی دینی ضروری ہو جائے اور اس وقت اس ملک میں مسلمان اس صورتِ حال سے دوچار ہیں، تو اس سے پہلوتہی برتنا کسی طرح رَوا نہیں؛ بلکہ قرآن مجید کی زبان میں یہ کتمانِ شہادت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ (البقرہ:۲۸۳)

جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا اور تلبیس سے کام لینا عام حالات میں بھی گناہ ہے، لیکن گواہی میں دھوکہ دہی عام جھوٹ اور دھوکہ کے مقابلہ زیادہ بڑا گناہ ہے، اس کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، دوسرے کے نام پر ووٹ دینا، مکرر ووٹ دینا، صرف غیر قانونی کام ہی نہیں ہے؛ بلکہ ایک غیر شرعی فعل بھی ہے، اور اس کے لئے بھی انسان عنداللہ جواب دہ ہوگا، اس لئے کہ اسلام ہر حال میں اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ لوگوں کے ساتھ معاملت ہو، سماجی زندگی ہو، یا سیاست کا میدان، یہاں تک کہ معرکۂ جنگ۔

جمہوریت میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں، اسلام ان خامیوں کی اصلاح کے ساتھ ان کو قبول کرتا ہے، سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لئے نہ علم ودانش کی ضرورت کی شرط ہے، نہ اخلاق ودیانت کی ضرورت، پہلے لوگ اس کا رونا روتے تھے کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ افراد منتخب ہوجایا کرتے تھے اور ملک کے حساس مسائل کا فیصلہ ایسے ناکندہ تراش افراد کے حوالہ ہوتا ہے، ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکانِ مقنّنہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں اور نشانِ ابہام ہی سے کام چلاتے ہیں، اب بات اس سے بھی آگے جاچکی ہے اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو نامزد اور نامور مجرم ہیں، ان پر قتل، زنا، غصب اور رہزنی کے علانیہ جرائم ہیں، پہلے پولیس گرفتار کرنے کے لئے ان کا پیچھا کرتی تھی، اب ان کی حفاظت اور سلامتی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے، کرپشن اور سیاست کا اب چولی دامن کا رشتہ ہے، اور اب کسی بھی لیڈر کے بارے میں اسکام کی خبریں سن کر عام شہری کو کوئی حیرت نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہ اب ایک معمول کی بات ہے۔

جو لوگ الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں، ان میں شاید ایک فیصد بھی ایسے نہیں جو حقیقت میں ایماندار کہلانے کے لائق ہیں، جن کی زندگی پاک وصاف ہو اور عوام کی املاک میں خرد برد کرنے کا عزم لے کر اس میدان میں نہ اترے ہوں، ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے اور جب سبکدوش ہوکر اپنے وطن پٹنہ گئے تو ان کو رہنے کے لئے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا، جواہر لال نہرو دارالمصنفین اعظم گڈھ کے رکن تھے، اس وقت فیس رکنیت پانچ سو روپئے تھی، جب مولانا مسعود علی ندوی نہرو جی سے ممبری فیس لینے گئے، تو ان کے پاس پانچ سو روپئے بھی مکمل نہ ہوسکے اور دو قسطوں میں فیس ادا کی اور اپنی پاس بک دکھائی، جس میں دو ڈھائی سو روپئے سے زیادہ نہ تھے، لیکن آج معمولی عوامی نمائندوں کے محلات پر قصر شاہی اور گھر کی زیبائش پر ''جنتِ شداد'' ہونے کا گمان ہوتا ہے اور پولیس چھاپہ مارتی ہے تو منوں سونے زیورات ان کے مکان سے برآمد ہوتے ہیں۔

آج جب کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتے ہیں تو گیا آپ اس بات کی گواہی دیتے

ہیں کہ تمام امیدواروں میں یہی شخص آپ کے نزدیک اپنی دیانت وامانت، جذبۂ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبتاً بہتر اور قوم وملک کے لئے مفید ہے، کسی شخص کے بارے میں آپ کو اطمینان نہ ہو، آپ کے علم میں ہو کہ یہ کرپٹ اور راشی ہے اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنے اور اپنے خاندان کی خدمت ہی اس کا مقصود ہے، اس کے باوجود آپ اسے ووٹ دیں، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دیں، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ اس بارے میں جوابدہ ہوں گے، اس میں جھوٹی گواہی دینے کا گناہ ہوگا، یوں تو ہر جھوٹ برائی ہے، لیکن جھوٹی گواہی کا گناہ، گناہ کی تمام صورتوں سے بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے بہت بڑے گناہوں میں سے ایک شمار فرمایا ہے۔

ووٹ میں امیدوار کی صلاحیت اور کردار کے بجائے محض اس بات کو معیار بنانا کہ یہ ہمارے محلّہ کا ہے، ہمارے اس شخص سے تعلقات ہیں، اس نے ہمارا فلاں ذاتی کام کردیا تھا، یہ ووٹ دینے کے لئے ہمیں پیسہ دے رہا ہے، درست نہیں ہے، یہ خیانت اور جھوٹی گواہی ہے اور یہ پیسے رشوت ہیں، ہر شخص اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں جوابدہ ہے، ایسا شخص ایک دو نہیں ؛ بلکہ پوری قوم کے ساتھ بدخواہی کا مرتکب ہے، اس لئے ووٹ کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، تمام امیدواروں پر غور کرنا چاہیے، اس کی گذشتہ زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک اور رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہیے، اور پھر جس امیدوار کو بہتر اور مفید تصور کرتا ہے، اس کے حق میں ووٹ دینا چاہیے، ووٹر کے لئے یہی اصل کامیابی ہے، جس کے حق میں اس نے ووٹ کا استعمال کیا ہے اگر وہ ہار گیا، تب بھی ''ووٹ'' دینے والا اپنے مذہبی فریضہ اور قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یاں خیانت کا مرتکب تصور نہ کیا جائے گا اور اگر ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو قوم کے لئے مفید نہیں، مضر ہے، تو گو امیدوار جیت جائے، پھر بھی ایک مسلمان ووٹر کے لئے یہ ہار ہی ہے ؛ کیوں کہ وہ اپنے اس غلط عمل کی بابت عنداللہ جوابدہ ہے اور خدا کی ترازو میں اس کا یہ عمل قابل مواخذہ ہے۔

۲۵ رصفر المظفر ۱۴۲۴ھ، ۱۶ راپریل ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

بے جوڑ شادی

انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت نکاح ہے، کیوں کہ انسانی فطرت کو ایک ایسے رفیق کا تقاضا ہوتا ہے جو اس کا مونس و غمخوار اور زندگی کے سرد و گرم اور نشیب و فراز میں اس کا مخلص و وفادار رہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جب پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو وجود بخشا اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، تو ایسی انمول نعمتوں کو بھی کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ آپ علیہ السلام ہی کے جسمِ اقدس سے حضرت حواء علیہا السلام کو وجود بخشا، یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جیسے انسان کے لئے خورد و نوش، لباس و پوشاک اور سر چھپانے کی جگہ زندگی کی ایک ضرورت ہے، اسی طرح، بلکہ ان میں سے بعض ضروریات سے بڑھ کر 'رفیقِ حیات' کا وجود بھی ہے، اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اور اس نے قدم قدم پر فطرتِ سلیمہ کی رعایت ملحوظ رکھی ہے، اسی لئے اس نے نکاح کی نہ صرف اجازت دی، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور تجرد کی زندگی کو ناپسند کیا، کہ نکاح عفت و عصمت کی حفاظت کا سامان، قلب کے سکون کا ذریعہ اور نسلِ انسانی کی افزائش کا وسیلہ ہے!

نکاح کے بعد میاں بیوی کے درمیان تعلق، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے پاس ولحاظ کے پہلو کو قرآن مجید نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اور لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے، کہ یقیناً اس کے اظہار کے لئے اس سے بہتر اور معنی خیز کوئی دوسری تعبیر نہیں ہو سکتی اور وہ اس طرح کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ:۱۸۷) لباس انسان کو کلفتوں اور مشقتوں سے بچاتا ہے، وہ جسم کی ٹھنڈک سے حفاظت کرتا ہے، ایسے برساتی لباس بھی ہوتے ہیں جو بارش سے بچاتے ہیں، گرما کی مناسبت سے ایسے کپڑے استعمال کیے جاتے ہیں جو گرمی میں راحت اور سہولت کا باعث ہوں، پس لباس کا ایک اہم مقصد سرد و گرم میں جسم کی حفاظت اور اس کا بچاؤ ہے، میاں بیوی کا بھی یہی کام ہے، کہ وہ خوشی اور غم اور زندگی کے شادمانیوں اور تلخ کامیوں میں ایک دوسرے کے کام آئیں، وہ صرف موسم

عیش وطرب کے ساتھی نہ ہوں، بلکہ زندگی کی آبلہ پائیوں میں بھی ایک دوسرے کے رفیق ہوں۔

لباس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ جسم کے ایک ایک انگ کی خوبیوں اور خامیوں اور محاسن و عیوب سے واقف ہوتا ہے، لیکن وہ انسان کا راز دار بن کر رہتا ہے، اور اس کی کمزوریوں کو نگاہوں سے چھپائے رکھتا ہے، یہی مزاج زوجین کا ایک دوسرے کے بارے میں ہونا چاہئے، میاں بیوی ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہو سکتے ہیں، اور اگر ایک دوسرے کو بے آبرو کرنا چاہیں تو وہ جس آسانی کے ساتھ اس حرکت کا ارتکاب کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، چنانچہ ایک دوسرے کے لئے لباس ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ان کے عیوب کو چھپائیں، ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر پردہ رکھیں اور ایک دوسرے کی عزت وآبرو کی حفاظت کا سامان بنیں۔

لباس میں ایک پہلو زینت وآرائش کا ہے، وہ صاحبِ لباس کے لئے زینت اور آراستگی کا ذریعہ بھی ہے، اس پہلو سے انسان لباس میں مناسبت کا جتنا خیال رکھتا ہے، زندگی کے اسبابِ ضرورت واسبابِ آسائش میں سے کسی اور چیز میں شاید ہی اس قدر مناسبت کا خیال رکھا جاتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ جب میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے لباس ہیں، اور چند مہینے یا سال دو سال پہنے جانے والے لباس میں مناسبتوں کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے، تو جو لباس زندگی بھر کے لئے منتخب کیا جائے، اس میں تو بہ درجۂ اولی مناسبت کا لحاظ رکھنا مناسب ہوتا ہے، اسی رعایت کو فقہاء نے ''کفاءت'' سے تعبیر کیا ہے، خاندان، پیشہ اور دولت وغیرہ میں باہمی مناسبت ہو، اس کو ملحوظ رکھنے کی گنجائش ہو، تاکہ رشتۂ نکاح میں دوام اور پائداری پیدا ہو سکے، بعض لوگوں نے مسئلہ کفاءت کے بارے میں سمجھا کہ اسلام بھی ذات پات کی تفریق اور اونچ نیچ کا قائل ہے، لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، جن قوموں میں اونچ نیچ کا تصور ہے، وہاں سماجی اور اجتماعی زندگی کے تمام مراحل میں خاندانی تفریق کو روا رکھا جاتا ہے اور اس پر عمل کرنے کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اسلام نے انسانوں کے درمیان اونچ نیچ کی دیوار کھڑی نہیں کی اور خاندانی اور نسبی تعلق کو کسی عہدہ

یا انتخاب کے لئے معیار نہیں بنایا، نکاح میں البتہ انسان کی پسند کا خیال رکھا اور فرمایا: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ (النساء: ۳) —— انسان کو اپنے خاندان سے ایک انس ہوتا ہے اور اسے یہ تعلق محبوب ہوتا ہے، اس انس کی بنیاد پر وہ اپنے ہی خاندان میں نکاح کرنا چاہتا ہے، اس کو ایسے لوگوں سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، شریعت نے اس مناسبت کو برتنے کی اجازت دی ہے، یہی کفاءت کی حقیقت ہے۔

مناسبت، چاہت اور پسند کا تعلق خاندان سے بھی ہوتا ہے، علاقہ ومقام سے بھی، معاشی معیار سے بھی، تعلیمی لیاقت، اخلاق وکردار اور شکل وشباہت سے بھی، اسی طرح اس کا تعلق سن وسال سے بھی ہوتا ہے، فقہاء کے یہاں ایک اصطلاح 'مہر مثل' کی آتی ہے، کہ اگر نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہیں ہوا ہو، تو عورت کو اس کے خاندان میں مروّج مہر دیا جائے گا، اس مہر میں عمر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی خاندان کی دوسری ہم عمر عورتوں کا جو مہر ہوگا، اسی مہر کی مستحق یہ عورت بھی ہوگی، اس طرح نکاح میں فی الجملہ عمر کی بھی اہمیت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے نکاح کرلیا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کنواری لڑکی سے یا شوہر دیدہ عورت سے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: شوہر دیدہ عورت سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کنواری لڑکی سے کیوں نہ شادی کی؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے، بہنیں گھر میں موجود تھیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہی عذر پیش کیا کہ میں ایسی عورت کو لانا چاہتا تھا جو بہنوں کی دیکھ بھال کرسکے، (بخاری، حدیث نمبر: ۵۲۴۷، مسلم، حدیث نمبر: ۳۶۳۶، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۴۸) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی عمر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی مناسبت سے کم عمر لڑکی سے شادی کا مشورہ دیا، اس سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کی عمر میں توازن اور مناسبت ہونی چاہئے اور اتنا تفاوت نہ ہونا چاہئے جو خود اس لڑکی، خاندان اور سماج کے لوگوں کے لئے عار اور انگشت نمائی کا سبب بن جائے۔

رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول اور پیغمبر تھے، اس لئے آپ ﷺ کے سلسلہ میں کچھ خصوصی ازدواجی احکام دیے گئے تھے، تاکہ مختلف قبائل میں آپ ﷺ کا نکاح ہو اور یہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و معاون ہو، ذہین عورتیں آپ ﷺ کے حرم میں آئیں، تاکہ وہ احکامِ شریعت کو پوری طرح سمجھ سکیں اور پھر انھیں امت تک پہنچا سکیں، پھر یہ کہ کسی لڑکی کا آپ ﷺ کے نکاح میں آنا نہ صرف اس عورت بلکہ اس خاندان کے لئے تمغۂ افتخار تھا نہ کہ باعثِ عار، اس لئے اس کی خصوصی نوعیت تھی، اس کے باوجود اکثر رشتوں میں عمر اور احوال کی مناسبت ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تمام ازواجِ مطہرات بیوہ یا مطلقہ تھیں اور بعض تو دو شوہروں سے بیوہ ہو چکی تھیں، جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کا نکاح ہوا تو آپ ﷺ کی عمر مبارک چھپن اور ان کی ۳۵ سال تھی، (موسوعۃ حیات الصحابیات: ۴۰۰) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کی عمر آپ ﷺ سے نکاح کے وقت ۳۰ سال تھی، (حوالۂ سابق: ۴۱۴) حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی عمر آپ ﷺ سے نکاح کے وقت ۶۷ سال تھی، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں تو چار بچوں کی ماں تھیں، حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کی آپ ﷺ سے نکاح کے وقت عمر تیس سال تھی اور چند ہی ماہ کے بعد وفات پا گئیں۔ (موسوعۃ حیاۃ الصحابیات: ۴۱۴)

آپ ﷺ کی صاحبزادیوں میں سیدنا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا، اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ کی عمر ۱۵/ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ۲۱/ تھی اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصتی کے وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ ۱۸/ سال کی تھیں، (موسوعۃ حیاۃ الصحابیات: ۲۴۰ و ۶۲۰) حالاں کہ عرب معاشرہ میں خاندان کی یکسانیت پر زیادہ نگاہ رکھی جاتی تھی اور عمر کی کم، اس کے باوجود عہد نبوی ﷺ میں ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ خاص کر کنواری لڑکیوں کے نکاح میں عمر کی قربت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

ہندوستان کے معاشرہ میں میاں بیوی کی عمر کے درمیان زیادہ تفاوت باعثِ عار محسوس کیا جاتا ہے، خاص خاص حالات میں تو لوگ اسے نظر انداز کرتے ہیں، جیسے کوئی بیوہ یا مطلقہ

عورت ہو، کسی صاحبِ عیال عورت کا انتقال ہو گیا ہو، تو لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اسی کی بہن سے مرد کا نکاح ہو جائے، تا کہ بچوں کی پرورش آسان ہو، یا والد کا انتقال ہو جائے، تو کوشش کی جاتی ہے کہ ممکن ہو تو بھاوج دیور کے نکاح میں آ جائے، تا کہ ان بچوں کی پرورش میں دشواری نہ ہو، ورنہ عام حالات میں اگر سن وسال کا لحاظ نہ ہو، تو یہ بات ننگ وعار کا سبب سمجھی جاتی ہے، اور ایسے مسائل میں عرف اور سماجی روایات کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں ایک کم عمر لڑکی رخسانہ بیگم (۱۶؍سال) کی ایک عرب شیخ محمد جعفر یعقوب حسن (۷۳؍سال) کے ساتھ نکاح کی اطلاع کے شائع ہوتے ہی میڈیا والوں کو مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈہ کا ایک نیا موقع ہاتھ آ گیا، اس سے پہلے حیدر آباد ہی کی ایک لڑکی آمنہ بیگم کے معاملہ نے پورے ملک میں اخبارات کی شہ سرخی کی حیثیت حاصل کر لی تھی، اس طرح کے واقعات یقیناً افسوس ناک اور شرمناک ہیں، ابھی جس نکاح کا افشاء ہوا ہے، اس میں ''جناب شیخ'' اس سے پہلے بھی چھ چھ نکاح فرما چکے ہیں اور ایسی بعض لڑکیوں سے انھوں نے نکاح کیا ہے کہ شاید ان کی پوتیاں اور نواسیاں بھی اس سے زیادہ عمر کی ہوں، پھر یہ نکاح بھی چندروزہ عیش کوشی اور لذت چشی کے مقصد سے کیا گیا ہے، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے واقعات کی روک تھام کریں، کیوں کہ میاں بیوی کی عمر میں مناسبت کا لحاظ فی الجملہ دین میں مطلوب ہے اور ہندوستان کے سماج میں اس کی خلاف ورزی باعثِ ننگ وعار ہے۔

ایسے بوڑھے شیوخ سے نکاح کے دوسرے خراب مضمرات بھی ہیں، اس سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں، برائیوں کا دروازہ کھلتا ہے اور آشنائی کے واقعات ظہور میں آتے ہیں، یہ ایسا موضوع نہیں کہ اس کی وضاحت کی جائے، لیکن جو لوگ سماجی احوال سے واقف ہیں، وہ اس سچائی سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں، کہ ایسی شادیاں اخلاق کو تباہ کرنے کا باعث بنتی ہیں، پھر عمر طبعی کے لحاظ سے عورت کو طویل مدت بیوگی میں گذارنی پڑتی ہے، جب شوہر زندہ ہو وہ اس کے بوجھ کو اٹھاتی ہے اور شوہر کے گذرنے کے بعد بھی کس مپرسی سے دوچار اس کی اولاد کے بوجھ کو سہتی ہے، پھر ان بچوں کی تعلیم وتربیت بھی اس طرح انجام نہیں پاتی جس طرح ہونی

چاہئے ، اس سلسلہ میں جولوگ دلال کا کام کرتے ہیں اور دھوکہ دے کر ، ورغلا کر اور اکسا کر معصوم لڑکیوں کی زندگی کا سودا کرتے ہیں اور کراتے ہیں ، انھیں قرارِ واقعی سزا ملنی چاہئے ، نکاح پڑھانے والے قاضیوں کی تربیت ہونی چاہئے ، کہ وہ ایسے شیوخ کا نکاح پڑھانے سے پہلے حقیقی صورتِ حال کا جائزہ لیں ، لڑکی والوں کو سمجھائیں کہ وہ ایسے ظلم سے اپنے آپ کو باز رکھیں اور سماج کے ذمہ دار اور بارسوخ افراد کو اس صورتِ حال سے مطلع کریں ، تا کہ امت کے لئے جگ ہنسائی کی صورت پیدا نہ ہو۔

اس میں سب سے بڑی ذمہ داری خود والدین کی ہے ، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ والدین نے پیسوں اور کچھ سامانِ حرص میں اپنی کم عمر لڑکیوں کو ایسے ہوسناک شیوخ کے حوالہ کر دیا ، یا کم سے کم اس لئے کہ لڑکی کا یہ بوجھ ہمارے سر سے اٹھ جائے ، حالاں کہ اس طرح بوجھ اٹھتا نہیں ہے ، بلکہ بوجھ بڑھ جات ہے ، ہونا یہ چاہئے کہ مناسب عمر کے مرد سے نکاح کیا جائے ، خواہ وہ غریب اور مزدور کیوں نہ ہو ، کہ یہ غریب ، مزدور نوجوان سونے کے قفس میں رہنے والے بوڑھے سے بہتر ہے ، پیسے والے لڑکے کی تلاش سے بہتر ہے کہ شریف و غریب لڑکے سے اس کی شادی کر دی جائے ، ورنہ یہ اس لڑکی کے ساتھ ظلم اور اس کی تمناؤں اور عمر کے تقاضوں کا قتل ہے۔

اس میں بہت بڑی ذمہ داری ہمارے سماج کی بھی ہے ، ایسے بے شرم و بے رحم ماں باپ کم ہی ہوتے ہیں ، جو جانتے بوجھتے اپنی معصوم لڑکی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دیں اور ان کو زندہ درگور کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں ، اصل میں داماد کی طرف سے بھاری مطالبات اور جہیز کی مروجہ رسم نے غریب ماں باپ کے سینہ پر لڑکی کو بوجھل چٹان بنا دیا ہے ، وہ گناہ کی زندگی سے بچانے اور کسی طرح لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے مجبور ہو کر ایسے شیوخ سے ان کا نکاح کر دیتے ہیں ، اگر ہمارا سماج مطالبات کی اس لعنت سے آزاد ہو جائے ، تو لڑکی جو ماں باپ کے لئے محبت و وفا کی پیکر اور مجسم پیار ہوتی ہے ، وہ اسے آنکھوں دیکھتے کیسے مصیبت اور آزمائش کی بھٹی میں جھونک سکتے ہیں؟؟

ایسے واقعات کی وجہ سے قانونِ شریعت کونشانہ بنانا ہرگز منصفانہ بات نہیں، کیوں کہ یہ قانون کا غلط استعمال ہے، اور اچھے سے اچھے قانون کا غلط استعمال کیا جاسکتا ہے، اور کیا جاتا ہے، دنیا کے کسی بھی قانون میں لڑکوں اورلڑکیوں کے درمیان عمر کے تفاوت کی حد مقرر نہیں کی گئی اور نہ ایسا کرنا ممکن ہے، اس کا تعلق سماجی روایات، والدین کے شعور اور حالات سے ہے، مغربی معاشرہ میں گناہ کے کتنے ہی بے جوڑ واقعات پیش آتے ہیں، لیکن ذرائع ابلاغ کے لئے وہ باعثِ حیرت نہیں اور مرد وعورت کے قانونی تعلق میں عمر کے تفاوت پر اتنی آہ وواویلا کی جاتی ہے، اس میں انسانی ہمدردی سے زیادہ اسلام کے خلاف بغض وعناد کا دخل ہے، علماء اور مذہبی قائدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک طرف ایسے واقعات کو روکنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف سرکار اور سرکاری اداروں کو ایسے امور میں مداخلت کی اجازت بھی نہیں دیں، ور نہ اس سے شریعت میں مداخلت کا دروازہ کھل جائے گا۔

۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ/ ۴/ جون ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

کنٹراکٹ میرج

ہفتہ دو ہفتہ سے ''کنٹراکٹ میرج'' کا مسئلہ صحافت کا موضوع بنا ہوا ہے، اُردو اخبارات کے علاوہ انگریزی اخبارات کو بھی اچانک خواتین کی مظلومیت کے احساس نے بے قرار کردیا ہے، نیشنل میڈیا کو عام طور پر ایسے ہی مواقع پر مسلمان خواتین یاد آتی ہیں، غربت زدہ، حد سے گذرے ہوئے افلاس سے دو چار اور فرقہ وارانہ فسادات کی مصیبت زدہ مسلمان خواتین کے بارے میں تو کبھی آواز نہیں اٹھائی جاتی، لیکن نکاح وطلاق سے متعلق کوئی واقعہ پیش آجائے اور کچھ لوگ اپنی نادانی یا مجرمانہ طبیعت کی وجہ سے قانونِ شریعت کا غلط استعمال کرلیں تو ذرائع ابلاغ کو مسلمان عورت کی مظلومیت ''تڑپا'' کر رکھ دیتی ہے، جس میں اصل مقصود قانونِ شریعت کو ہدف بنانا اور اسلام پر نزلہ گرانا ہوتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہم دوسروں پر الزام دے کر اپنی کوتاہیوں سے بریٔ الذمہ نہیں ہوسکتے، ایسے واقعات کا پیش آنا یقیناً پوری امت کے لئے خجالت اور حیاء کی بات ہے، جن قاضی صاحب اور ان کی اہلیہ کو اس شرمناک معاملہ میں گرفتار کیا گیا ہے، انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ہر ماہ چار تا پانچ ایسی شادیاں وہ کرایا کرتے ہیں، قاضی صاحب نے اپنے گھر پر ہی ان کے لئے عصری سہولتوں سے آراستہ رہائش گاہ بھی بنوا رکھی ہے، عمر دراز شیوخ آتے ہیں، بیس بائیس سال کی لڑکی کا انتخاب کرتے ہیں اور پندرہ بیس روز ایک ماہ ٹھہر کر ہمیشہ کے لئے واپس ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات قاضی صاحب کو اطلاع ہوتی ہے کہ آئندہ اس نکاح کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ لیکن انھیں اپنی آمدنی مطلوب ہوتی ہے، قاضی کو منھ مانگی رقم نکاح پڑھانے کی مل جاتی ہے اور اگر لاج (Lodge) بھی بنوا رکھے ہوں، تو معقول اور غیر معمولی کرایہ اس کے علاوہ، دلال شیخ سے تو بڑی رقم لیتا ہی ہے، غریب و بے کس لڑکی اور اس کے والدین کو بھی نہیں چھوڑتا، ان سے بھی کچھ اینٹھ لیتا ہے اور کچھ نہیں تو مہر کی جو رقم وصول ہو، اسی میں سے آدھ،

پون حصہ دلال کے حصہ میں چلا جاتا ہے اور نکاح ہی کے وقت نکاح نامہ پر دستخط کے علاوہ طلاق نامہ پر یا آئندہ طلاق تحریر کرنے لئے سادہ کاغذ پر دستخط لے لیا جاتا ہے۔

یوں تو آج دنیا میں گناہ کی آزادی ہے اور اپنی مرضی سے انسان کوئی برائی کرے، تو اس پر نہ کوئی زبان ٹوکنے والی ہے اور نہ کوئی ہاتھ روکنے والا، لیکن ایک دینی حکم کی آڑ لے کر جب دین کے ساتھ کھلواڑ کیا جائے، تو افسوس بھی ہوتا ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے کہ ہم جس عظیم الشان دین کے امین ہیں، اس کی عزت کا سبب بننے کے بجائے اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس کی بدنامی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

اسلام میں نکاح ایک پائیدار رشتہ ہے، اور نکاح اس لئے کیا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بھر رفاقت نباہیں گے، سرد وگرم اور نشیب وفراز میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے، طلاق تو ایک غیر معمولی، غیر متوقع اتفاقیہ واقعہ بلکہ سانحہ ہے، لیکن اسی نیت سے نکاح کرنا کہ چند روز عیش کوشی کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، گناہ اور حرام ہے، اسی لئے نکاح کے وقت ایسی تدبیر اختیار کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ یہ رشتہ پائیدار رہ سکے۔

اصل یہ ہے کہ رشتہ کے انتخاب کے لئے دین داری کو معیار بنایا جائے، نہ کہ خاندان، حسن وجمال اور مال واسباب کو، رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں اس کی تلقین فرمائی ہے، لیکن چوں کہ انسانی طبیعتیں مختلف ہوتی ہے، بعض لوگ خاندان کے پرستار ہوتے ہیں، بعض لوگ شکل وشباہت پر شیدا اور بعض کو ایسا سسرال سرمایۂ افتخار ہوتا ہے جو معاشی اور اقتصادی اعتبار سے باعزت سمجھا جاتا ہے، اس لئے رشتہ کے انتخاب میں کوئی قانونی تحدید نہیں رکھی گئی اور اپنی پسند کے مطابق نکاح کی اجازت دی گئی فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ۔ (النساء:۴)

غیر محرم کو دیکھنا جائز نہیں اگر ایک نگاہ پڑ جائے تو دوسری نگاہ نہ اٹھنے دے، لیکن نکاح میں منگیتر کو دیکھنے کی اجازت دی گئی اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر واقعی نکاح کا ارادہ ہو، محض بد نگاہی مقصود نہ ہو تو گو شہوت کا اندیشہ ہو، پھر بھی اس لڑکی کو دیکھ سکتا ہے جس سے رشتہ کرنا چاہ رہا ہے، مقصد یہی ہے کہ شکل وصورت کے سلسلہ میں آئندہ کوئی شکوہ شکایت نہ پیدا ہو اور نکاح کے بعد

اس رشتہ میں دوام واستحکام برقرار رہے۔

اسلام نے گو سماجی ضرورت کے تحت طلاق کی گنجائش رکھی ہے، لیکن اسے تمام جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ قرار دیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے "أبغض الحلال إلى الله الطلاق" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۱۷۸) اسلام سے پہلے نکاح کے بعض شرمناک طریقے مروّج تھے، امام بخاریؒ نے اس کی تفصیل نقل کی ہے، ان میں سے نکاح کے اس شریفانہ طریقہ کو باقی رکھا گیا ہے جس کی اسلام میں اجازت ہے، باقی تمام صورتوں کو ختم کردیا گیا، ان ہی میں ایک صورت "متعہ" کی تھی، یعنی ایک مرد کسی عورت سے عارضی نکاح کیا کرتا تھا اور اس کے بدلہ میں کچھ دے دیا کرتا تھا، شریعت میں (ان چیزوں کو حرام قرار دینے میں جن کے لوگ عادی ہو چکے تھے) تدریج کی حکمت اختیار کی گئی ہے اور انھیں مرحلہ وار حرام کیا گیا ہے، اسی لئے شراب تین مرحلوں میں حرام کی گئی، نکاح کے معاملہ میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی، قحبہ گری جس کو نکاح کہا جاتا تھا اور جس کے لئے علامتی طور پر فاحشہ عورتیں اپنے گھر پر جھنڈا لگاتی تھیں، نیز نکاح "رھط" جس میں کئی مرد مل کر ایک عورت سے نکاح کرتے تھے اور قیافہ کے ذریعہ بچہ کے باپ کی تعیین عمل میں آتی تھی، کو تو اوّل مرحلہ میں ہی حرام قرار دیا گیا، لیکن متعہ (جس میں بہر حال قانونی طور پر عقد کا تصور موجود تھا) کو ابتدائی مرحلہ میں باقی رکھا گیا، لیکن مسلمان عام طور پر سفر کے دوران ہی اس طرح کا عقد کرتے تھے، فتح مکہ یا غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اسے مکمل طور پر حرام قرار دے دیا۔

متعہ ہی کی طرح کی ایک اور ناجائز صورت فقہاء کے یہاں "نکاحِ موقت" کی ملتی ہے، متعہ اور نکاحِ موقت میں فرق یہ ہے کہ متعہ، متعہ کے لفظ سے ہوتا تھا اور اس میں گواہوں کی موجودگی بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی، نکاحِ موقت وہ ہے جس میں نکاح کی تعبیر اختیار کی جائے اور گواہان موجود ہوں اور ایک متعینہ مدت جیسے چند سال، چند ماہ کے لئے نکاح ہو، جیسے یہ متعہ حرام اور باطل ہے، اسی طرح بالاتفاق "نکاحِ موقت" بھی حرام اور باطل ہے۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیا ہو، تو وہ مرد پر پوری طرح حرام ہو جاتی ہے، پھر اگر کسی اور مرد سے اس کا نکاح ہوا اور اتفاق سے اس سے بھی طلاق کی نوبت آ گئی، تو اب وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائے گی، اور دوبارہ اس کا نکاح پہلے مرد سے ہو سکتا ہے، لیکن اگر کسی شخص نے نکاح تو کیا عام طریقہ پر، لیکن دل میں یہ بات رکھے ہوا تھا، یا آپس میں طے کر چکا تھا کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دے گا تا کہ وہ پہلے مرد کے لئے حلال ہو جائے، تو نکاح ظاہری کیفیت کے اعتبار سے تو منعقد ہو جائے گا، لیکن چوں کہ نکاح کرنے والے کی نیت کے اعتبار سے یہ ایک عارضی تعلق تھا، اس لئے اس کا یہ فعل سخت باعثِ گناہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے نکاح کرنے والے شخص پر اور اگر پہلے شوہر کی خواہش پر ایسا کیا گیا ہو، تو اس پر بھی لعنت بھیجی ہے۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد: ۴/ ۲۶۷، باب نکاح التحلیل)

کیوں کہ انسان اپنے دل کے چور کو پولیس اور عدالت سے چھپا سکتا ہے اور سماج اور متعلقین کی نگاہوں سے بچا سکتا ہے، لیکن خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتا، ایسے معاملات کو ظاہری کیفیت کے اعتبار سے قانونی اور فقہی طور پر جائز قرار دیے جائیں، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے وہ زنا اور گناہ ہی ہیں، جو شخص خود اس طرح نکاح کرتا ہو، یا جو عورت جانتے بوجھتے نکاح کرتی ہے تو خدا کی نگاہ میں وہ زانی اور زانیہ ہے، جو دلال جانتے بوجھتے اس کی دلالی کرتا ہو، وہ دراصل زنا کا کاروبار کرنے والا اور اس فعلِ خبیث کی روٹی کھانے والا شخص ہے، جو شخص اس صورتِ حال سے واقف ہونے کے باوجود اس کا نکاح پڑھائے اور اس کی اجرت وصول کرے وہ بدکاری میں معاون و مددگار اور بدکاری کی اجرت میں شریک تصور کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص نکاح میں مہر مقرر کرے، لیکن مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہو، وہ زنا کار ہے، اور متعدد احادیث میں یہ بات آئی ہے کہ ایسا شخص قیامت میں ایک زانی اور بدکار کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ سے ملے گا، (مجمع الزوائد: ۴/ ۵-۲۸۴) غور کیجئے کہ مہر تو عورت معاف بھی کر سکتی ہے اور نکاح کے وقت مہر مقرر نہ ہو تو گویہ بری بات ہے، لیکن نکاح منعقد ہو جائے گا، مگر نکاح اس نیت سے کرنا کہ اس رشتہ کو ہمیشہ قائم رکھنا ہے، نکاح کی

حقیقت میں داخل ہے، اور حلال وحرام کے درمیان فاصل ہے یہ رفاقت اور ساجھے داری کا مضبوط قلعہ ہے، نہ کہ کچی مٹی کا گھروندا اور بچوں کا کھلونا، جسے چند ساعت تفریح طبع کے لئے بنایا اور پھر مسمار کردیا جائے۔

جو لوگ چند روز لذتِ نفس کے لئے شادی کا ڈھونگ رچاتے ہیں، جو والدین جانتے بوجھتے اپنی لڑکیوں کو بے آبرو کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، وہ دلال جو کسبِ حلال کے لئے جد وجہد کرنے کے بجائے اس حرام کو ذریعہ بناتے ہیں، وہ قاضیانِ نکاح جن سے قوم کی امانت متعلق ہے، سماج کی اصلاح اور ان کو گناہ سے بچانا ان کا اخلاقی فریضہ ہے اور ٹھوکر کھانے والوں کو تھامنا جن کی ذمہ داری ہے وہ خود بدکاری کے لئے آلہ کار بننا قبول کرتے ہیں، کیا رسول اللہ ﷺ کی لعنت سے بچ سکتے ہیں؟ یا اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں؟ اور کیا وہ اس بات کے لئے تیار ہیں کہ قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں ایک زانی وبدکار یا بدکاری میں معاون ومددگار کی حیثیت سے اپنی صورت دکھائیں؟؟ اور دنیا میں بھی اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے لئے ذلت ورسوائی اور تحقیر وبے آبروئی کا ذریعہ بنیں۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ .

۲۲/ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ، ۱۱/ جون ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

ریزرویشن — اسلامی تصور

اگر ایک انسان کا پورا وجود حسن و جمال کا پیکر ہو، لیکن کوئی ایک انگ بدنما ہو، تو اس کی خوبصورتی ناقص ہی سمجھی جاتی ہے، بلکہ اکثر اسی عیب زدہ حصے پر نگاہ ٹک جاتی ہے، اگر کسی گلشن کے سارے پھول تر وتازہ اور خوش رنگ ہوں، لیکن کوئی ایک پھول کا پودا بھی مرجھایا ہوا اور بے رونق ہو، تو اس پژمردہ پودے کے ساتھ پھلواری اپنے معیار میں نامکمل ہی سمجھی جائے گی، اگر کوئی مکان تزیین و آرائش کے اوجِ کمال پر ہو، لیکن اس کے مرمریں جسم کا کوئی کنگورہ ٹوٹا ہوا، یا کوئی بازو کھنڈر بنا ہوا ہو، تو دیکھنے والوں کی نظر اسی ناقص حصہ پر رکتی ہے، اور دل میں آتا ہے کہ اگر یہ حصہ بھی مکمل ہوتا، تو یہ کس قدر خوبصورت اور دیدہ زیب ہوتا، یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے، اگر ایک قوم میں چند گروہ اور طبقات پائے جاتے ہوں، بعض معاشی اعتبار سے اوجِ کمال پر ہوں اور بعض اتنی نچلی سطح پر کہ دولت مندوں کو اپنے بام و در کی چوٹیوں پر چڑھ کر انھیں دیکھنا بھی مشکل ہوتا ہو، یا ایک ہی ملک میں بہت سی مختلف قومیں بستی ہوں اور ان میں معاشی معیار میں اتنا زیادہ تفاوت ہو کہ اقتصادی سفر میں ان کا ایک کارواں نہ بن سکے، اور ان کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو، تو یہ یقیناً کوئی بہتر منظر نہیں ہوگا اور یہ ملک کے چہرے کو داغدار رکھنے کے مترادف ہوگا۔

اس نابرابری اور غیر معمولی تفاوت کی وجہ سے صرف بدنمائی اور ناانصافی ہی سامنے نہیں آتی، بلکہ بعض اوقات محروم طبقات میں ردِعمل بھی پیدا ہوتا ہے اور یہی ردِعمل تشدد اور جارحیت کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر تو یہ ناانصافی ایسی آگ بن جاتی ہے، جس سے پورا سماج جلنے لگتا ہے اور ایسا طوفان بن کر اٹھتا ہے جو زمیں بوس جھونپڑیوں سے لے کر فلک بوس عشرت کدوں تک ہر ایک کو زیروزبر کر کے رکھ دیتا ہے، ہندوستان میں نکسلائیٹس تحریک اس کی ایک مثال ہے۔

اسی باعث پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی ضرورت پیش آتی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ذمہ داریاں صلاحیتوں کے لحاظ سے تفویض کی جاتی ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت بلکہ قانونِ فطرت ہے کہ کسی چیز سے بہت عرصہ تک اس کی صلاحیت کے مطابق کام نہ لیا جائے، تو بتدریج اس کی صلاحیت کند ہونے لگتی ہے، دھاردار لوہے کو اگر کسی چیز کے کاٹنے کے لئے عرصہ تک استعمال نہ کیا جائے، تو دھار کند ہو جاتی ہے اور اسے استعمال کے لئے خاص طور پر تیز کرنا اور رگڑنا پڑتا ہے، کسی کی آنکھ پر مہینوں پٹیاں باندھ دی جائیں اور آنکھ سے دیکھنے کا کام نہ لیا جائے، تو بینائی پر اثر پڑتا ہے، اگر کوئی شخص چلنا چھوڑ دے اور دن رات لیٹا رہے اور اسی طرح ایک عرصہ گذر جائے تو اس کے چلنے اور دوڑنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے، جو لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو کام میں مشغول رکھتے ہیں، ان کے لئے بغیر مشغولیت کے چند ساعت گذارنا گراں خاطر ہوتا ہے، لیکن جو لوگ بے کاری کو ہی اپنا مشغلہ بنا لیتے ہیں، ان کو کام اور محنت کرنا ایک سنگ گراں بار محسوس ہوتا ہے، یہی حال قوموں کا ہے، جب کوئی قوم مسلسل محرومی کا شکار بنتی رہتی ہے، تو اس میں نا اُمیدی پیدا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کی قوت عمل ٹھٹھرنے لگتی ہے۔

ایسا اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ ان میں صلاحیت نہیں ہوتی، بلکہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ صدیوں سے ان کا جو استحصال کیا جاتا ہے وہ اس قوم کو مستقل طور پر ذہنی وفکری پستی اور عملی ناکارگی میں مبتلا کر دیتی ہے، ہندوستان میں برہمن اور اونچی ذات کے لوگ ان لوگوں کو جوان کے نزدیک نیچی ذات تصور کی جاتی تھی، یہی کہتے تھے کہ ان کے اندر قیادت کی اور اعلیٰ درجہ کے کاموں کی صلاحیت ہی نہیں ہے، لیکن جب انھیں کام کا موقع دیا گیا، تو ایسے ہی لوگوں میں ہمارے ملک کے معزز صدر آر کے نارائنن، مشہور قائد اور کامیاب وزیر جگ جیون رام جیسے لوگ پیدا ہوئے اور نہایت ہی ذمہ دار اور حساس عہدوں پر اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ جلوہ افروز ہیں، اور نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، جنوبی افریقہ میں صرف ۱۲ر فیصد سفید نسل کے لوگ تھے، حکومت ان کے ہاتھ میں تھی، تمام عہدوں پر وہی

فائز تھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ سب گورے ہی تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ سیاہ فام لوگوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور حکومت کے نظم ونسق کو چلانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، لیکن جب ملک آزاد ہوا اور سیاہ فام لوگوں نے کاروبار وحکومت اپنے ہاتھ میں لیا، تو اب اس وقت نہ صرف یہ کہ پوری کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، بلکہ تعلیم ومعیشت ہر میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

ان کو استحصال سے بچانے اور باعزت مقام پر لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس استحصال کا سد باب کیا جائے، کیوں کہ جب کوئی طبقہ اقتدار اور کلیدی عہدوں پر حاوی ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے گروہوں کو پنپنے نہیں دیتا اور کوشش کرتا رہتا ہے کہ کبھی بھی وہ سر نہ اٹھا پائیں، ہندوستانی مسلمان بھی ایسے ہی استحصال کی واضح مثال ہیں، حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر غیر مسلم رعایا کے ساتھ اپنے عہد حکومت میں یہ رویہ نہیں رکھا، آصف سابع میر عثمان علی خاں، نظام حیدرآباد کے بارے میں بعض تنگ نظر فسطائی ذہن کے لوگ پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور افسوس کہ ایسے پست ذہن اور احسان ناشناس لوگوں میں کانگریس کے قدیم لیڈر پی، وی نرسمہا راؤ سابق وزیر اعظم ہند بھی ہیں، کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے، لیکن نظام کے عہد میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملازمتوں میں ہندو اور مسلم تناسب اس طرح تھا :

فوج وپولیس	ہندو	۴۷ رفیصد	مسلمان	۲۳ رفیصد
سرکاری ملازمتیں	//	۶۵ رفیصد	//	۳۲ رفیصد
صنعت وحرفت	//	۹۲ رفیصد	//	۵ رفیصد
تجارت	//	۸۵ رفیصد	//	۱۳ رفیصد

(دیکھئے: حیدرآباد کا عروج وزوال: ۸۸، ۸۹)

لیکن اس وقت حیدرآباد اور دکن میں ملازمتوں میں بھی اور صنعت اور تجارت میں بھی جو گورنمنٹ کے لائسنس کی رہین منت ہوتی ہے، دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا تناسب کیا

ہے؟ آزادی سے پہلے ۱۹۳۹ء میں یوپی میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۴ر فیصد تھا، اور آج اس سے زیادہ ہی ہے، اس وقت وہاں ملازمتوں میں حسب ذیل تناسب تھا :

صوبائی ایکزیکیٹو ملازمت	ہندو	۵ء۵۲ر فیصد	مسلمان	۶ء۳۹ر فیصد
تحصیل دار	//	۹ء۵۴ر فیصد	//	۶ء۴۳ر فیصد
پولیس انسپکٹر	//	۲ء۵۴ر فیصد	//	۸ء۴۳ر فیصد
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس	//	۵۶ر فیصد	//	۲۸ر فیصد

کم وبیش یہی حال دوسری ملازمتوں کا تھا، اس وقت ان سب کا تذکرہ طولِ کلام کا باعث ہوگا، اسی صوبہ میں ۱۹۸۱ء میں ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب اس طرح ہے :

۱-	مرکزی حکومت کے دفاتر میں صرف	۴ء۴۱ر فیصد
۲-	صوبائی حکومتوں کے دفاتر میں	۶ء۰۱ر فیصد
۳-	آئی، اے، ایس	۲ء۹۹ر فیصد
۴-	آئی، پی، ایس	۲ء۸۵ر فیصد
۵-	ریلوے	۲ء۶۵ر فیصد
۶-	بینک	۲ء۱۸ر فیصد

(ہندوستانی مسلمان:۷۶)

غور کیجئے کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۹۸۱ء میں بھی قریب قریب وہی ہے، لیکن ملازمتوں میں تناسب کس قدر مختلف ہے! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان بچے تعلیم میں محنت کرتے اور مقابلہ میں آنہیں پاتے ہیں، اس لئے حکومت کا کوئی قصور نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں ہیں؟ مسلمانوں کی تو زبان کاٹ لی گئی اور اُردو زبان کو تعلیمی اعتبار سے غیر مؤثر قرار دے دیا گیا، نہ ان کی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دی گئی، انھیں محض وعدوں پر بہلایا گیا، پھر یہ کہ ملازمت کے بہت سے شعبے ایسے ہیں، جن میں اعلیٰ ڈگریاں مطلوب نہیں ہیں، جیسے درجۂ چہارم کی ملازمتیں، پولیس اور فوج کی ملازمت، اگر مسلمان کے ساتھ تنگ

نظری روانہ رکھی گئی ہوتی تو کم سے کم ان شعبوں میں ان کا تناسب بہتر ہوتا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی انتظامی مشنری میں بہت سے مسموم ذہن کے لوگ موجود ہیں، جنھیں فرقہ پرست عناصر نے غلط طور پر باور کرایا ہے کہ مسلمانوں نے ان کے آباء واجداد پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں اور انھیں ذلیل ورسوا کیا ہے، اس لئے جب تک انھیں گداگر بنا کر نہ چھوڑا جائے، اس ظلم کا انتقام مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔

ایسے مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ سبھوں کے ساتھ عدل اوراحسان کا معاملہ ہوجانا چاہئے، **ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان** (النحل:۹۰) —— اسلام کے تمام احکام اور شریعت کے پورے نظام کی اصل روح یہی ہے، دبے، کچلے ہوئے لوگوں کو استحصال سے بچانا عدل کا تقاضا ہے اور ان کے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کرنا ''احسان'' سے عبارت ہے، اس لئے ایسے مواقع پر محروم اور استحصال و ناانصافی سے دوچار طبقہ کو ریزرویشن اور مراعات فراہم کرنا، عدل واحسان کے تقاضہ کی تکمیل ہے، تمام ہی احکام شریعت میں یہی مزاج کارفرما ہے، نماز اپنی متعینہ کیفیت کے ساتھ سبھوں پر فرض ہے، لیکن مریض اور مسافر کے لئے خصوصی رعایتیں رکھی گئیں، مریض بیٹھ کر اور حسب ضرورت لیٹ کر بھی نماز ادا کرسکتا ہے، اور مسافروں کو چار رکعت والی نماز میں دو رکعت ادا کرنی ہے، روزے ہر بالغ مسلمان پر فرض ہیں، لیکن مریض اور مسافر کے لئے رعایت ہے، جہاد میں عورتوں کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے، بچوں پر کوئی عبادت فرض نہیں ہے، غریبوں پر زکوٰۃ وحج نہیں ہے، بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو بھی بہت سی سہولتیں ہیں، یہ بالغ و نابالغ، جوان اور بوڑھے، صحت منداور بیمار، مسافر اور مقیم، مالدار اور غریب، واقف و ناواقف کے درمیان احکام میں جو فرق کیا گیا ہے، اس کی اساس یہی تو ہے کہ جو لوگ کمزور ہوں ان کی رعایت ملحوظ رکھی جائے، قانون نفقہ کی تو بنیاد ہی اس پر ہے کہ جو لوگ کمانے کے لائق نہ ہوں، کمانے کی صلاحیت رکھنے والے لوگ ان کی ضروریات پوری کریں۔

عربوں کے خاص مزاج کو دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ائمہ قریش میں سے ہوں، کیوں کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ عرب قریش کے سوا کسی اور کے سامنے اپنی گردن تسلیم خم کرنے کے روادار نہیں تھے، یہ بھی ایک طرح کا ریزرویشن تھا، جو اس وقت کے حالات اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے دیا گیا تھا، اس لئے آپ کی وفات کے بعد جب انصار کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ انصار میں سے امیر ہوں، یا کم سے کم ایک امیر انصار سے اور ایک مہاجرین میں سے مقرر ہوں، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ امیر ہم میں سے ہوں اور وزیر تم میں سے، الأمیر منا والوزیر منکم۔

مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اصل طریقۂ کار یہی ہے کہ اس کے چار حصے برابری کے ساتھ مجاہدین میں تقسیم کردیئے جائیں اور ایک ہی حصہ بیت المال کی ملکیت ہو، لیکن غزوۂ حنین کے موقع سے جو کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا، آپ نے اسے مکہ کے نومسلموں اور کچھ مفلوک الحال مہاجرین کے درمیان تقسیم کردیا، یہ گویا ایک طرح کا ریزرویشن ہی تھا، جس کا مقصد نئے لوگوں کو اسلام پر ثابت قدم کرنا، پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا اور معاشی اعتبار سے پسماندہ لوگوں کو اوپر اٹھانا تھا، —— اس لئے ان حالات میں ریزرویشن اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت حکومت آندھراپردیش جو ریزرویشن دے رہی ہے، وہ ان کے حق سے کم ہی ہے، کیوں کہ خود حکومت کے اعداد وشمار کے مطابق آندھراپردیش میں مسلم آبادی کا تناسب ۹ رفیصد ہے، اور اس لحاظ سے کرناٹک میں ۴ رفیصد تمل ناڈو میں ۲ء ۵ رفیصد اور کیرالا میں ۱۲ رفیصد ریزرویشن مسلمانوں کو پہلے سے حاصل ہے، لیکن پھر بھی موجودہ حکومت کے اس اقدام کو ایک بہتر قدم سمجھا جائے گا، کاش! دوسری ریاستوں میں بھی کانگریس اور کانگریس کی اتحادی حکومتیں، اس کو اپنے لئے نمونۂ عمل بنائیں!!

۳۰ رجولائی ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

اغوا — ایک غیر اسلامی فعل!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجموعۂ اضداد بنایا ہے، اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور آگ کی حرارت بھی، گاہے شہد سے زیادہ مٹھاس اور گاہے نیم اور کریلا سے زیادہ کڑواپن، اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا، کیوں کہ انسان کو دنیا میں جس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کی تکمیل کے لئے مختلف صلاحیتوں اور متضاد صفات وخصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے، اسی لئے انسان میں جیسے محبت اور عفو درگذر کا مادہ رکھا گیا ہے، اسی طرح غضب اور انتقام کا جذبہ بھی اس میں بھرپور ہے، اگر انسان کو غصہ ہونے کی بات پر بھی غصہ نہ آئے، تو بقول امامِ غزالیؒ کے وہ گدھا ہے اور جہاں انتقام لینے کی گنجائش ہو، وہاں بھی اگر جذبۂ انتقام حرکت میں نہ آئے تو اس دنیا میں ظلم وتعدی اور جبر وزیادتی بڑھتی چلی جائے گی، جس سماج میں ظالم کے سامنے جرأتِ گفتار رکھنے والی زبانیں نہ ہوں، جس معاشرہ میں ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والی آنکھیں نہ ہوں اور جس سوسائٹی میں ظلم کے ہاتھ تھامنے والی کلائیاں باقی نہیں رہیں، وہ فساد، انسانیت سوزی اور لاقانونیت کا جنگل بن جائے گا، اس لئے ظالم کے خلاف مقاومت کا جذبہ برقرار رہنا ضروری ہے۔

یہ اگر قانونی حدود میں ہو تو تشدد اور دہشت گردی نہیں ہے، بلکہ انسانیت نوازی اور انسانی معاشرہ کے ساتھ رحم دلی ہے۔ اسلام میں انسانی خون اور زندگی کی بڑی اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کی زندگی بچانے کو پوری انسانیت کا تحفظ قرار دیا ہے، (مائدہ:۳۲) لیکن اس کے باوجود جہاد کی اجازت ہی نہیں دی گئی، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے، جس میں ظالموں اور مظلوموں دونوں کی جانیں جاتی ہیں، لیکن مقصد وہی ہے کہ اگر ظلم کی آندھی چلے اور کوئی دیوار اس کو روکنے والی نہ ہو، ناانصافی اور بربریت کا سیل بے کراں امڈے اور کوئی اس پر باندھ باندھنے والا نہ ہو، جور وتعدی کی آگ پھیلتی رہے اور کوئی اس پر پانی ڈالنے کی ہمت نہ کرے، تو

ظالموں کا حوصلہ بڑھتا جائے گا اور ان کے قدم مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جذبہ انفرادی طور پر بھی مطلوب ہے اور اجتماعی حیثیت سے بھی ، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی قوم باعزت اور آبرومندانہ زندگی نہیں گذار سکتی ۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال کے توسیع پسندانہ استعماری عزائم کے نتیجہ میں ایشیاء اور افریقہ کے کتنے ہی ممالک غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیئے گئے ۔ اگر اس بات کو ٹھنڈے پیٹ قبول کر لیا جاتا تو آج بھی یہ ممالک غلام ہی ہوتے ؛ لیکن اس ظلم کے خلاف کیسی کیسی قربانیاں دی گئیں، خونِ جگر کے نذرانے پیش کئے گئے ، کتنے حوصلہ مندوں نے اپنی رگ گلو کٹوائی اور کتنے اصحابِ عزیمت نے دار و رسن کو اپنے سروں سے آراستہ کیا، تب جا کر ان شہیدوں کے لہو سے آزادی کا چراغ روشن ہوا اور ظالموں کو راہِ فرار اختیار کرتے بنی، خود ہمارے ملک ہندوستان میں اگر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر آزادی کی لڑائی نہ لڑی ہوتی اور اس مقصد کے لئے قربانیاں نہ دی ہوتیں، تو کیا آج ہم ایک باعزت، خودمختار اور آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر موجود ہوتے ؟ نہیں، اور ہرگز نہیں !

اس لئے ظالموں کے خلاف مقاومت اور ان سے انتقام کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور دنیا میں امن و آشتی، عدل و انصاف، انسانی مساوات و برابری اور انسانی کرامت کی حفاظت و حمایت کے لئے اس جذبہ کا موجود رہنا بھی نہایت ضروری ہے، تاکہ اس کا ہر عمل قانون اور اصولِ انصاف کے دائرہ میں ہو، اگر ظلم کے جواب میں ظالم کے ساتھ اسی سلوک کو رَوا نہ رکھا جائے تو یہ دنیا ناانصافی کا خارزار بن جائے گی اور لوگ امن و انصاف کے پھول کے لئے ترسنے لگیں گے، اسی لئے اسلام نے انتقام کے بھی اصول بتائے ہیں۔ ان میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ ایک شخص کا بدلہ دوسرے شخص سے نہ لیا جائے۔ قرآن نے اس کی بار بار تاکید کی ہے اور حدیثوں میں بھی آپ ﷺ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ غلام قاتل ہو تو اس کے بدلے آزاد کو، عورت کے بدلے مرد کو قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے، مقصد یہ ہوتا کہ ہمارے مقتول کا قاتل جس درجہ کا ہے، اس سے اونچے درجہ کے شخص کو ہم اپنا نشانہ بنائیں، لیکن قرآن مجید نے اس تعدی آمیز رویہ کو غلط قرار دیا اور بتایا کہ جو قاتل ہو

وہی انتقام میں قتل کیا جائے گا، (البقرۃ:۱۷۸) اور دنیا وآخرت کا یہ قانون واضح کردیا کہ ایک شخص کی غلطی کا ذمہ دار دوسرا شخص نہیں ہوگا۔ ولا تزر وازرة وزر أخرىٰ . (فاطر:۱۸)

اسلام سے پہلے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مجرم نے جس درجہ کا نقصان پہنچایا ہو، اس سے زیادہ نقصان اس کو پہنچایا جائے، کسی نے ناک کو زخمی کیا، تو کوشش کی جاتی کہ اس کی آنکھ پھوڑ دی جائے، کسی نے دانت کو نقصان پہنچایا تو لوگ اس کے کان کے درپے ہو جاتے، کسی نے جزوی طور پر زخمی کیا، تو لوگ چاہتے ہیں کہ اس کی جان ہی لے کر چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس زیادتی اور انتقام کی اس بے جا روش کو بھی منع کیا اور فرمایا: ''جان کے بدلے میں جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہی سے قصاص لیا جائے، اور اگر کسی شخص نے زخمی کیا ہو، تو اس میں بھی برابری کے پیمانے کو ملحوظ رکھا جائے۔ (المائدہ:۴۵)

قرآن مجید کا صاف ارشاد ہے کہ تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہو، تمہارے لئے اسی حد تک قدم اٹھانے کی گنجائش ہے، اس سے زیادہ نہیں، اگر اس پر زیادتی کی جائے تو یہ اللہ تعالیٰ سے بے خوفی ہوگی: فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم ، (البقرۃ:۱۹۴) یہاں تک کہ جنگ میں بھی اس بات کی تلقین کی گئی کہ جو لوگ تم سے آمادۂ پیکار ہوں، انھیں سے جنگ کرو، دوسروں کو نشانہ بنا کر زیادتی کا ثبوت نہ دو، کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کو پسند نہیں کرتے، وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لاَ تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرۃ:۱۹۰)

اس وقت ہندوستان کے تین مزدور —— جو کویت کی ایک کمپنی کی وساطت سے عراق میں کام کر رہے تھے —— اغوا کی صورت حال سے گذر رہے ہیں، ان کے والدین اور متعلقین کا اس پر تڑپنا فطری بات ہے، لیکن ان کے علاوہ پورا ملک اس صورتِ حال پر بے چین ہے، یہ غریب مزدور پیشہ لوگ ہیں، انھیں امریکہ، عراق اور کویت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، یہ بے چارے محنت، مزدوری کرنے اور کچھ کما کر اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے کویت گئے تھے، اب کویت کی کمپنی نے انھیں عراق بھیج دیا، عراق اور کویت کی منافست سے امریکہ کی مدد کے

پس منظر میں اغوا کاروں نے انھیں پکڑ رکھا ہے، حالانکہ ہندوستان ان ملکوں میں ہے جن کا جھکاؤ عراق کی طرف رہا ہے، گو بی جے پی کی امریکہ نواز پالیسی اور غیر جانبدار تحریک سے دوری کی وجہ سے اس نے عراق پر امریکی حملہ کو روکنے کی کوئی نمایاں اور قابل ذکر کوشش نہیں کی، حالانکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور غیر جانبدار تحریک کے بانی ممالک میں ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ مؤثر آواز بلند کرسکتا تھا، لیکن پھر بھی وہ دبے لفظوں میں عراق کو امریکی کمانڈ کے تحت فوج بھیجنے سے مسلسل انکار کرتا رہا ہے، اس کے باوجود غریب ہندوستانی مزدوروں کو اغوا کا نشانہ بنانا یوں بھی انصاف کے بالکل مغائر ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر، کیا اسلام مظلوموں کو ایسے عمل کی اجازت دیتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، عراق میں ظلم ڈھانے والے امریکی و برطانوی فوجی ہیں، بے قصور شہریوں، یا کسی اور ملک کے مزدوروں سے انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں، جنگ میں تو اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ فوج کے ایک سپاہی نے حملہ کیا تو جواب میں دوسرے سپاہی پر حملہ کیا جائے، کیوں کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں، اسی طرح دو ملک یا دو قوموں کے درمیان جنگ ہو تو ایک گروہ دوسرے گروہ کے افراد کو گرفتار کرسکتا ہے، بشرطیکہ قیدیوں کے حقوق کی رعایت بھی کی جائے، تاکہ جنگی قیدیوں کے تبادلہ میں اپنے موقف کو مضبوط کیا جاسکے، رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے اس کا جواز ملتا ہے، آپ ﷺ نے دشمن فوج کے مجمع پر حملہ کیا ہے، اور دشمن گروہ کے لوگوں کو گرفتار بھی کیا ہے، اور ان کے بدلہ مسلمان قیدیوں کو رہا کرایا ہے۔

لیکن جنگ کے سلسلہ میں بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء کی جو ہدایات ملتی ہیں، ان میں یہ صراحت موجود ہے کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مزدوروں کو نشانہ نہ بنایا جائے، اس سے اسلام کی کشادہ قلبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عین میدانِ جنگ میں بھی وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ کیسا بہتر سلوک رَوا رکھتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ ایک ظالم و جابر، درندہ صفت، انسانیت سوز، اخلاقی قدروں سے محروم اور متکبر و خودسر، نیز ناانصافی کا علمبردار اور عالم

اسلام کا معاند ملک ہے —— اللہ تعالیٰ اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے! اور ایشائی، افریقی اور اسلامی ممالک کو اسکی جفا شعاری سے نجات عطا فرمائے! —— لیکن مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ امتحان وآزمائش کی ایسی گھڑی میں بھی اپنے آپ کو اسلامی اور اخلاقی قدروں پر قائم رکھیں، جیسا کہ صلیبی جنگوں کے وقت میں مسلمانوں نے اپنے بدترین دشمنوں اور درندہ صفت معاندین کے مقابلہ میں بھی عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا اور اپنی اخلاقی بلندی کے نقوش دنیا میں ثبت کر کے دکھائے۔

آج بھی مسلمانوں کو اس امتحان میں پورا اترنا چاہئے، افراد واشخاص یا بسوں یا جہازوں کو اغوا کرنے کے واقعات چند افراد کی طرف سے پیش آتے ہیں، جو عام طور پر دین سے بے بہرہ ہی ہوا کرتے ہیں، لیکن یہ واقعات پوری دنیا میں مسلمانوں کی بدنامی، رسوائی اور اسلام کی شبیہ کے بگڑنے کا سبب بنتے ہیں، اسلام یقیناً ایسی وحشت انگیز اور غیر منصفانہ کاروائیوں کی اجازت نہیں دیتا، جب آتش انتقام سلگ رہی ہو، جب جذبات کی آندھی چل رہی ہو اور جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہو، اس وقت بھی اپنے آپ کو شریعت کی حدود کے اندر رکھنا اور اللہ اور رسول کی کھینچی ہوئی لکیروں سے باہر نہ جانا مؤمن کا اصل کمال ہے اور یہی اس کے لئے خدا کی طرف سے امتحان اور ابتلاء وآزمائش کی نازک گھڑی ہے!

۲۶/ جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ ۱۳/ اگست ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

سوداور ہماراسماج

اِدھر چند دنوں سے پولیس نے غیر مجاز فینانسروں کا پیچھا کرنا شروع کیا ہےاور متعدد سود خواروں کو پکڑا ہے، ان کی گرفتاری کے بعد قرض کی شرح اور مقروضوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کے جو واقعات سامنے آئے ہیں، وہ بہت ہی افسوس ناک اور شرمناک ہیں، جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں اچھی خاصی تعداد مسلمانوں کی ہے، اس سے اور بھی کلیجہ خون ہوتا ہے؛ کیوں کہ اسلام میں جن برائیوں کی بہت شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہےاور نہایت ہی تاکید واہتمام کے ساتھ جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، ان میں سے ایک سود بھی ہے، قرآن مجید میں چار چار آیتوں میں سود کی مذمت اور ممانعت ہے، ارشاد فرمایا گیا کہ سودخوار قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے کہ گویا وہ آسیب زدہ ہیں، (بقرہ:۲۷۵) یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر سود چھوڑنے کو تیار نہ ہوتو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، (بقرہ:۲۷۸) یہودی سودخواری میں پیش پیش تھے، ان کی اس بری حرکت کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا، (نساء:۱۶۰) یہ بھی ارشاد ہوا کہ سود کا لین دین مال میں اضافہ کے لئے کرتے ہو، لیکن اللہ کے نزدیک اس سے مال میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے جذبہ سے جو زکوۃ ادا کرتے ہیں، اس میں کئی چند اضافہ ہوگا۔ (روم:۳۹)

رسول اللہ ﷺ نے سود کی اس درجہ مذمت فرمائی ہے کہ کم گناہ ہوں گے جن کی اس درجہ مذمت کی گئی ہوگی، اور اس کا کم تر درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے، (مستدرکِ حاکم:۲/۳۷، علی شرط الشیخین) حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کے ایک درہم کو چھتیس زنا سے بڑھ کر قرار دیا ہے، (الترغیب والترہیب:۳/۷) عوف بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان گناہوں سے خوب بچو جو بخشے نہیں جائیں گے، پھر یہ بھی ارشاد فرمایا: کہ سود کھانے والا قیامت کے دن مخبوط الحواس مجنون کی

صورت میں اٹھایا جائے گا۔ (مجمع الزوائد:۴/۱۱۰)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے سات مہلک چیزوں کا ذکر کیا، اور ان امور کو گناتے ہوئے پانچویں نمبر پر سود کھانے کا ذکر فرمایا، (بخاری، حدیث نمبر:۲۷۶۶) اسلام کی نگاہ میں سود کی شناعت کا یہ حال ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے کو بلکہ سودی کاروبار میں ہر طرح کے تعاون کو بھی باعثِ لعنت قرار دیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ میں گواہ بننے والے اور سودی کاروبار کو لکھنے والوں پر، (دیکھئے: الترغیب و الترہیب:۳/۵) اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ سب برابر ہیں، (مسلم عن جابرؓ، حدیث نمبر:۱۵۹۸) حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جس قوم میں زنا اور سود عام ہو جائے اس نے اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا لیا: ''**ما ظهر في قوم الزنا والربوا إلا أحلوا بأنفسهم عذاب الله** '' (مستدرک حاکم:۲/۳۷، الترغیب والترہیب:۳/۸) اور اس دور میں سود خوری کی جو کثرت ہے وہ اس پیشین گوئی کی عملی تصدیق ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب کی کثرت ہو جائے گی۔ (الترغیب والترہیب:۳/۹)

اسلام کی نظر میں سود کی جو شناعت ہے اس کے تحت آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے مجمع عام میں اس کی حرمت کا اعلان فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں جو سود کا رواج تھا، اسے میں اپنے قدموں کے نیچے دفن کر جاتا ہوں، اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس ابن مطلبؓ کے سود کو کالعدم قرار دیتا ہوں، (مسلم، حدیث نمبر:۱۲۱۸عن جابر بن عبد اللہؓ) سود کے سلسلہ میں شریعتِ اسلامی میں جو سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس پس منظر میں سلفِ صالحین نے ہمیشہ اس میں احتیاطی پہلو کو اختیار کیا ہے، حضرت عمرؓ تلقین فرمایا کرتے تھے کہ سود سے بھی بچو اور شبہ سود سے بھی، حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اگر اسلامی حکومت میں کوئی شخص سودی کاروبار میں ملوث ہو تو امام المسلمین کی ذمہ داری ہے کہ اس سے تائب ہونے کا تقاضہ کرے، اور اگر وہ تائب نہیں ہو، تو اس کی گردن اڑا دے...... ''**حق على إمام المسلمين أن يستتبه فإن رجع و إلا ضرب عنقه**''۔ (شرح الترغیب الترہیب:۳/۱۵)

سود کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دینار کا دینار سے اس طرح تبادلہ ہو کہ کسی طرف سے کمی بیشی نہیں ہو، درہم کا درہم سے تبادلہ اس طرح ہو کہ کمی بیشی نہ ہو ''**الدینار بالدینار لافضل بینهما الخ**'' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۸۸) ؛ کیوں کہ اس تبادلہ میں کمی بیشی ہو تو سود ہے، دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا، موجودہ دَور میں کاغذی نوٹ سونے سے مربوط ہیں، اس لئے جو حکم دینار کے دینار اور درہم کے درہم سے تبادلہ کا ہے، موجودہ دَور میں روپیہ یا کسی ملک کی کرنسی کا اسی ملک کی کرنسی سے تبادلہ ہو، اس کا بھی یہی حکم ہوگا، اگر کسی شخص کو روپئے دیے جائیں اور اس سے زیادہ روپئے وصول کیے جائیں یا کسی مالی ادارہ میں روپیہ جمع کیا جائے، اور جمع کردہ رقم سے زیادہ رقم وصول کی جائے، تو یہ بھی یقیناً سود ہی کی ایک صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شریعت کا خطاب پوری دنیا کے مسلمانوں سے ہے، اس لئے جو بھی حلال وحرام کے احکام ہیں، اگر قوی دلیل کے ذریعہ ان میں استثناء ثابت نہ ہو، تو وہ حکم پوری دنیا کے مسلمانوں سے متعلق ہوگا، خواہ وہ کسی مسلمان ملک میں رہتا ہو، یا ایسے ملک میں جس میں زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہو، چنانچہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء ومحدثین کی رائے یہی ہے کہ سود جیسے دارالاسلام میں حرام ہے، اسی طرح دارالکفر میں بھی، (المدونۃ: ۳/۲۷۹، شرح مہذب: ۹/۳۹۱، المغنی: ۴/۴۷) البتہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دارالحرب میں حربی یعنی اس ملک کے باشندہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم کو قرض دے کر زائد رقم لینا جائز ہے، اور اس کی بنیادی دلیل مکحول کی ایک روایت ہے کہ دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوتا ''**لاربوا بين المسلم و الحربي في دار الحرب**'' (المبسوط: ۱۰/۹۵) لیکن یہ روایت کئی اعتبار سے قابل غور ہے۔

(۱) مکحول صحابی نہیں ہیں، اس لئے انھوں نے براہِ راست اس روایت کو نہیں سنا ہے، ایسی روایت کو حدیث کی فنی اصطلاح میں ''مرسل'' کہتے ہیں، جو بہت سے محدثین اور فقہاء کے نزدیک معتبر نہیں ہوتی۔

(۲) اس روایت کو بہت سے محدثین نے نامعتبر قرار دیا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں ''لا حجة به '' (دیکھئے: شرح نقایہ:۲/۵۹) اور علامہ ابن قدامہؒ کا بیان ہے کہ کسی صحیح و معتبر کتاب میں یہ روایت نہیں آئی ہے، ''لم یرد في صحیح و لا في مسند و لا کتاب موثوق به''۔ (المغنی:۴/۴۷)

(۳) پھر ''لا ربوا بین المسلم و الحربي '' کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان اور حربی کافر کے درمیان سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا، اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود جائز نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حج میں فحش باتوں اور لڑائی جھگڑے سے منع کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے: فَلاَ رَفَثَ وَ لاَ فُسُوْقَ وَ لاَ جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ (بقرۃ:۱۹۷) اگر یہ دوسرا معنی مراد ہو تو یہ حربی سے سود لینے کی حرمت کی دلیل ہوگی نہ کہ جائز ہونے کی۔

(۴) پھر اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سود ہی سے نہیں بلکہ شبہ سود سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے؛ لہٰذا جس چیز کے سود ہونے اور نہ ہونے میں شبہ ہو، اس سے احتراز کیا جائے گا، اس احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دار الحرب میں بھی ایک ہی جنس کے تبادلہ میں ایک طرف سے اضافہ کو سود تصور کیا جائے اور اس سے منع کیا جائے؛ کیوں کہ اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو سود کی شناعت ہی لوگوں کے ذہن سے نکل جائے گی۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟ امام ابوحنیفہؒ نے کسی ملک کے دار الحرب بننے کے لئے تین شرطیں لگائی ہیں: اوّل یہ ہے کہ وہاں احکامِ کفر کا غلبہ ہو، دوسرے اس علاقہ کا اتصال دار الکفر سے ہو، تیسرے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو جو امان یعنی شہری حقوق حاصل تھے، وہ سابقہ استحقاق کی بنیاد پر باقی نہیں رہے، (بدائع الصنائع:۶/۱۱۲) اب غور کیجئے تو ہندوستان کا اتصال پاکستان، بنگلہ دیش اور بحری اعتبار سے، لدیپ جیسے ملکوں سے ہے، جو مسلمان ممالک ہیں، دوسرے اس ملک میں مسلمانوں کو مسلم عہدِ حکومت سے جو شہری حقوق حاصل تھے، تسلسل کے ساتھ وہی حقوق اب تک حاصل ہیں اور انگریزوں

کے آنے یا انڈین یونین بننے کی وجہ سے از سر نو ان کو شہریت حاصل نہیں کرنی پڑی، تو دوسری اور تیسری شرط تو یقینی طور پر موجود نہیں ہے، اور جہاں تک احکامِ کفر کے جاری ہونے کی بات ہے تو ایک جمہوری ملک میں جو احکام جاری ہوتے ہیں وہ تمام گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں، خود ہندوستان میں مسلمانوں کے حق میں نکاح و طلاق ، میراث اور دوسرے عائلی مسائل میں شریعتِ اسلامی پر عمل کیا جاتا ہے، حالاں کہ ہندو اکثریت پر ہندو عائلی قانون نافذ نہیں ہیں؛ اس لئے یہ بات بھی محل غور ہے کہ کیا ہندوستان میں اہل کفر کا قانون بمقابلہ مسلمانوں کے غالب ہے؟

علامہ شامیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کے قوانین بھی چلتے ہوں اور اہل شرک کے قوانین بھی، تو اسے دارالحرب نہیں سمجھا جائے گا ''لو أجريت أحكام المسلمين و أحكام أهل الشرك لا تكون دار حرب'' (ردالمحتار:۶/۲۸۸)، اِس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب نہیں ہے؛ کیوں کہ یہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے احکام جاری ہیں۔

یہ تقسیم تو قدیم فقہاء کے عہد کے اعتبار سے ہے، جب کہ جمہوری نظام پر مبنی حکومت کا تصور نہیں تھا، موجودہ دَور میں جمہوری حکومتیں دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان ایک درمیانی صورت ہے، جس میں حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اور ہر گروہ کو اپنی نجی زندگی میں مذہب پر عمل کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس کی مثال ''حبش'' کو قرار دیا جاسکتا ہے، ہجرت سے پہلے ''مکہ'' دارالحرب تھا، ہجرت کے بعد ''مدینہ'' دارالاسلام بن گیا اور ''حبش'' کی شکل ان دونوں کے درمیان تھی، جس میں حکومت کا مذہب عیسائیت تھا، اور مسلمانوں کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی تھی ، ہندوستان اور سیکولر ممالک اس وقت حبش کے مماثل ہیں، اس لئے انھیں دارالحرب کہنا درست نہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی ملک کے دارالحرب ہونے سے صرف اتنی ہی سی بات متعلق نہیں ہے کہ وہاں سود کی ممانعت نہیں ہوگی ، بلکہ اس سے اور بھی احکام متعلق ہیں ، دار

الحرب کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ بشرطِ قدرت وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں، تو کیا ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کا مشورہ دیا جاسکتا ہے؟ پھر جہاں دار الحرب میں سود کی اجازت ہے، وہیں حربیوں سے شراب، خنزیر یا مردار فروخت کرنے یا جوئے کے ذریعہ ان سے مال حاصل کرنے کی بھی اجازت ہے (حاشیہ چلپی علی تبیین الحقائق: ۴/ ۹۷)؛ کیوں کہ جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے، ان کے نزدیک حربی کا مال معصوم نہیں ہے، صرف یہ شرط ہے کہ دھوکہ دہی سے کام نہیں لیا جائے، اب بتایئے کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو ان سب باتوں کی اجازت دے دی جائے تو شریعت کی محرمات کا کیا احترام دلوں میں باقی رہ سکے گا؟

اس سلسلہ میں دو اور نکتوں پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے: اوّل یہ کہ دار الحرب میں مسلمانوں سے بھی سودی لین دین کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لئے خود مسلمانوں سے بھی سود خوری کا جواز فراہم ہو جائے گا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ دار الحرب میں سود لینے کی اجازت اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ ان مسلمانوں کے لئے ہے جو کسی مسلمان ملک کے باشندہ ہوں اور ویزا لے کر وقتی طور پر مسلمان ملک آئے ہوئے ہوں، مختلف فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے اور علامہ شہاب الدین چلپیؒ نے بہت وضاحت سے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:

> **المسلم الذي دخل دار الحرب بأمان إذا با ع درهماً بدرهمين أو با ع خمراً أو خنزيرا أو ميتة أو قامرهم و أخذ المال يحل .** (حاشیہ شہاب الدین چلپی علی تبیین الحقائق: ۴/ ۹۷)
>
> جو مسلمان دار الحرب میں امان (ویزا) لے کر داخل ہو، دو درہم کے بدلے ایک درہم فروخت کرے یا شراب یا خنزیر یا مردار فروخت کرے یا ان کے ساتھ جوا کھیلے اور مال لے لے، تو حلال ہے۔

گویا اگر ہندوستان کو دار الحرب مان بھی لیا جائے تو یہ اجازت ہندوستان کے مسلمان باشندوں کے لئے نہیں ہے۔

پس سود غریبوں کا استحصال ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے لعنت قرار دیا ہے، یہ نہایت ہی بڑے اور شدید گناہوں میں ہے، اس میں نہ صرف آخرت کی پکڑ ہے، بلکہ دنیا میں بھی عذاب خداوندی کا اندیشہ ہے، اور مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں ہو وہ کتاب وسنت کے احکام کا پابند ہے، اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر سود کو جائز قرار دیا جائے تو اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی، اور متعدد ایسے احکام بھی متعلق ہوں گے جن پر عمل کرنا قومی اور دینی مصالح کے قطعاً مغائر ہوگا، اور ایسے سود خواروں کی جماعت بڑھتی جائے گی، جنھیں پولیس اس وقت پکڑ رہی ہے، نیز سود کی یہ حرمت ہر صورت میں ہے، چاہے افراد واشخاص سے سود حاصل کیا جائے یا کسی مالیاتی ادارہ اور بینک سے، اللہ تعالیٰ ہمارے سماج کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، جسے خدا اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ وباللہ التوفیق

۲/ ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ ۱۴/ جنوری ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

نکاح نامہ — اہمیت اور افادیت

انسان کے لئے ایک بہت بڑی ضرورت خاندان کی ہے، اسی لئے اس کو 'سماجی حیوان' کہا جاتا ہے، خاندان رشتہ داروں کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے، انسان جن رشتوں میں بندھا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر تین ہیں: دادیہال، نانیہال اور سسرال، لیکن غور کیا جائے تو ان سہ رخی قرابت داریوں کی بنیاد نکاح ہے، والدین کا رشتۂ نکاح اولاد کو دادیہالی اور نانیہالی خاندان سے جوڑتا ہے اور خود اس کا نکاح سسرال کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے، اسی لئے اسلام میں نکاح کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور بے نکاحی زندگی کو ناپسند کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں نکاح کو ایک دنیوی اور نفسانی عمل سمجھا جاتا تھا اور نکاح سے بچنے کو خدا کی قربت کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا، لیکن اسلام دینِ فطرت ہے، وہ فطرت سے بغاوت کا قائل نہیں، بلکہ اس رَوش کے اختیار کرنے کا قائل ہے، جو راہِ فطرت پر قائم ہو، اسی لئے اس نکاح کو پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی اور دوسرے انبیاء کی مقدس سنت قرار دیا۔

اسلام میں نکاح کا تصور یہ ہے کہ دو مرد و عورت کے درمیان زندگی کی رفاقت کا معاہدہ ہے، نکاح کی وجہ سے عورت مرد کی ملکیت اور جائیداد نہیں بن جاتی کہ لاکھ چاہے مگر اسے رہائی نصیب نہ ہو؛ بلکہ دوسرے معاہدات کی طرح یہ بھی ایک معاہدہ ہے، اور اسلام چاہتا ہے کہ زندگی کے دونوں رفیق ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ اس معاہدہ کو نباہتے رہیں، ہاں، اگر کسی وجہ سے فریقین کے درمیان ایسی نفرت اور دوری پیدا ہو گئی کہ اب ان کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے، رفاقت ایک دوسرے کے لئے بوجھ ہو جائے اور یہ رشتہ سکون و طمانینت کی شبنم کے بجائے نفرت و عداوت کی آگ بن جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ وہ بہتر اور خوشگوار طریقہ پر

ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کرلیں، اس معاہدہ کو ختم کردیں اور دونوں اپنی اپنی زندگی کے نئے دَور کا آغاز کریں، فإمساک بمعروف أو تسریح بإحسان . (البقرۃ:۲۲۹)

معاہدات اور بھی ہوتے ہیں، خرید و فروخت بھی ایک معاہدہ ہے، کرایہ داری اور ملازمت بھی دو فریقوں کے درمیان معاہدہ ہے، اسی طرح شرکت و مضاربت کے مالی معاہدات ہیں؛ لیکن نکاح ایسا معاہدہ ہے جس سے کئی خاندانوں کا باہمی تعلق جڑا ہوا ہے اور جس سے آنے والی نسل کی تربیت اور کفالت وغیرہ کے بہت سے مسائل بھی متعلق ہیں، اس لئے اس کی ایک خصوصی نوعیت ہے، اسی لئے اس معاملہ کے طے پانے سے پہلے خطبہ رکھا گیا ہے، جس میں طرفین کو تقویٰ کی تلقین کی جاتی ہے اور ان کے لئے دعائیں بھی کی جاتی ہیں، خطبۂ نکاح میں بار بار ان آیات کا ذکر جن میں تقویٰ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ایک خاص مصلحت کے تحت ہے، اور وہ یہ ہے کہ میاں بیوی کا تعلق جلوت سے زیادہ خلوت کا ہے، اس لئے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی اور حق تلفی کو خدا کے خوف کے سواء اور کوئی چیز نہیں روک سکتی، اسی لئے خاص طور پر اور بار بار تقویٰ کی تلقین کی گئی ہے۔

نکاح اصل میں تو زبانی ایجاب و قبول ہی سے وجود میں آتا ہے، لیکن جن معاہدات میں بقیہ امور مستقبل میں ادا طلب ہوں، ان میں تحریری رکارڈ مرتب کرلینا افضل طریقہ ہے اور خود قرآن مجید نے اس کی صراحت کی ہے، (البقرۃ:۲۸۲) نکاح میں اکثر اوقات مہر بعد میں ادا کیا جاتا ہے، اس لئے یہ بھی ان معاہدات میں داخل ہے، بہت سے قانونی مسائل میں بھی نکاح کے مستند رکارڈ کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لئے اگر نکاح کے معاہدہ کو تحریری طور پر بھی مرتب کرلیا جائے تو یہ عین مزاجِ شریعت کے مطابق ہے، اسی لئے اکثر مقامات پر حکومت کی طرف سے یا مسلمانوں کے کسی مذہبی ادارہ کی طرف سے نکاح نامے دستیاب ہیں، یہ نکاح نامے آئندہ پیدا ہونے والی بہت سی امکانی نزاعات کو ثابت کرنے میں مدد و معاون ہیں۔

نکاح نامہ میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی فریق اس سے مکر جائے تو اس کے خلاف دلیل بنتا ہے، نکاح نامہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ

اس عورت کے بطن سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں، وہ اسی مرد کی اولاد ہیں، مرد پر ان کے نفقہ اور کفالت کی ذمہ داری ہے، اور ان بچوں کو اس مرد کے ترکہ میں حق میراث حاصل ہے، نکاح نامہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ عورت کب سے اس مرد کی طرف سے نفقہ کی حقدار ہے، نکاح نامے کی وجہ سے بہت سے ان رشتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے، نکاح نامہ سے مہر کی مقدار معلوم ہوتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نکاح کے وقت مہر ادا کیا گیا یا نہیں؟

موجودہ دَور میں مسلمانوں کی احکامِ شریعت سے ناواقفیت اور سماجی بگاڑ کی وجہ سے خدا سے بے خوفی کے باعث ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ’نکاح نامہ‘ میں زوجین کے لئے خوشگوار زندگی گزارنے اور ایک دوسرے کے ساتھ معتدل تعلقات قائم رکھنے کے سلسلہ میں ضروری ہدایات بھی ہوں، چنانچہ دکن کے نکاح نامہ میں حقوق الزوجین کو بہتر طریقہ پر واضح کر دیا گیا ہے، خطبۂ نکاح کے موقعہ سے زوجین کو جو ہدایات دی جاتی ہیں، وہ بڑی اہم ہوتی ہیں، لیکن ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہیں، اگر خطبہ کے ساتھ نکاح نامہ میں بھی ضروری ہدایات درج ہوں، تو یہ نکاح نامہ طرفین کے لئے تذکیر کا باعث ہوگا۔

ہندوستان کے حالات میں ایک اہم مسئلہ میاں بیوی کے باہمی نزاعات کو حل کرنے کا ہے، اگر زوجین میں تعلقات خراب ہوں، تو بجائے اس کے کہ فریقین کسی مذہبی ادارہ میں یا مذہبی شخصیت کے پاس جائیں اور اپنے معاملہ کو سلجھائیں، ایسے وکلاء کے پاس پہنچ جاتے ہیں جن کو مسئلہ حل کرنے سے زیادہ مقدمہ کو آگے بڑھانے اور مقدمہ کی درازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فیس وصول کرنے سے دلچسپی ہوتی ہے، اس صورتِ حال کی وجہ سے سماج میں بہت ہی تکلیف دہ واقعات پیش آرہے ہیں، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مرد کسی جائز شرعی سبب کے بغیر طلاق دے دیتا ہے، یا شرعی اصولوں کی رعایت کیے بغیر تین طلاقیں دے دیتا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مرد کی زیادتی یا باہمی ناچاقی کی وجہ سے عورت علاحدگی حاصل کرنا چاہے اور خدا ناترس شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو ان کے لئے بڑی دشواری پیش آتی ہے،

اگر وہ عدالت میں جائے تو غیر مسلم جج کی طرف سے فسخ نکاح کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں، دوسرے عدالتی کارروائیوں کا طویل سلسلہ ایسا ہے کہ ان مقدمات میں دسیوں سال لگ جاتے ہیں، چنانچہ بعض دفعہ وکیلوں کے اکسانے پر عورتیں جھوٹا ڈوری کیس کر دیتی ہیں اور بہت سے بے قصور شوہر، ان کے ماں باپ اور بھائی بہن راتوں رات گرفتار کر لئے جاتے ہیں اور انھیں ضمانت بھی نہیں ملتی۔

ان کا حل اصل میں وہی ہے جو خود قرآن مجید نے متعین کیا ہے، کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات اس حد تک بڑھ جائیں کہ وہ آپس میں انھیں حل نہیں کر سکیں تو چاہے کہ دونوں فریق حَکَم مقرر کر لیں، حکم ان دونوں کے درمیان میل ملاپ پیدا کرنے یا جو مناسب حال ہو، وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرے، (النساء: ۳۵) حکم ایسا ہونا چاہئے جو احکامِ شرعیہ سے واقف ہو، اللہ کا خوف رکھتا ہو، غیر جانبدار اور مسائل کو حل کرنے میں مخلص ہو، ہر آبادی، سماج اور خاندان میں ایسے لائق اور مناسب حکم کا ملنا دشوار ہے، لیکن اگر وہاں دار القضاء یا شرعی پنچایت قائم ہے، تو قاضی شریعت (جو مسلمانوں کے منتخب امیر یا مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد کی طرف سے فسخ نکاح کے بشمول مسائل اور اختلاف کو حل کرنے کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں) یا شرعی پنچایت کے ذمہ داران کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے، کہ وہ ان اوصاف کے حامل ہوں گے۔

اس لئے ہندوستان کے خصوصی حالات کے پس منظر میں نکاح نامہ میں ضروری تنقیحات ومعلومات اور زوجین کے لئے مناسب ہدایات کے ساتھ تحکیم کی شق داخل کرنا بھی بہت ہی مناسب اور مختلف دشواریوں کا حل ہے، اور اس طرح مسلمان اپنے آپ کو عدالتوں کی گراں باریوں سے بچا سکیں گے، طلاق کے واقعات کم ہوں گے، ڈوری کیس کے ناخوشگوار واقعات روکے جا سکیں گے اور طرفین کے لئے یہ بات ممکن ہو سکے گی کہ وہ جلد اور سستا انصاف حاصل کر سکیں۔

اسی پس منظر میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' نے نکاح نامہ مرتب کیا ہے، یہ نکاح

نامہ نکاح سے متعلق ضروری تنقیحات اور طرفین سے متعلق معلومات پر تو مشتمل ہے ہی اور زیادہ تر یہ حصہ دکن کے نکاح نامہ سے ماخوذ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نکاح نامہ میں زوجین کے لئے ضروری ہدایات، میاں بیوی کے حقوق اور تین طلاق کی مذمت بھی شامل ہے، اور آخر میں ایک اقرار نامہ بھی ہے، جس میں زوجین عہد کرتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو مقامی دار القضاء یا شرعی پنچایت ثالث ہوگی اور اس کا فیصلہ طرفین کے لئے قابل قبول ہوگا، اس اقرار نامہ سے نہ صرف یہ کہ زوجین کے باہمی اختلافات کو حل کرنے میں سہولت پیدا ہوگی، بلکہ دار القضاء کے نظام کو بھی تقویت پہنچے گی، اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرتب کردہ مجوزہ نکاح نامہ کی ابتداء عرصہ پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے عہد میں ہوئی اور اس نکاح نامہ کے پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مستقل سیمنار رکھا، اس سیمنار میں پورے ملک سے علماء اور اربابِ افتاء، سماجی امور کے ماہرین اور دانشوروں کی بڑی تعداد شریک ہوئی اور مختلف پہلوؤں پر بحثیں ہوئیں، پھر بورڈ کے اجلاسِ بنگلور میں نکاح نامہ کا ایک مسودہ بحث اور غور وفکر کے لئے پیش کیا گیا، اس مسودہ پر جو آراء سامنے آئیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس نے بعض ترمیمات کے ساتھ نکاح نامہ کا مسودہ بورڈ کے ارکانِ عاملہ اور اہم علماء اور مفتیان کو روانہ کیا، پھر اس سلسلہ میں جو آراء آئیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے جزوی ترمیمات کی گئیں اور بالآخر بورڈ کی مجلس عاملہ نے اسے آئندہ اجلاسِ عام میں پیش کرنے کے لئے آخری شکل دی۔

اس نکاح نامہ کا جہاں ملت کے سنجیدہ اور باشعور افراد کی طرف سے استقبال کیا جا رہا ہے، وہیں ذرائع ابلاغ نکاح نامہ کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ اس نکاح نامہ نے مردوں سے طلاق کا حق چھین لیا ہے، کوئی کہتا ہے کہ عورت کو طلاق کا حق دے دیا گیا ہے، کہیں سے آواز اٹھتی ہے کہ اس سے مظلوم عورتوں کے

مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی، یہ ساری باتیں خلافِ واقعہ ہیں،شریعت کے احکام میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی؛ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد سے حق طلاق چھین لیا جائے، یا مرد سے لے کر عورت کو حق طلاق منتقل کردیا جائے، اسی طرح یہ کہنا کہ عورتوں کے مسائل حل کرنے میں اس سے مدد نہیں ملے گی، قطعاً درست نہیں ہے، اس سے عورتوں اور مردوں دونوں کے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی؛ کیوں کہ اس سے کم وقت میں بغیر کسی خرچ کے انصاف مل سکے گا اور طرفین اپنے حقوق پاسکیں گے، مسلم سماج مقدمہ بازی کی لعنت سے بچ سکے گا اور مسلمانوں کے اپنے شرعی عدالتی نظام کو تقویت حاصل ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ نکاح نامہ بہت سی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کا علاج ہے اور اس کو رواج دینے اور عام کرنے کی ضرورت ہے!

یکم محرم الحرام ۱۴۲۶ھ ۱۱/ فروری ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

نظامِ قضاء — اہمیت وضرورت

مسلمان چاہے دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں، احکام شریعت کے پابند ہیں، اگر اقتدار کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، تو شریعت کے اجتماعی اور تعزیری قوانین بھی جاری ہوں گے، البتہ غیر مسلم اقلیت کو عقیدہ وعبادت کی آزادی کے علاوہ شخصی قوانین (Personal Low) پر بھی عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی، اسلام میں شراب حرام ہے، لیکن اگر ان کے مذہب میں شراب پینے کی اجازت ہوگی، اسلام میں سور حرام اور سراپا نجس ہے، لیکن اگر ان کے مذہب میں اجازت ہو، تو وہ اسلامی ملک میں بھی خنزیر کھا سکیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا مذہب کسی محرم رشتہ دار جیسے بہن سے نکاح کی اجازت دیتا ہو، تو حکومت اس میں بھی اپنی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کرے گی، یہی حال شخصی اور خاندانی زندگی کے دوسرے مسائل کا ہے۔

شریعت یہی حکم غیر مسلم ملک کی مسلمان اقلیت کو بھی دیتی ہے، مسلمان اگر کسی غیر مسلم ملک کی اقلیت ہوں، یا اقتدار پر غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو، تو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق قوانین کا نافذ کرنا مسلمانوں پر واجب نہیں ہوگا؛ کیوں کہ وہ ان کے اختیار سے باہر ہے، اور انسان اپنی قدرت واختیار کے اعتبار سے ہی احکام شریعت کا مکلّف ہے، اسی طرح اسلام کے قوانین جرم وسزاء بھی ان ملکوں میں نافذ نہیں کئے جائیں گے، کیوں کہ ایک تو ان قوانین کو نافذ کرنے کا حق اسلامی حکومت کو ہے، اور وہ یہاں مفقود ہے، دوسرے اسلام میں جرائم کی سزائیں یقیناً سخت رکھی گئی ہیں، اور زیادہ تر جسمانی نوعیت کی ہیں، لیکن اسلام ان سزاؤں کے ساتھ ایسا ماحول بھی فراہم کرتا ہے، جو گناہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لے اور قدموں کو روک لے، مثلاً زنا کی سزا شادی شدہ مرد وعورت کے لئے سنگسار کرنا ہے، اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے کوڑے لگوانا ہے، لیکن جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے، وہاں قانون حجاب پر عورتوں سے عمل کرایا جائے گا، مردوں اور عورتوں کے اختلاط پر پابندی ہوگی،

طلبہ وطالبات کی درسگاہیں اور مرد وعورت کی نشست گاہیں الگ الگ ہوں گی، فحش تصویروں، پوسٹروں، مخرب اخلاق فلموں، کتابوں اور جریدوں پر پابندی ہوگی، شراب پر قدغن ہوگی، کسی میڈیکل سبب کے بغیر اسقاطِ حمل کی ممانعت ہوگی، اور وقت پر شادی کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی، غور کیجئے کہ جس ماحول میں ان باتوں کا اہتمام کیا جائے، کیا وہاں بدکاری کے واقعات پیش آئیں گے؟ اور جہاں گناہ کی طرف دعوت دینے والے محرکات پر پابندی نہ ہو، اور حکومت کی طرف سے باضابطہ زنا کا لائسنس جاری کیا جاتا ہو، وہاں اگر ایسے سخت قوانین نافذ کئے جائیں تو یہ یقیناً قرین انصاف نہیں ہوگا۔

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، وہ عقیدہ وعبادت میں احکام شریعت کے پابند ہیں؛ لیکن چوں کہ عقیدہ اور عبادت کا تعلق انسان اور اس کے خالق سے ہے، اس لئے ان میں نزاع و اختلاف کی نوبت عام طور پر نہیں آتی، اور حقوق وفرائض میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا، انسانی زندگی کے دو شعبے ایسے ہیں، جن پر مسلمان اقلیت کو بھی عمل کرنا ضروری ہے، چوں کہ ان کا تعلق ملک کے دو شہریوں کے ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ اور سلوک سے ہے، اس لئے ان کے سلسلہ میں بعض اوقات اختلاف اور ٹکراؤ کی نوبت بھی آتی ہے، یہ دو شعبے مناکحات اور معاملات کے ہیں۔

مناکحات سے مراد خاندانی تعلقات اور روابط ہیں، جیسے میاں بیوی، والدین اور اولاد، خاندان کے مختلف رشتہ داروں اور قرابت مندوں کے حقوق اور فرائض، ''مناکحات'' نکاح سے ماخوذ ہے، اور فقہاء خاندانی زندگی سے متعلق تمام مسائل کو ''مناکحات'' سے تعبیر کرتے ہیں؛ کیوں کہ نکاح ہی تمام رشتوں کی اساس اور بنیاد ہے، اسی سے خاندان وجود میں آتا ہے اور شاخ در شاخ پھیلتا چلا جاتا ہے، اس شعبۂ زندگی میں عام طور پر ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان ہی سے معاملہ درپیش ہوتا ہے، دوسرا شعبہ معاملات کا ہے، معاملات سے مراد دو شہریوں کے درمیان مالی لین دین سے متعلق امور ہیں، جیسے خرید وفروخت، صنعت کار اور مزدور، مالک اور کرایہ دار کے مسائل، ان کے باہمی روابط اور تعلقات کی بنیاد 'مال' پر ہوتی ہے، اور حکومت کا

قانون چاہے قانونِ شریعت سے مختلف ہو، لیکن لوگ اپنے طور پر قانون شریعت پر عمل کر سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو محرمات وممنوعات سے بچا سکتے ہیں، مثلاً حکومت سود لینے کی اجازت دیتی ہے، لیکن یہ بات ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم خود سود لینے سے پرہیز کریں، ان دونوں شعبوں میں بھی غیر مسلم اقلیت کے لئے احکام شرع پر عمل کرنا ضروری ہے۔

مناکحات اور معاملات سے متعلق بہت سے مسائل میں ٹکراؤ اور اختلاف پیدا ہوتا ہے، جب اس طرح کی نزاع پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو، فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (نساء:۵۹) اللہ اور رسول ﷺ کی طرف کسی معاملہ کو لوٹانے کی کیا صورت ہے؟ وہ یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر عمل کیا جائے، اور اس عدالت سے رجوع کیا جائے جو خدا اور رسول ﷺ کا یقین رکھتی ہو، اور اس یقین کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلاَ وَ رَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا . (نساء:۵٦)

آپ کے پروردگار کی قسم! وہ اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے، جب تک اپنے باہمی جھگڑے میں آپ کو منصف نہیں بنالیں، پھر اپنے دل میں آپ کے فیصلہ سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر تسلیم خم کردیں۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ بہت سے معاملات وہ ہیں جو مسلمان قاضی کے ذریعہ ہی حل کیے جاسکتے ہیں، جیسے فسخ نکاح کا مسئلہ ہے، فسخ نکاح کی بیشتر صورتیں قاضی کے فیصلہ سے متعلق ہیں اور اس قاضی کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ قاضی کو مسلمانوں پر ''عمومی ولایت'' حاصل ہوتی ہے، اسی ولایت کی بناء پر وہ فیصلے کرتا ہے اور غیر مسلم مسلمان کا ولی نہیں ہوسکتا، اس لئے اس کا فیصلہ شرعاً غیر معتبر ہوگا، اس پس منظر میں فقہاء نے مسلمان اقلیتوں کے

لئے بھی نظام قضاء کے قیام کو واجب قرار دیا ہے، فقہاء کے یہاں اس سلسلہ میں بہت سی تصریحات موجود ہیں، علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

> **وإذا لم يكن سلطان ولا من يجوز التقلد منه كما هو في بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة الآن يجب على المسلمين أن يتفقوا على واحد منهم يجعلونه واليا يولي قاضيا أو يكون هو الذي يقضي بينهم .**
>
> (فتح القدير:۴/۴۲۷)
>
> جب سلطان نہ ہو اور نہ کوئی ایسی شخصیت ہو، جس کی طرف سے قاضی وغیرہ کا تقرر درست ہو، جیسا کہ مسلمانوں کے بعض ان علاقوں کا حال ہے جن پر غیر مسلموں کا غلبہ ہوگیا ہے، جیسا کہ اس وقت قرطبہ، تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی شخص پر اتفاق کرلیں کہ وہ ان کا والی (امیر) ہو، پھر وہ قاضی مقرر کرے یا وہ خود لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔

یہ بات فقہ کی دوسری کتابوں میں بھی صراحتاً ملتی ہے، (دیکھئے: فتاویٰ بزازیہ:۶/ ۳۱۱، البحر الرائق:۶/ ۲۹۸، جامع الفصولین:۱/۱۴، طحاوی:۱/ ۳۳۹) چنانچہ مختلف ادوار میں مسلمان فقہاء کی اس ہدایت پر عمل کرتے رہے ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب ’’عرب و ہند کے تعلقات‘‘ میں نقل کیا ہے کہ مشہور عرب سیاح سلیمان جب چین کے شہر خانقو پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ شاہ چین کی طرف سے مسلمانوں کے لئے حکم مقرر تھا، جو قرآن کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے کیا کرتا تھا، اور ابن شہریار نے ہندوستان کے سفر نامہ ’’عجائب الہند‘‘ میں نقل کیا ہے کہ شہر مدراس کے قریب ’’صیمور‘‘ نامی مقام پر مسلمانوں کے لئے ’’ہنرمن‘‘ مقرر تھا، جس کا نام ’عباس ابن ہامان‘ تھا، اسی طرح مسعودی —— جس نے ۳۰۴ھ میں ہندوستان کی سیاحت کی ہے —— نے بھی جنوبی ہند میں مسلمانوں کے لئے ’’ہنرمن‘‘ کے تقرر کا ذکر کیا ہے، جن کا نام ابوسعید بن زکریا تھا، ’’ہنرمن‘‘ مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ

کرتے اور ان کی دینی ضرورتوں کو پوری کیا کرتے تھے، یہ ''ہنرمن'' ہنرمند کی بگڑی ہوئی حالت معلوم ہوتی ہے اور ہنرمند کا ترجمہ دانشمند یعنی عالم سے کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے جنوبی علاقہ میں مسلمان حکومت کے قیام کے پہلے سے نظامِ امارت اور نظام قضاء قائم تھا۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کا بیشتر علاقہ انگریزوں کی عمل داری میں آچکا تھا، کے بعد بھی مسلمانوں کے لئے عدالتوں میں قاضی اور ہندوؤں کے لئے پنڈت ہوا کرتے تھے، ۱۸۶۲ء میں یہ عہدہ ختم کردیا گیا، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے انگریزوں کے قبضہ کے بعد غالباً سب سے پہلی بار نظامِ امارت اور نظامِ قضاء کے قائم کرنے کا فتویٰ دیا، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :

> اگر دارالحرب میں کفار کی طرف سے مسلمانوں کے لئے کوئی والی مقرر ہو تو اس کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے، ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک شخص کو جو امین اور دیانت دار ہو، اپنا سردار قرار دے لیں، کہ اس کی اجازت سے جمعہ اور عیدین کا قیام، ایسے نابالغ بچوں کا نکاح جن کا کوئی ولی نہ ہو، یتیموں کے مال کی حفاظت، نزاعی مقدمات میں شریعت کے متعین کردہ حصے کے مطابق وراثت کی تقسیم وغیرہ عمل میں آئے، نیز امورِ سلطنت میں کوئی مداخلت اور خلل اندازی نہ کی جائے۔ (فتاویٰ عزیزیہ: ۱/۳۲)

چنانچہ ہندوستان میں خلافت تحریک کے بعد سے ہی اس کی باضابطہ کوششوں کا آغاز ہوا، اس عہد کے بالغ نظر علماء کا خیال تھا کہ پورے ہندوستان کی سطح پر امارت اور قضاء کا نظام قائم کریں، لیکن بعض وجوہ کے تحت یہ ممکن نہیں ہوسکا، اور صوبہ بہار کے لئے یہ بات مقدر ہوئی کہ وہاں سب سے پہلے (۱۹۲۱ء) میں نظامِ امارت کا قیام عمل میں آئے، جب کہ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ انجمن علماءِ بہار کے تحت اس سے پہلے ہی دارالقضاء قائم فرما

چکے تھے، جو امارت کے ساتھ ضم کر دیا گیا، اس کے علاوہ گذشتہ تیس، چالیس سال کے عرصہ میں آسام، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں بھی امارت قائم ہو چکی ہے اور بعض دوسرے صوبوں میں بھی کامیابی کے ساتھ دار القضاء کا نظام چل رہا ہے، بلکہ ۱۹۷۲ء میں جب مسلم پرسنل لاء کنونشن بمبئی منعقد ہوا تو اس وقت بھی بہت سے بزرگوں کے ذہن میں نظامِ امارت کا قیام تھا، لیکن حالات کو سازگار نہ سمجھتے ہوئے اس سلسلہ میں پیش رفت نہیں ہوسکی، اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا، تا کہ تمام مسلمان ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، نظامِ امارت کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے اپنے نظامِ قضاء کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی ہے اسی لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ایک تحریک کے طور پر قیامِ دار القضاء کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، کہ جن صوبوں میں امارت کا نظام قائم ہے، جیسے بہار واڑیسہ، جھارکھنڈ، کرناٹک، آندھرا پردیش، آسام، وہاں امارت کے تحت دار القضاء قائم کئے جائیں اور جہاں نظامِ امارت قائم نہ ہو وہاں براہِ راست مسلم پرسنل لاء بورڈ دار القضاء قائم کرے، کیوں کہ اس وقت بورڈ سے بڑھ کر ''ارباب حل وعقد'' کا کوئی اور نمائندہ اجتماع موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دار القضاء (شرعی عدالت) مسلمانوں کے خاندانی مسائل کا بہترین حل، شرعی فریضہ، سرکاری عدالت کی سرگرانی سے نجات دینے والا بنیادی ادارہ، ارزاں اور کم وقت میں انصاف کے حصول کا ذریعہ اور قرآن وحدیث نیز قانونِ شریعت کے سلسلہ میں عدالتوں کی من چاہی تعبیرات کے سد باب کا مؤثر ذریعہ ہے، اور مسلمانوں کا فریضہ کا ہے کہ وہ اس ملک میں شریعت کے تحفظ اور اپنے آپ پر رضا کارانہ شریعت کی تنفیذ کے لئے اس نظام کو تقویت پہنچائیں اور اپنے مسائل اور باہمی تنازعات کے حل کے لئے دار القضاء سے رجوع ہوں۔

۲۹/محرم الحرام ۱۴۲۶ھ، ۱۱/ مارچ ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

عملیات — آداب واحکام

ادھر اخبارات میں کئی خبریں عامل حضرات کی گرفتاری سے متعلق سامنے آئی ہیں ، پریشان حال لوگ ان کے پاس دین کی نسبت سے آتے ہیں ، ایسے لوگوں کی طرف سے ضرورت مندوں کا استحصال، ان سے غیر معمولی مقدار میں رقوم کی وصولی، یہاں تک کہ عزت و آبرو پر بھی دست درازی کے واقعات حد درجہ افسوسناک ہیں ، اچھے اور برے واقعات سماج میں دن ورات پیش آتے رہتے ہیں، اور جب کسی معاشرہ میں برائی کا دور دورہ ہوجاتا ہے، اور جرائم روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں، تو لوگوں کی نگاہ میں ان واقعات کی اہمیت کم ہوجاتی ہے، کوئی بات کتنی بھی نامناسب ہو، لیکن جب آنکھیں انھیں دیکھنے اور کان ان کے سننے کے خوگر ہوجائیں ، تو اس کی سنگینی اور شناعت کا احساس کم سے کم ہوتا جاتا ہے، لیکن یہی واقعات اگر دینی مراکز اور دینی شخصیتوں کی نسبت سے سامنے آئیں، تو دل پر چوٹ لگتی ہے، اور دین اور اہل دین کا اعتماد واعتبار مجروح ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو شفاء اور مومن کے لئے رحمت قرار دیا ہے، **ونـــــزل مــن القـرآن مـاهـو شـفـاء و رحـمة للمؤمنين** ، (اسراء:۸۲) — اصل میں تو قرآن مجید دل کی بیماریوں کے لئے شفاء ہے، وہ کفر وشرک اور نفاق کی بیماری سے قلب کو نجات عطا کرتا ہے، **شفاء لـمـا فـى الـصـدور** ، (یونس:۵۷) — لیکن کیا اللہ کی یہ 'کتابِ اعجاز' جسم انسانی کے لئے بھی باعث شفاء ہے؟ اس میں اختلاف ہے، اور اکثر اہل علم اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید سے شفاء جسمانی بھی حاصل ہوتی ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۳۱۶، نیل الاوطار: ۸/۲۱۲) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ بچھو گزیدہ شخص پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے شفاء عطا فرمائی، (نیل الاوطار: ۸/۲۱۵) — خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ فلق وناس کے ذریعہ شفاء جسمانی کا ذکر

موجود ہے۔

اسی طرح بعض بیماریوں سے شفاء کے لئے دُعائیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، بعض دُعائیں مطلق بیماری کے لئے ہیں، اور بعض دُعائیں متعین بیماریوں کے لئے، مشہور محدث امام ابوزکریا نوویؒ نے ماثور دُعاؤں اور اذکار کو ''کتاب الأذکار'' کے نام سے جمع فرمایا ہے، یہ ایک ضخیم کتاب ہے، اور اس میں ایسی بہت سی دُعائیں موجود ہیں —— نیز یہ بات عقل وخرد کے بھی خلاف نہیں، جن مادی دواؤں کو ہم کھاتے اور ان سے صحت یاب ہوتے ہیں، ان میں یہ خصوصیت اور نافعیت خالق کائنات ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، تو اگر اللہ تعالیٰ وہی تاثیر وصلاحیت الفاظ اور کلمات میں پیدا کردیں تو یقیناً یہ بھی باعث تعجب نہیں ہے، اس پر انسانی تجربات بھی شاہد ہیں، بہت سے مواقع پر کسی آیت کے پڑھنے یا دَم کرنے یا کسی دُعاء کے پڑھنے کی وجہ سے شفاء حاصل ہوتی ہے، اور انسان عملاً اس کا تجربہ کرتا ہے، اسی لئے صحیح یہی ہے کہ دُعائیں بھی، قرآنی آیات بھی اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ بھی شفاء کی تاثیر رکھتے ہیں، اور یہ اسباب کے درجہ میں ہیں، اصل شفاء اللہ ہی کی مشیت اور اسی کے حکم سے ہے۔

روحانی عمل کے ذریعہ علاج کی مختلف صورتیں ہیں، دُعاء کرنا، کوئی آیت، ذکر یا دُعاء پڑھ کر دَم کرنا، قرآن مجید کی آیت، دُعاء یا اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کو لکھنا اور اسے دھو کر پینا اور لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا —— جہاں تک شفاء کی دُعاء کرنے کی بات ہے، خواہ اپنے لئے یا دوسرے کے لئے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ پر دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ دُعاء فرماتے تھے :

اللهم رب الناس ، اذهب البأس ، وأشف أنت الشافی ، لا شفاء إلا شفاء ک ، شفاء لا یغادر سقما .

(بخاری، حدیث نمبر: ۵۳۵۱، باب دعاء العائد للمریض)

اے اللہ! انسانیت کے پروردگار! تکلیف کو دور کر دیجئے اور شفاء عطا

فرمایئے، کہ آپ ہی شفاء عطا فرما سکتے ہیں، ایسی شفاء جو کسی بیماری
کو نہ چھوڑے۔

حضرت عثمان بن ابوالعاصؓ سے مروی ہے، کہ مجھے اسلام قبول کرنے کے بعد سے جسم میں درد کا احساس رہتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ جہاں پر تکلیف ہو، وہاں ہاتھ رکھو، تین دفعہ بسم اللہ کہو، اور سات دفعہ پڑھو :

اعوذ بعزة الله و قدرته من شرما أجد وأحاذر . (مسلم، حدیث نمبر : ۲۲۰۲، باب استحباب وضع يده على موضع الألم مع الدعاء)

میں اللہ تعالیٰ کے غلبہ اور قدرت کی پناہ میں آتا ہوں، ان چیزوں کی
شر سے جس سے میں دوچار ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں۔

دوسری صورت پڑھ کر دَم کرنے اور پھونکنے کی، یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سونے کے وقت معمول مبارک تھا کہ سوتے وقت **قل هو الله احد ، قل اعوذ برب الفلق** اور **قل اعوذ برب الناس** پڑھ کر اپنے اوپر دَم فرماتے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۵۰۱۷، باب فضل المعوذات)

—— حضرت عائشہؓ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ جب گھر کے لوگوں میں کوئی بیمار پڑتا، تو اس پر بھی آپ معوذات یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھ کر دَم فرمایا کرتے، پھر جب آپ مرض وفات کی حالت میں تھے، تو حضرت عائشہؓ آپ پر دَم کیا کرتی تھیں، (مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۷۰) —— پھونکنے اور دَم کرنے کو حدیث میں رقیہ (راء پر پیش) سے تعبیر کیا گیا ہے، اور صراحتاً آپ سے اس کی اجازت ثابت ہے، حضرت عوف بن مالکؓ راوی ہیں کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کرتے تھے، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ مجھ پر پیش کرو، کہ اگر اس میں کوئی مشرکانہ بات نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، **لا بأس بالرقى مالم يكن فيه شرك** ، (مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۸۸) —— جب براہ راست جھاڑ پھونک کی اجازت ہے، تو اگر پانی پر دَم کیا جائے اور اسے مریض کو پلایا جائے، یا

تیل پر دَم کیا جائے اور اس سے جسم کی مالش کی جائے، تو یہ صورت بھی درست ہونی چاہئے۔

یہ صورت کہ کسی برتن پر قرآن مجید کی آیت یا دُعاء زعفران یا کسی اور شئی سے لکھی جائے اور اسے دھوکر پلایا جائے، ثابت ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک طویل دُعاء نقل کی ہے، جس کی ابتداء ''**بسم الله ، لاالٰه الا الله الحليم الكريم ، سبحان رب العرش العظيم ، الحمد لله رب العالمين**'' سے ہوتی ہے، کہ اس دُعاء کو صاف برتن میں لکھ کر اسے پلایا جائے، اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ناف سے متصل چھینٹیں ماری جائیں، اسی سے استدلال کرتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں :

> **ويجوز أن يكتب للمصاب وغيره من المرضى شيئا من كتاب الله و ذكره بالمداد المباح ويغسل ويسقىٰ .**
>
> (فتاویٰ ابن تیمیه :۱۹/۶۴)
>
> بیمار اور مبتلائے مصیبت شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب یا ذکر میں سے کچھ جائز روشنائی سے لکھنا، دھونا اور پلانا جائز ہے۔

البتہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے لکھا جائے وہ پاک ہو، اور جس چیز پر لکھا جائے وہ بھی پاک ہو، تاکہ قرآن مجید کی بے احترامی نہ ہو، کیوں کہ قرآن کی بے احترامی سخت گناہ ہے، بلکہ جانتے، بوجھتے ایسا کرنے میں کفر کا اندیشہ ہے، لہٰذا خون سے قرآنی آیات واذکار کو لکھنا جائز نہیں۔

عمل کی چوتھی صورت لکھا ہوا تعویذ ہے، لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تعویذ لکھ کر گلے میں لٹکانا، بازو یا کسی اور حصے میں باندھنا جائز نہیں، دوسری رائے اس کے جائز ہونے کی ہے، بشرطیکہ مشرکانہ کلمات سے خالی ہو، اور یہی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیاطین وغیرہ سے حفاظت کی دُعاء بتائی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اپنے بچوں کو یہ دُعاء باضابطہ یاد دلاتے تھے، اور جو اُن میں سے بڑے نہیں ہوئے تھے ان کے لئے دُعاء لکھ کر

ان کو پہنا دیتے تھے، ومن لم یدرک کتبها و علقها علیه ،(مصنف ابن ابی شیبہ:۸/۳۹) —— علامہ ابن ابی شیبہ نے مختلف تابعین سے نقل کیا ہے کہ وہ تعویذ لکھنے اور اسے پہنانے کے قائل تھے، مشہور محدث سعید بن مسیّب سے نقل کرتے ہیں، کہ اگر چمڑے پر لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں، عطاء، مجاہد، محمد بن سیرین، ضحاک بڑے پایہ کے تابعی علماء گذرے ہیں اور صحابہ کے صحبت یافتہ ہیں، ان سب سے لکھے ہوئے تعویذ کا جواز منقول ہے، حضرت عائشہؓ اور ائمہ مجتہدین میں سے امام احمد کی طرف بھی یہی بات منسوب کی گئی ہے،(دیکھئے:الموسوعة الفقهيه :۱۳/۳۳) —— علامہ ابن تیمیہ نے عورت کے دردزہ کے سلسلہ میں جو دُعاء لکھی اور دھو کر پلانے کی بات فرمائی ہے، اس میں کاغذ پر لکھنے اور عورت کے بازو میں باندھ دینے کا بھی ذکر آیا ہے، اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی لکھے ہوئے تعویذ کا جواز ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ (تمیمہ) لٹکانا شرک ہے، اور اسی کی وجہ سے ہمارے زمانہ کے بعض اہل علم اس کو مطلقاً منع کرتے ہیں، لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا منشاء اور تھا، اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ ایک یہودی کے پاس جھاڑ پھونک کے بارے میں جایا کرتی تھیں، اسی بابت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ تنبیہ فرمائی تھی، (دیکھئے:ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۸۸۳) —— اس لئے آپؓ کا منشاء غیر مسلموں کے پاس جھاڑ پھونک کرانے اور ان سے تعویذ لینے کی ممانعت کا تھا، کیوں کہ ان سے علاج کرانے میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ مشرکانہ کلمات کا استعمال کرتے ہوں، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جھاڑ پھونک کو بھی شرک قرار دیا، حالاں کہ پھونکنا اور دَم کرنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔

جھاڑ پھونک ہو، لکھ کر اور دھو کر پلانا ہو، یا لکھا ہوا تعویذ ہو، ہر صورت میں چند باتیں ضروری ہیں، جس کو حافظ ابن حجرؒ نے اس طرح لکھا ہے :

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تین شرطیں پائی جائیں تو جھاڑ

> پھونک جائز ہے، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو، یا اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا ذکر کیا جائے ، دوسرے عربی زبان میں ہو ، یا ایسی زبان میں جس کا معنی سمجھ میں آتا ہو، تیسرے اس بات کا یقین ہو کہ یہ جھاڑ پھونک بذات خود مفید و مؤثر نہیں ، اصل مؤثر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔(فتح الباری:۱۰/۱۹۵)

اللہ تعالیٰ کے کلام اور اسماء وصفات کی شرط اس لئے رکھی گئی ہے، کہ اللہ ہی سے مدد اور شفاء کا طلب گار رہو اور شرک کا شائبہ تک پیدا نہ ہو، عربی زبان میں ہونا اس کے مفہوم سے آگہی بھی اسی لئے ضروری ہے کہ کوئی مشرکانہ کلمہ شامل نہ ہو جائے ، تیسری شرط بھی اسی لئے ہے کہ انسان کا خدا پر یقین رہے ، گویا اصل یہی ہے کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ شرک سے خالی ہو، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا بأس بالرقی مالم یکن فیه شرک**، (مسلم، حدیث نمبر:۵۶۸۸) —— اسی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ غیر مسلموں کے پاس تعویذ اور عمل کے لئے نہیں جانا چاہئے ، کیوں کہ اس صورت میں مشرکانہ تعویذ اور جھاڑ پھونک میں مبتلا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت گذر چکی ہے کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کو اسی وجہ سے منع فرمایا تھا، ہاں، مسلمان عامل غیر مسلموں کا علاج کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ انسانی خدمت ہے، اور انسانی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے کی مدد کرنا واجب ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بھی ثابت ہے کہ مسلمانوں کے قافلہ نے ایک غیر مسلم سردارِ قبیلہ کا علاج کیا تھا۔(نیل الاوطار:۸/۲۱۵)

سب سے اہم مسئلہ عامل حضرات کے طرز عمل اور ان کے رویہ کا ہے، اس سلسلہ میں چند اُمور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے :

اول یہ کہ اجنبی عورتوں کے سلسلہ میں جو شرعی احکام ہیں، عاملین ان سے مستثنیٰ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے بہت شدت سے منع فرمایا ہے کہ مرد کی کسی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی ہو، اس لئے غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا جائز نہیں۔

دوسرے شریعت میں اس سے بھی زیادہ ممانعت غیر محرم کو ہاتھ لگانے کی ہے، کیوں کہ اس سے زیادہ فتنہ کا اندیشہ ہے، مادی طریقۂ علاج میں بعض دفعہ جسم کے کسی حصہ کو دیکھنے یا چھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، کیوں کہ جسمانی کیفیت ہی کے ذریعہ مرض کی تشخیص ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ روحانی طریقۂ علاج میں مرض کی تشخیص کے لئے اس کی ضرورت نہیں، اس لئے اس صورت کو ڈاکٹری معائنہ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، یہی حال غیر محرم کا چہرہ دیکھنے کا بھی ہے، کہ اگر جوان لڑکی یا خاتون ہو، تو چہرہ کا پردہ بھی ضروری ہے، عام طور پر عامل حضرات ان اُمور کے بارے میں احتیاط نہیں برتتے، نتیجۂ کار خود فتنہ سے دوچار ہوتے ہیں، دوسروں کو فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں، اور دین واہل دین کی رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔

تیسرے جھوٹ سے احتیاط بھی ضروری ہے، جب بھی کوئی شخص عملیات کی دنیا میں پہنچتا ہے، تو ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص یا تو جادو کا شکار ہے، یا اس پر جنات سوار ہے، گویا بیماریاں دنیا سے اٹھ چکی ہیں، پیسہ حاصل کرنے کی غرض سے خواہ مخواہ ہر شخص کو اس وہم میں مبتلا کردیا جاتا ہے کہ وہ مسحور یا آسیب زدہ ہے، یقیناً تمام عامل حضرات ایسا نہیں کرتے، لیکن ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے، یہ جھوٹ دھوکہ کو بھی شامل ہے، اس لئے گناہ بالائے گناہ ہے۔

چوتھی بہت ہی قابل توجہ چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے نہ کہ توڑنے کا، اور غیب کی باتوں سے اللہ ہی واقف ہیں، لیکن عام طور پر عامل حضرات اپنے زیر علاج لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ تم کو فلاں شخص نے جادو کردیا ہے، تم پر تمہارے سسرال والوں کی طرف سے سحر ہے، وغیرہ، اس طرح کی باتوں کی وجہ سے کئی خاندان بکھر گئے ہیں، والدین اور اولاد کے درمیان، ساس اور بہو اور بھائی اور بھائی کے درمیان خلیج حائل ہوگئی ہے، میاں بیوی کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہوچکی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ماں بیٹی کے تعلقات میں ایسا بگاڑ پیدا ہوگیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں، اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے کا حکم

دیا ہے، لیکن ایسی باتوں کے ذریعہ دل جڑنے کے بجائے ٹوٹتے ہیں۔

جادو ایک اَن دیکھی چیز ہے، انسان اس سلسلہ میں یقین نہیں کرسکتا کہ جادو کس نے کیا ہے؟ بعض دفعہ تو لوگ آنے والوں کی نفسیات کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر ساس بہو کے تعلقات کشیدہ ہیں، نند، بھاوج میں کھچاؤ ہے، یا بھائیوں میں کچھ اختلاف ہے، تو ان رشتہ داروں کی طرف نسبت کردی جاتی ہے، اور کشیدہ تعلقات کے پس منظر میں آدمی فوراً ان کا یقین بھی کرلیتا ہے، بعض عامل حضرات بقول ان کے جنوں سے اگلواتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ مجھے فلاں شخص نے بھیجا ہے، جن ایک ایسی مخلوق ہے، جو انسانوں کے وجود میں سما سکتی ہے، اس لئے یہ بات ممکن ہے کہ واقعی یہ بولنے والا جن ہی ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت انسان جن کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، وہ تو اس قدر جھوٹ بولتے ہیں، اور رائی کو پہاڑ بنانا جانتے ہیں، تو کیا کسی جن کی بات کی سچائی پر یقین کیا جاسکتا ہے؟

جادو کرنے کو حدیث میں شرک قرار دیا گیا ہے، گویا کسی کو جادوگر کہنا یا کس پر جادو کرانے کا الزام لگانا دراصل اس پر کفر یا ایک کفریہ کام میں شرکت کا الزام لگانا ہے، اور حدیث میں کسی مسلمان کو کافر کہنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے، اسی لئے فقہاء نے بھی کسی پر کفر کا حکم لگانے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنے کی تلقین کی ہے، لیکن بعض عامل حضرات کو کسی خاص شخص یا رشتہ دار کی طرف جادو کی نسبت کرنے میں کوئی احتیاط نہیں ہوتی، اختلاف پیدا ہوتا ہے، اور اختلاف میں شدت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک بعض دفعہ قتل وخون کی نوبت بھی آجاتی ہے، ـــــ عامل حضرات کو چاہئے کہ یا تو صرف مطلوبہ دُعاء بتادیں، تکلیف کے سبب کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہیں، یا اگر سحر یا آسیب بتائیں تو کسی کی نشاندھی سے گریز کریں، اور صاف کہہ دیں کہ اس کا علم اللہ کو ہے، ہم اس سلسلہ میں کوئی صحیح اور یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔

چھٹی قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ کو اختیار کرتے ہیں، ان کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے ان اعمال پر اور بعض دفعہ عمل کرنے والے ’’باباؤں‘‘

پر قائم ہوجاتا ہے ، اس سے لوگوں میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی پیدا ہوجاتی ہے ، بیماریوں کے لئے معالجین کے پاس جانے کے بجائے لوگ عاملین کے یہاں چکر لگاتے رہتے ہیں ، اور اگر مسلمان عاملین سے فائدہ نہیں ہوا، تو غیر مسلم عاملین تک پہنچتے ہیں ، ہر طرح کے مشرکانہ فعل پر آمادہ ہوجاتے ہیں، خواتین خاص طور پر اس میں آگے ہوتی ہیں، مال واسباب بھی ضائع کرتی ہیں، عزت وآبرو سے بھی ہاتھ دھوتی ہیں، اور اپنا ایمان بھی گنواتی ہیں، اس لئے عامل حضرات کو چاہئے کہ ان کا عمل قرآنی آیات ، ماثورہ دُعاؤں ، اسماء حسنیٰ اور احادیث میں منقول اذکار تک محدود رکھیں ، اور خاص کر لوگوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ شفاء اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوتا ہے، ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

ایک اہم مسئلہ تعویذ پر اجرت لینے کا بھی ہے، بنیادی طور پر جھاڑ پھونک اور تعویذ انسانی خدمت ہے، اور اس کو خدمت ہی کے پہلو سے انجام دینا چاہئے ،سلف صالحین کا یہی طریقہ رہا ہے، یہ تو مسئلہ کا اخلاقی پہلو ہے، —— لیکن فقہی اعتبار سے کیا تعویذ کی اجرت لی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے، اکثر اہل علم نے اس کو جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سواروں پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا، جن میں وہ بھی شامل تھے، یہ دستہ ایک عرب آبادی کے پاس سے گذرا، وہاں اس نے قیام کیا، اور مقامی لوگوں سے خواہش کی کہ ان کی ضیافت کریں، لوگوں نے انھیں مہمان بنانے سے انکار کردیا، اتفاق کہ سردار قبیلہ کو بچھو یا سانپ نے ڈس لیا، وہ لوگ ان حضرات کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ ہمارا سردار موت کے قریب ہے، کیا آپ میں سے کوئی شخص جھاڑ پھونک جاننے والا ہے؟ حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا، ہاں! لیکن ہم کچھ لے کر جھاڑیں گے، ان لوگوں نے تیس بکریوں کی پیش کش کی ، حضرت ابوسعید خدریؓ نے سات دفعہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر ان پر دَم فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اسے صحت یاب کیا۔

ان لوگوں نے حسب وعدہ بکریاں بھیج دیں، چوں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کا یہ مطالبہ اپنے اجتہاد پر مبنی تھا اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت نہیں تھی ، اس لئے

بعض حضرات نے اسے درست سمجھا اور کھانے میں شریک رہے، اور بعض نے کھانے سے انکار کردیا، جب یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے پورا واقعہ بیان کیا، اول تو آپ نے دریافت کیا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ سے مریض کو دَم کیا جاسکتا ہے؟ انھوں نے عرض کیا یہ بات میرے دل میں (من جانب اللہ) ڈالی گئی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھاؤ اور مجھے بھی کھلاؤ، مختلف محدثین نے اس روایت کو نقل کیا ہے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۶۳) —— اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تعویذ پر اُجرت لی جاسکتی ہے، اسی لئے اکثر فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

البتہ بعض فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، جن میں امام ابن شہاب زہریؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ قرآن مجید پر اُجرت حاصل کرنا ہے، (عمدۃ القاری: ۵/۶۴۷) —— اس لئے بہتر یہ ہے کہ عملیات کو مستقل ذریعۂ معاش نہ بنایا جائے، بلکہ دوسرے ذرائع معاش کو اختیار کرتے ہوئے گاہے تعویذ پر کچھ ہدیہ بھی لے لیں، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ پہلے زمانہ میں ہر جگہ قیام کے لئے ہوٹل اور سامان کے لئے بازار دستیاب نہیں ہوتے تھے، اور ریگستان کا سفر اتنا طویل ہوتا تھا کہ جو سامان لوگ ساتھ لے جاتے، وہ راستہ میں ختم ہوجاتا تھا، اس لئے مسافرین کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، اسی لئے یہ بات قبائلی روایت کے مطابق واجبی اخلاقیات میں شامل تھی، کہ مسافروں کو مہمان بنایا جائے، اسی اُصول کے تحت اہل مکہ حج وعمرہ کے لئے آنے والوں کی ضیافت کا اہتمام کیا کرتے تھے، پس اس عہد کے عرف کے اعتبار سے آبادی کے لوگوں کا ضیافت سے انکار کرنا دراصل ایک طرح کی حق تلفی تھی، ممکن ہے اس لئے حضرت ابوسعید خدریؓ نے اپنے عمل کا معاوضہ طلب فرمایا ہو، —— لہٰذا بہتر تو یہی ہے کہ اسے مستقل ذریعۂ معاش نہ بنایا جائے اور خدمت کے نقطۂ نظر سے انجام دیا جائے۔

اور اگر اُجرت لی ہی جائے تو ایسی اُجرت ہونی چاہئے، جس میں دھوکہ اور غبن فاحش نہ ہو، دھوکہ سے مراد یہ ہے کہ زیادہ اشیاء منگائی جائیں، کم خرچ کی جائیں، اور باقی واپس نہ کی

جائیں، یا جو چیز مطلوب نہیں ہو وہ بھی منگائی جائے، یا اس کے پیسے وصول کئے جائیں، —— غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ کسی عمل یا وقت کی اتنی اُجرت لی جائے، جو اس عمل اور وقت کی اُجرت سے بھی زائد ہو، مثال کے طور پر ایک شخص کی اُجرت ۶ رگھنٹوں کی دوسو روپئے سے تین سو روپئے تک ہوسکتی ہے، تو اس کی ایک گھنٹے کی اُجرت ساٹھ روپئے قرار پاتی ہے، اگر ساٹھ روپئے کے بجائے سو روپئے اِتنے وقت اور محنت کی اُجرت لی جائے تو غبن فاحش ہے، جسے مکروہ قرار دیا گیا ہے، اسی لئے اُجرت میں بھی توازن اور اُصول شرع کی رعایت ہونی چاہئے، ایسی شکایتیں سامنے آتی ہیں کہ بعض اوقات بیوہ عورتوں کو اپنے زیورات فروخت کردینے پڑے، اور بعض غریب و پریشان حال لوگوں کو آٹو اور رکشا سے بھی دست بردار ہوجانا پڑا، یہ ایک تکلیف دہ صورت حال ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، اور جس کام سے بھی وابستہ ہوں، ان کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کی حدود پر قائم رہیں، اور اس سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کریں، اس میں آخرت کی حفاظت بھی ہے، اور دنیا کی فلاح بھی، اور خاص کر جو لوگ ایسے کام کرتے ہوں، جن کا رشتہ دین سے جڑا ہوا ہو، ان کو اپنے کردار کے بارے میں بہت ہی محتاط رویہ اختیار کرنا چاہئے، کہ ان کی کوتاہیوں سے صرف انھیں کی نہیں؛ بلکہ دین اور اہل دین کی بدنامی بھی ہوتی ہے۔

۸-۱۵/اپریل ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

اسلام میں عورت کا حق میراث

شریعتِ اسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر ہے، عدل سے مراد ہے صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داریوں کی اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے حقوق کی تعیین، عدل کا تقاضہ کبھی مساوات اور برابری کا ہوتا ہے اور کبھی کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کا، اسلام کا قانون میراث بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اسلام سے پہلے مختلف مذاہب اور قوانین میں الگ الگ قانونِ میراث رہا ہے، عربوں کا فلسفہ یہ تھا کہ جو لوگ مقابلہ اور مدافعت کی طاقت رکھتے ہوں، صرف وہی میراث کے مستحق ہیں، اسی لئے وہ عورتوں اور بعض اوقات نابالغ بچوں کو بھی میراث سے محروم کر دیتے تھے، یہودیوں کے یہاں پوری میراث پر پہلوٹھے لڑکے کا قبضہ ہو جاتا تھا، ہندوؤں کے یہاں عورتیں میراث کی حقدار نہیں ہوتی تھیں، خود یورپ میں عورتوں کو انیسویں صدی میں حق میراث ملا ہے، اس سے پہلے وہ اس حق سے محروم تھیں۔

قرآن مجید میں میراث کے سلسلے میں تین باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی ہیں :

☆ پہلی بات یہ کہ کچھ قریبی رشتہ دار لازمی طور پر میراث کے حقدار ہوں گے، ان رشتہ داروں کو ''ذوی الفروض'' کہا جاتا ہے، ان میں مرد بھی ہیں اور اسی درجہ کی رشتہ دار عورتیں بھی، جیسے باپ اور ماں، بیٹا اور بیٹی، شوہر اور بیوی، یہ بات بھی اہم ہے کہ اصحابِ فروض میں عورتیں بہ مقابلہ مردوں کے زیادہ ہیں، عورتیں سترہ حالتوں میں اصحابِ فروض کی حیثیت سے وارث بنتی ہیں اور مرد صرف چھ حالتوں میں۔

☆ دوسرے: جس شخص سے ذمہ داریاں کم یا ختم ہو گئی ہوں، اس کا حصہ بہ مقابلہ اس رشتہ دار کے کم رکھا گیا ہے، جو ابھی ذمہ داریوں کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے، اور جس پر مستقبل میں اپنے متعلقین کے تئیں زیادہ ذمہ داریاں آنے والی ہوں، ان کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے، جیسے باپ کے مقابلے بیٹے کا حق زیادہ رکھا گیا؛ کیوں کہ جب باپ بیٹے سے وارث ہوتا

ہے تو عام طور پر وہ زندگی سے متعلق ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوتا ہے، یا سبکدوش ہونے کے قریب ہوتا ہے اور بیٹا جب اپنے باپ سے وارث ہوتا ہے تو عام طور پر وہ اس کی ذمہ داریوں کے شباب کا وقت ہوتا ہے اور اسے بہت سے مالی حقوق ادا کرنے ہوتے ہیں، یہی حال ماں اور بیٹی کا ہے۔

☆ تیسری بات یہ ہے کہ جس سے ذمہ داریاں کم متعلق ہوتی ہیں، ان کا حصہ کم ہے اور جن سے زیادہ ذمہ داریاں متعلق ہوں، ان کا حصہ بھی زیادہ ہوتا ہے، باپ کے ذمہ بال بچوں کی کفالت ہے، ماں کے ذمہ خود اپنی کفالت بھی نہیں ہے، بیٹے پر اپنی بیوی، اولاد اور والدین کی ذمہ داری ہے، بیٹی پر یہ ذمہ داریاں نہیں ہیں، اسی لئے باپ کا حصہ بمقابلہ ماں کے اور بیٹے کا حصہ بمقابلہ بیٹی کے دوہرا رکھا گیا ہے، یہ نہ جنس کی بنا پر تفریق ہے اور نہ ناانصافی ہے؛ بلکہ یہ ذمہ داریوں کے لحاظ سے حقوق کی تعیین ہے، یہ وہ اصول ہیں جن کی اساس پر شریعت نے قانونِ میراث مقرر کیا ہے۔

لیکن چوں کہ مردوں اور عورتوں کے تمام رشتوں میں ذمہ داریوں کا تناسب یکساں نہیں ہوتا، اس لئے بہت سی صورتوں میں ایک ہی درجہ کے رشتہ دار مردوں اور عورتوں کے درمیان حصۂ میراث میں ایک اور دو کا تناسب ملحوظ نہیں ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ شریعت میں ہمیشہ بمقابلہ مرد کے عورت کا حصہ نصف رکھا گیا ہے، یہ محض غلط فہمی اور ناآگہی ہے، اگر گہرائی سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو بہ آسانی تقسیمِ میراث کے سلسلے میں عورت کے حصہ کو لے کر جو آواز اٹھائی جاتی ہے اور پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اس کی تردید اور نفی ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میراث کے اعتبار سے ہم درجہ مرد و عورت اور رشتہ داروں کے سلسلہ میں چار صورتیں پائی جاتی ہیں :

(۱) وہ صورت جس میں عورت کا حق میراث بمقابلہ مرد کے نصف ہے۔

(۲) وہ صورت جس میں مرد اور عورت کا حصہ برابر ہے۔

(۳) وہ صورت جس میں مرد کا حصہ کم اور اسی درجہ کی رشتہ دار عورت کا حصہ زیادہ ہے۔

(۴) وہ صورتیں جس میں صرف عورت وارث ہوتی ہے، اسی درجہ کا مرد رشتہ دار وارث نہیں ہوتا۔

عورت کا حصہ نصف :

ان صورتوں میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ آدھا ہوتا ہے :

☆ باپ کے مقابلہ ماں کا، بشرطیکہ متوفی نے کوئی اولاد یا شوہر و بیوی کو نہ چھوڑا ہو۔

☆ حقیقی بھائی کے ساتھ حقیقی بہن یا علاتی بھائی کے ساتھ علاتی بہن کا۔

☆ زوجین میں سے ایک مر جائے اور دوسرے کو چھوڑ جائے، اس صورت میں بھی بیوی کے ترکہ میں سے جو شوہر کو ملے گا اس کے مقابلہ میں شوہر کے ترکہ میں بیوی کا حصہ نصف ہوگا، جیسے لاولد بیوی کے مرنے پر شوہر کو نصف ملے گا اور لاولد شوہر کے مرنے پر شوہر کے ترکہ سے بیوی کو چوتھائی، اسی طرح صاحبِ اولاد شوہر کے مال میں سے بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا، اور صاحبِ اولاد بیوی کے مال میں شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

دونوں کا حصہ برابر :

کچھ صورتوں میں ایک ہی درجہ کے مرد و عورت رشتہ دار کے حصے برابر ہوتے ہیں :

☆ میت کا ایک لڑکا ہو اور ماں باپ ہوں تو باپ کو بھی چھٹا حصہ ملے گا اور ماں کو بھی۔

☆ میت کی صرف دو بیٹیاں ہوں، اس صورت میں بھی بیٹیوں کو دو تہائی حصہ ملے گا، ماں اور باپ کو چھٹا ملے گا۔

☆ مرنے والی نے باپ، بیٹا اور نانی کو چھوڑا ہو تو باپ اور نانی دونوں کو چھٹا حصہ ملے گا؛ حالاں کہ نانی کا رشتہ بمقابلہ باپ کے دور کا ہے۔

☆ اخیافی یعنی ماں شریک بھائی اور بہنوں کا حصہ ہمیشہ برابر ہوتا ہے۔

☆ بعض صورتوں میں تنہا مرد رشتہ دار ہو یا عورت، پورے ترکہ کی حقدار ہوگی، جیسے کسی نے صرف باپ کو چھوڑا ہو تو عصبہ ہونے کی بنا پر باپ پورے ترکہ کا حقدار ہوگا، یا صرف ماں کو چھوڑا ہو تو ایک تہائی اس کا اصلی حصہ ہوگا اور دو تہائی بطور ''رد'' اسے ملے گا، یا صرف ایک بیٹا

چھوڑا ہوتو وہ عصبہ ہونے کی بنا پر پورے ترکہ کا حقدار ہوگا، اور اگر صرف ایک بیٹی چھوڑی ہوتو نصف اس کا اصل حصہ ہوگا اور باقی بطور ''رد'' اسے مل جائے گا۔

اس طرح کی متعدد صورتیں ہیں جن میں حقیقی بہن کا حقیقی بھائی کے ساتھ یا اخیافی بہن کا حقیقی بھائی کے ساتھ برابر کا حصہ ہوتا ہے۔

عورت کا حصہ زیادہ :

بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد سے بڑھ جاتا ہے؛ کیوں کہ بیٹی کا حصہ ذوی الفروض میں ہونے کی حیثیت سے بعض دفعہ نصف یا تہائی بھی ہوجاتا ہے، بیٹے کا حصہ اصحاب الفروض میں ہونے کی حیثیت سے نصف یا تہائی نہیں ہے، البتہ اصطلاحِ میراث کے اعتبار سے ''عصبہ'' میں ہونے کی حیثیت سے تقسیم حصص کے بعد بچا ہوا حصہ اسے مل جاتا ہے، یہ حصہ بعض اوقات عورت کے اس حصے سے کم ہوجاتا ہے، جو اسے 'اصحابِ فروض' میں ہونے کی حیثیت سے ملتا ہے، جیسے فرض کیجئے کہ ایک عورت نے اپنی وفات کے وقت ساٹھ ایکٹر زمین چھوڑی اور شوہر، والد، ماں اور دو بیٹیوں کو چھوڑا، تو ہر بیٹی کو سولہ (۱۶) ایکٹر زمین ملے گی، اور اگر اسی صورت میں دو بیٹیوں کے بجائے دو بیٹوں کو چھوڑا تو ہر بیٹے کا حصہ ساڑھے بارہ ایکٹر ہوگا، اسی طرح ایک عورت نے ترکہ میں ۱۱۵۶ ایکٹر اراضی چھوڑی اور اس کے ورثہ میں شوہر، والد، ماں اور بیٹی ہیں، تو بیٹی کا حصہ ۲۷۰/۱ ایکٹر ہوگا اور اسی صورت میں اگر بیٹی کے بجائے بیٹا ہے تو اس کا حصہ ۶۵/۱ ایکٹر ہوگا، چنانچہ اس طرح کی متعدد صورتیں ہیں جن میں مرد کے مقابلہ عورت کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔

صرف عورت وارث :

بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جس میں مرد کو حصہ نہیں ملتا ہے، لیکن اگر اسی کی ہم درجہ عورت رشتہ دار ہوتو وہ میراث میں حصہ پاتی ہے، جیسے کسی عورت نے پس ماندگان میں شوہر، باپ، ماں، بیٹی اور پوتی کو چھوڑا ہو، تو پوتی چھٹے حصے کی مستحق ہوتی ہے اور پوتی کے بجائے پوتا ہوتو اسے کوئی حصہ نہیں ملتا، اسی طرح مرنے والی عورت نے شوہر، حقیقی بہن اور علاتی بہن کو چھوڑا

ہے تو علاتی بہن چھٹے حصے کی حقدار ہوتی ہے، علاتی بہن کے بجائے علاتی بھائی ہو تو اسے کوئی حصہ نہیں ملتا ہے، اسی طرح بعض اوقات دادی وارث ہوتی ہے اور اجداد میں سے جو اس کے مقابل ہو وہ وارث نہیں ہوتا ہے۔

غرض کہ شریعت میں بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن میں بمقابلہ مرد کے عورت کا حصہ برابر یا زیادہ ہوتا ہے یا عورت حصہ دار ہوتی ہے اور مرد محروم ہوتا ہے، ڈاکٹر صلاح الدین سلطان مصری نژاد فاضل ہیں، جو جامعہ اسلامیہ امریکہ میں استاذ ہیں، انھوں نے اس موضوع پر ''میراث المرأة و قضیة المساواة'' کے عنوان سے قلم اٹھایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ تیس سے زیادہ حالتیں ایسی ہیں جن میں عورت مرد کے برابر یا اس سے زیادہ حصہ پاتی ہے یا وہ تنہا حصہ دار ہوتی ہے اور مرد محروم ہوتا ہے، جب کہ چار متعینہ حالتیں ہیں جن میں عورت کا حصہ بہ مقابلہ مرد کے آدھا ہوتا ہے، اگر اس پس منظر میں عورت کی میراث کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمجھنا کہ عورت کو مرد کے مقابلہ کم حصہ دیا جاتا ہے، محض غلط فہمی ہے، اور جن صورتوں میں عورت کا حصہ کم ہے، ان میں فرق محض فرائض اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے رکھا گیا ہے، بلکہ اس میں بھی عورتوں ہی کی رعایت ملحوظ ہے، کیوں کہ مرد پر سارے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ہے، عورت پر خود اپنی کفالت کی ذمہ داری بھی نہیں، اس لحاظ سے بظاہر عورت کا حصہ نصف سے بھی کم ہونا چاہئے، لیکن عورت کی فطری کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے اسے نصف کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ ۱۷/ جون ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

ایڈس — مرض اور علاج

۱۸، ۱۹؍ جون ۲۰۰۵ء کو بنگلور میں یونیسف کی طرف سے 'نیشنل ایڈس کنٹرول آرگنائزیشن' نئی دہلی، کے زیر انتظام ایک خصوصی بین مذہبی اجتماع رکھا گیا تھا، جس میں ماہرین کے علاوہ چالیس مذہبی فرقوں کے نمائندے شریک تھے، ہندوؤں میں سناتن دھرم کے علاوہ یہ آریہ سماجی، برھمو سماجی، برھما کماری اور متعدد فرقوں کے نمائندے موجود تھے، عیسائیوں میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس فرقوں کی نمائندگی کرنے والی شخصیتیں موجود تھیں، پارسی، جین، بدھسٹ، سکھ، بہائی اور کئی مذہبی فرقے کے لوگ بھی پروگرام میں شریک تھے، مسلمانوں کی نمائندگی نسبتاً کم تھی، اس حقیر کے علاوہ دو اور شخصیتیں یونیورسٹی کے حلقہ سے شریک تھیں، اس پروگرام کو ''انٹر فیتھ راؤنڈ ٹیبل'' کا نام دیا گیا تھا، اس اجتماع کا مقصد ایڈس اور ایچ آئی وی کی روک تھام کے سلسلہ میں غور کرنا تھا۔

ایڈس کی ابتدائی شکل ''Hiv'' مثبت کی ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کا پہلا کیس ۱۹۸۱ء میں امریکہ میں سامنے آیا، ہندوستان کی ریاست تمل ناڈو میں ۱۹۸۶ء میں پہلی بار ایک ایسا مریض دریافت ہوا جو ایچ آئی وی زدہ تھا اور اب ۲۰۰۵ء میں ہندوستان میں ایچ آئی وی سے متاثرہ مریضوں کی تعداد اکیاون لاکھ ہو چکی ہے اور ہندوستان میں اس بیماری کے بڑھنے کا جو تناسب ہے اس کے تحت ماہرین کو اندیشہ ہے کہ ہندوستان بتدریج دنیا کا سب سے زیادہ ایڈس سے متاثر ملک بن جائے گا اور شاید جنوبی افریقہ کو بھی پیچھے چھوڑ دے گا، یہ طب وصحت کے اعتبار سے کسی ایٹم بم سے کم نہیں ہے!

ایڈس کی ابتداء ''Hiv'' مثبت سے ہوتی ہے، یہ انفکشن کی ایک صورت ہے، اسی انفکشن کی آخری صورت ''Aids'' کی ہو جاتی ہے، ہندوستان میں جنوب کی چار ریاستیں تمل ناڈو، کرناٹک، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر اور شمال مشرق کی تین ریاستیں منی پور، میزورم اور ناگالینڈ

میں ایڈس کے کیس سب سے زیادہ پائے گئے ہیں، اوران علاقوں میں یہ بیماری تیزی سے اپنا پنجہ گاڑ رہی ہے، آندھراپردیش میں کرناٹک سے متصل سرحدی علاقے زیادہ متاثر ہیں۔

اس مرض کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب جنسی بے راہ رَوی ہے، ہم جنسی اور غیر قانونی تعلق اس بیماری کو جنم دیتا ہے، پھر اس بیماری کے پھیلنے میں مختلف دوسرے محرکات بھی کام کرتے ہیں، جن میں خون کی منتقلی، ایڈس زدہ عورت کا حاملہ ہونا اور جس سرنج سے ایسے مریض کو انجکشن دیا گیا ہو، اسی سرنج کو دوسرے مریض کے لئے بھی استعمال کرنا ہے۔

یہ بات پوری دنیا میں متفق علیہ ہے کہ ایڈس کا بنیادی سبب جنسی انحراف ہے، لیکن دنیا اس وقت عیش کوشی اور لذت چشی کے ایسے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے کہ وہ برائی کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہے، بلکہ برائی کو محفوظ طریقہ پر کرنا چاہتی ہے، حد یہ ہے کہ مذہبی شخصیتیں اور مذہب کے نمائندے بھی محفوظ سیکس کی باتیں کرنے لگے ہیں، اس میٹنگ میں سوامی اگنیش کا خطاب بہت اچھا رہا، اورانھوں نے افتتاحی سیشن کے خطاب میں اس پر زور دیا کہ مرد وعورت کو چاہیے کہ اپنے تعلق کو جائز قانونی حد تک محدود رکھیں، غیر قانونی تعلق سے بچیں، انھوں نے ملک میں بڑھتی ہوئی عریانیت کو بھی خطرناک قرار دیا اور کہا کہ یہ عورتوں کا استحصال ہے۔

میرے لئے بہت زیادہ باعثِ حیرت یہ بات تھی کہ متعدد عیسائی پادریوں نے اس سلسلہ میں بہت ہی نرم پہلو اختیار کیا، وہ گناہ اور گناہ گاری کی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہے تھے، بلکہ نام لئے بغیر اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بھی بنا رہے تھے، ایک فادر نے اپنے خطاب میں کہا کہ خدا تمام بندوں سے محبت کرتا ہے، اس لئے کسی بیماری کو خدا کا عذاب کہنا اور کسی شخص کو عذاب یافتہ قرار دینا درست نہیں، جب راقم الحروف کی باری آئی تو اس نے ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی، جس کا خلاصہ نقل کرنا مناسب ہوگا :

''جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو وجود بخشا ہے، اسی نے ہماری فطرت بھی بنائی ہے، اس لئے اگر ہم قانونِ فطرت سے بغاوت کریں گے، تو یقیناً ہمیں اس بغاوت

کی سزا بھگتنی ہوگی، اور نقصان اٹھانا پڑے گا، پانی بھی خدا نے بنایا ہے اور آگ بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، اب اگر کوئی شخص پانی سے نہانے کے بجائے اپنے اوپر آگ کے شعلے انڈیل لے، تو ظاہر ہے کہ وہ خود ہی اپنی موت کا سامان کر رہا ہے، اسی طرح انسان کے اندر ایک تقاضہ صنفی ضرورت کا رکھا گیا ہے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ یہ ضرورت ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی تعلق کے ذریعہ پوری کی جائے اور اس تعلق میں میاں بیوی ایک دوسرے کے وفادار رہ کر زندگی گذاریں، اب اگر اس تعلق کو مرد مرد سے اور عورت عورت سے پوری کرنے لگے یا ناجائز رشتے استوار کیے جائیں، ایک عورت کا تعلق ایک سے زیادہ مردوں سے ہو جائے تو یہی تعلق جو انسان کے لئے راحت وسکون کا ذریعہ ہے اور جس پر نسل انسانی کی بقا کا مدار ہے، اس کے لئے جان لیوا اور مہلک فعل ہو جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی گروہ میں زنا کی کثرت ہو جائے گی، تو ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی کہ ان کے آباء واجداد نے کبھی اس بیماری کے بارے میں خیال بھی نہ کیا ہوگا، واقعہ ہے کہ ایڈس اس کی واضح مثال ہے!

محبت کا تقاضہ یہ نہیں ہوتا کہ محبوب کے ہر فعل کو درست ٹھہرایا جائے، انسان کو اپنے بچہ سے محبت ہوتی ہے، اگر بچہ پھول کے بجائے آگ کو اپنے ہاتھ میں لے اور مٹھائی سمجھ کر زہر کھانے لگے تو کسی شفیق ماں باپ کو یہ بات گوارہ نہیں ہوسکتی کہ وہ آگ سے کھیلے اور زہر کھالے، پھر خدا جو سب سے زیادہ اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے، کیوں کر گوارہ کرسکتا ہے کہ اس کے بندے ایسے افعال کریں جو اس کی دنیا اور آخرت کو تباہ کر دینے والے ہوں، اسی لئے گناہ سے روکنا تقاضۂ محبت کے خلاف نہیں، بلکہ محبت کا عین تقاضا ہے۔

آج پوری دنیا میں یہ بات تسلیم کی جارہی ہے کہ غیر قانونی جنسی رشتہ اس خطرناک اور تباہ کن بیماری کا اصل سبب ہے، لیکن عجب بات ہے کہ لوگ برائی سے بچنے اور برائی سے بچنے کی دعوت دینے کے بجائے محفوظ طریقہ پر برائی کی بات کہتے ہیں اور اس کی دعوت دیتے ہیں، لذت کوشی نے انسان کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ وہ ایک فعل کی مضرتوں کو جانتے ہوئے بھی اسے

چھوڑنے کو تیار نہیں ہے، حالاں کہ ہماری دعوت یہ ہونی چاہیے کہ لوگ برائی سے بچیں، اس میں خدا کی رضا بھی ہے اور خود اس کی بھلائی اور حفاظت بھی۔

گناہ اور ثواب کا تصور ہر مذہب میں ہے اور مذہب آیا ہی اس لئے ہے کہ انسان کو زندگی گذارنے کا صحیح طریقہ بتائے، جیسے روشنی اور تاریکی ایک نہیں ہو سکتے، اسی طرح جو عمل خدا کے حکم کے مطابق ہو اور جو عمل خدا کے حکم کے خلاف ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتے، البتہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ گناہ سے نفرت ہو، گناہ گاروں سے نفرت نہیں ہو، اس کے تئیں ہمدردی کا اور اصلاح کا جذبہ ہو، اس لئے ایسے مریضوں کے بارے میں اسلام یہ نہیں کہتا کہ ان کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا جائے؛ بلکہ وہ سماج کی ہمدردی، مدد اور حسن سلوک کے مستحق ہیں، ان سے ایسی احتیاط ضرور برتی جائے کہ بیماری پھیلنے نہ پائے، اور خود مریض کے لئے بھی اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، لیکن اسے معاشرے سے کاٹ نہیں دیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے گناہ سے نفرت ضرور فرمائی ہے، لیکن گناہ گاروں کے لئے دعائیں کی ہیں، اور ان کے بارے میں محبت آمیز کلمات ارشاد فرمائے ہیں۔

ایڈس کے سلسلہ میں رپورٹوں کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیماری کے پھیلنے اور پھیلانے میں بیوہ خواتین کا بڑا حصہ رہا ہے؛ کیوں کہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے یہاں بیوہ کے نکاح کا تصور نہیں ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی عورت کم عمر میں بیوہ ہوگئی تو مرد اس کا استحصال کرتے ہیں، اور وہ اپنے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی امتحان بن جاتی ہے، اس لئے نکاحِ بیوگاں کو رواج دینا چاہیے، جیسا کہ اسلام نے ہدایت دی ہے''۔

راقم الحروف نے اس ہمہ مذہبی اجتماع میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا اور بعض تجاویز پیش کیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کے بعد جتنے مقررین آئے تقریباً سبھوں نے اس کے حوالہ سے گفتگو کی اور اسلامی نقطۂ نظر کو فطرت کی ترجمانی قرار دیا، اس حقیر کو تجاویز کمیٹی میں بھی شامل کیا گیا، جس میں جنسی تعلیم کا مسئلہ بھی سامنے آیا، اور بعض لوگوں نے کہا کہ اسلام اس سے منع کرتا ہے، راقم الحروف نے صاف طور پر عرض کیا کہ ضرورت جنسی تعلیم کی نہیں، اخلاقی تعلیم

کی ہے، جنسی تعلیم فائدہ سے زیادہ نقصان کا سبب بن رہی ہے، بلوغ سے پہلے ایسی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے ہائی اسکول سے پہلے تک اخلاقی تعلیم شامل نصاب ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ دسویں یا نویں جماعت میں بچوں کو یہ بات بتائی جانی چاہیے کہ جنسی انحراف سے انسان کیسی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے کیا نقصان اٹھانا پڑتا ہے؟ جنسی تعلیم کا یہ مقصد کہ بچوں کو کنڈوم کلچر کی طرف لے جایا جائے اور آج کی اصطلاح میں 'محفوظ سیکس' کا طریقہ بتایا جائے، ہرگز قابل قبول نہیں ہے، اور کم سے کم اس مذہبی اجتماع سے اس طرح کا میسیج نہیں جانا چاہیے؛ کیوں کہ زنا کی حرمت تمام مذاہب میں متفق علیہ مسئلہ ہے، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ انسانی رہنمائی کے لئے قرآن وحدیث میں بھی مرد وعورت کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن اس میں پوری طرح پردہ اور حیاء کی رعایت ہے، اور ہدایات اس انداز پر دی گئی ہیں، کہ اس سے اخلاقی انحراف کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی، بحمد اللہ تجویز کمٹی نے بڑی حد تک اس بات کو قبول کیا اور تجویز یہ منظور کی گئی کہ بچوں کو اخلاقی تعلیم دی جائے اور جو بچے بلوغ کی عمر کو پہنچیں انہیں طریقۂ زندگی کے بارے میں بتایا جائے۔

اس اہم قومی اجتماع میں جو بات ہم مسلمانوں کے لئے قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ مختلف مذاہب اور خاص کر عیسائی حضرات نے خدمتِ خلق، صحتِ عامہ اور انسدادِ ایڈس کے سلسلہ میں اپنے کاموں کا ذکر کیا، عیسائیوں کے تینوں فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈ یکس نے الگ الگ اپنی خدمات پیش کیں، صرف کیتھولک فرقہ کے ہاسپٹلس ملک بھر میں چھ ہزار سے زیادہ ہیں، ہیلتھ سنٹر اور کاؤنسلنگ سنٹر اس کے علاوہ ہیں، اسی کے قریب قریب پروٹسٹنٹ کی خدمات ہیں، ان دونوں سے کسی قدر کم آرتھوڈ یکس کی، ہندوؤں کے بھی مختلف مشن کام کر رہے ہیں، لیکن مسلمانوں کے پاس اس نقطۂ نظر سے پیش کرنے کے لئے اتنا کم ہے کہ گویا آٹے میں نمک۔

پھر عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے یہ ادارے ان کے مذہبی مشن سے جڑے ہوئے ہیں، اس لئے وہ ان اداروں کو اپنے مشن کی تبلیغ کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، تبلیغی نقطۂ

نظر سے بہت سے غریبوں کا مفت علاج بھی ہوا کرتا ہے، لیکن ہم مسلمانوں کے یہاں اگر شخصی طر پر کچھ ہاسپٹل قائم بھی ہیں، تو عام طور پر وہ تجارتی مقصد کے تحت ہیں، اس لئے تبلیغی روح سے خالی ہیں، ہمیں ایسی مجلسوں میں اسلامی تعلیمات کو تو پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرنے کا موقع ملتا ہے؛ کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے، اور اس نے انسانیت کی ہمہ جہت رہنمائی کی ہے، لیکن ہم مسلمان اپنی کی غفلت شعاریوں کی وجہ سے عملی میدان میں دوسری قوموں سے اس قدر پیچھے ہیں کہ مشترکہ مجلسوں میں ان کو پیش کرنا بے محل معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں کو بہ حیثیتِ خیر امت رفاہی کاموں پر توجہ کرنی چاہیے، کہ خدمتِ خلق ہمارے لئے ایک مذہبی فریضہ بھی ہے اور دعوتِ دین کا مؤثر وسیلہ بھی۔

علماء، ائمہ، مذہبی اور اصلاحی شخصیتوں کی ذمہ داری ہے کہ اس خطرناک مرض کی حقیقت سے اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرائیں، اور انہیں یہ بھی بتائیں کہ ایڈس صرف بدکاری سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ خون کی منتقلی وغیرہ کی وجہ سے بھی یہ بیماری لگتی ہے، اس لئے جو لوگ اس مرض کا شکار ہو گئے ہوں، ان کے بارے میں بدگمانی نہ ہونی چاہیے کہ لامحالہ وہ بداطواری میں مبتلا ہوئے ہوں گے۔

۱۶/ جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ ۲۴/ جون ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

حرام رشتے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مکلّف مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، ''مکلّف'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک ذمہ دار ہستی کا مالک ہے، اس کے لئے کچھ چیزیں حلال ہیں اور کچھ چیزیں حرام، یہ حلال وحرام کا قانون زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے، کھانا پینا ہو، لباس و پوشاک ہو، یا معاملات وکاروبار ہو، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ چیزوں کو روک کر انسان کو پابند اور اس کی آزادی کو محدود کر دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پابندی بھی انسان کے لئے خیر وصلاح ہی کا ذریعہ ہے، آپ کسی کو زہر کھانے اور آگ میں کودنے سے روک دیں تو یہ بھی ایک پابندی ہے، لیکن ہر سمجھدار آدمی اس بات سے واقف ہے کہ اس پابندی میں اس کی بھلائی اور حفاظت ہے۔

اسی طرح شریعت نے نکاح کے سلسلہ میں بھی حلال وحرام کا قانون رکھا ہے، کچھ رشتے حرام ہیں، اور ان کے علاوہ بقیہ تمام مردوں اور عورتوں کا شرعی اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے نکاح ہو سکتا ہے، بعض لوگ کسی چیز کو 'حرام' کہنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ چیز نفرت انگیز ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، عربی قواعد کے لحاظ سے حرام کا مادّہ ''ح، ر، م'' ہے، جس کے معنی روکنے ہیں، حرم شریف کو اسی لئے حرم کہتے ہیں کہ شکار وغیرہ جو حدودِ حرم کے باہر جائز ہے، حدودِ حرم کے اندر جائز نہیں، قرآن مجید نے چند مہینوں کو حرام قرار دیا ہے، وہ بھی اسی لئے کہ اس میں جنگ ممنوع ہے، بعض دفعہ کسی شئ یا شخص کے ادب میں کسی فعل سے روک دیا جاتا ہے، اسی لئے اس لفظ میں احترام کا پہلو بھی ہے، اور اسی مناسبت سے دنیا کی سب سے افضل مسجد ''مسجدِ حرام'' کہلائی۔

حرام رشتوں یا فقہ کی اصطلاح میں محرم ہونے کی اساس بھی یہی ہے کہ یہ رشتے قابل احترام ہیں، ان رشتوں میں تقدس اور پاکیزگی ہے، اور ان رشتوں کے ساتھ نکاح کے تعلق کی

ممانعت ہے،غور کیا جائے تو کچھ رشتوں کوحرام قرار دیے جانے میں بڑی حکمت و مصلحت ہے، اوراس سلسلہ میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں:

رشتوں کی حرمت شک وشبہ اور بدگمانی کو دور کرتی ہے،اور برائی کے خیال سے بھی لوگوں کو بچاتی ہے، بیٹیوں کو نکاح تک باپ کی پرورش میں رہنا ہے،اسی گھر میں دادا، نانا، چچا اور بھائی بھی ہوتے ہیں، ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ رہنا ہوتا ہے،حرمت کی یہ دیوار ان رشتوں کو پامال ہونے سے بچاتی ہے،خود ان رشتہ داروں کے لئے اس تعلق کا تصور بھی گراں خاطر ہوتا ہے، دوسرے اس ماحول سے نکل کر جب لڑکی اپنے شوہر کے یہاں جاتی ہے تو اس کا دل بھی شکوک وشبہات کے کانٹوں سے محفوظ رہتا ہے، حالاں کہ اگر اسی لڑکی نے غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان زندگی گذاری ہوتو بعض مرتبہ بدگمانیاں جنم لیتی ہیں۔

سائنسی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قریب ترین رشتہ دار مرد وعورت کو جنسی ارتباط پیدا ہونے والی نسل کے لئے نہایت ہی مضر اور نقصاندہ ہے، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ پیدا ہونے والا بچہ ذہنی طور پر معذور ہو، یا کسی اور پہلو سے پیدائشی نقص کا شکار ہو۔

بعض رشتوں کی حرمت اس لئے ہے کہ کہیں محبت کے رشتے بغض وعناد کے تعلق میں تبدیل نہ ہو جائیں، دو بہنوں، خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی میں کس قدر رانس ہوتا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، اگر ان دو قریبی رشتہ مندوں کو ایک مرد اپنے نکاح میں لے آئے تو یقینی طور پر یہ محبت رقابت میں اور جذبۂ ایثار ووفا آتش بغض و جفا میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس لئے کچھ رشتوں کا حرام ہونا انسانی فطرت اور سماجی مصلحت کے عین موافق ہے، کیوں کہ انسان کے خالق و مالک سے بڑھ کر اس کے مصالح ، جذبات اور فطرت کے مطالبات سے کوئی اور ہستی واقف نہیں ہوسکتی۔

شریعتِ اسلامی میں نکاح کی حرمت دو طرح کی رکھی گئی ہے: ہمیشہ کی حرمت ، جسے ’’حرمت مؤبدہ‘‘ کہتے ہیں،اور عارضی حرمت جسے ’’حرمت مؤقتہ‘‘ یا ’’حرمت بالسبب‘‘ کہا جاتا ہے، ہمیشہ کی حرمت تین اسباب سے پیدا ہوتی ہے: نسبی رشتہ، دودھ کا رشتہ اور اور نسبتی

رشتہ، جسے ’’حرمت مصاہرت‘‘ کہتے ہیں۔

نسبی رشتہ کے تحت سات قرابتیں آتی ہیں :

(۱) امہات (مائیں): اس میں ماں، دادی، نانی اور ان کا پورا بالائی سلسلہ شامل ہے۔

(۲) بنات (بیٹیاں): اس میں بیٹی، پوتی، نواسی اور ان کا پورا زیریں سلسلہ داخل ہے۔

(۳) بہنیں: ماں باپ شریک ہوں یا صرف باپ یا ماں شریک۔

(۴) پھوپھیاں، (۵) خالائیں، (۶) بھتیجیاں، (۷) اور بھانجیاں، ان تمام نسبی محارم کا ذکر خود قرآن مجید میں صراحتاً موجود ہے۔ (النساء:۲۳)

پس جیسا کہ ذکر کیا گیا بیٹی اور بھتیجی ہی کی طرح بھانجی سے بھی نکاح حرام ہے، ہندو مذہب میں ماموں اور بھانجی کے نکاح کو رَوا رکھا گیا ہے، بدقسمتی کی بات ہے کہ احکامِ شریعت سے ناآگہی اور ہندو معاشرہ سے تاثر کی وجہ سے بعض اوقات دیہات وقریہ جات میں مسلمانوں کے یہاں بھی ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں، اس لئے ایسے علاقوں میں اس مسئلہ کو اچھی طرح واضح کرنا چاہیے کہ ماموں بھانجی کا نکاح قطعاً حرام ہے، اور اگر عقد ہو بھی گیا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، مسئلہ معلوم ہونے کے بعد ایک دوسرے سے فوراً علاحدہ ہو جانا چاہیے۔

دوسری قسم دودھ کی بناء پر حرام ہونے والے رشتوں کی ہے، اصولی طور پر جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں، وہ رشتے دودھ کی وجہ سے بھی حرام ہوتے ہیں، البتہ اس سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں، جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ جس کا جھوٹا دودھ پیا ہے صرف اسی سے حرمت پیدا ہوتی ہے، یہ درست نہیں ہے، دودھ پینے والے یا پینے والی پر دودھ پلانے والی کی تمام اولاد حرام ہے۔

تیسرے حرمت کی وہ صورت ہے جسے ’’حرمتِ مصاہرت‘‘ کہا جاتا ہے، یعنی بیویوں کی ماں اور اس کی دادی ونانی کا بالائی سلسلہ (النساء:۲۳) بیوی کی اولاد بہ شرطیکہ اس بیوی کے ساتھ تعلق قائم کر چکا ہو، (النساء:۲۳) اولاد کی بیویاں، خواہ بیٹے کی ہوں، پوتے کی، نواسے کی یا اس سے نیچے کے رشتہ داروں کی، (النساء:۵) باپ، دادا، نانا کی بیویاں، یعنی سوتیلی ماں، سوتیلی

دادی، سوتیلی نانی (النساء:۲۲)، ان تمام رشتوں کا حرام ہونا فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

حرمتِ مصاہرت کے سلسلہ میں تین باتیں خاص طور پر اہم ہیں اور اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اوّل یہ کہ حرمتِ مصاہرت احناف، حنابلہ اور بہت سے فقہاء کے نزدیک زنا سے بھی ثابت ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے کسی عورت کے ساتھ برائی کر لی، تو اس عورت کی ماں اور اولاد اس مرد پر اور اس مرد کا باپ، دادا اس عورت پر حرام ہوں گے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو، تمہارے لئے ان سے نکاح جائز نہیں، (النساء:۲۳) اور نکاح کے اصل لغوی معنی صحبت کرنے کے ہیں، یہ جائز و ناجائز دونوں طریقوں پر صحبت کو شامل ہے، حضرت عمران بن حصین ﷜ سے مروی ہے کہ جس نے اپنی بیوی کی ماں کے ساتھ بدکاری کی اس پر اس کی بیوی اور خوش دامن دونوں ہی حرام ہو جائیں گی؛ اس لئے حرمتِ مصاہرت جیسے جائز طریقہ پر نکاح کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اسی طرح زنا سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حرمتِ مصاہرت زنا کی ان حرکتوں سے بھی ثابت ہو جاتی ہے، جسے شوہر اپنی بیوی سے کر سکتا ہے، جیسے بوس و کنار کرنا، شہوت سے کے ساتھ کسی کپڑے کے بغیر عورت کے جسم کے کسی بھی حصہ کو ہاتھ لگانا، شہوت کے ساتھ کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے کسی عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھا، اس کے لئے اس عورت کی ماں اور بیٹی حرام ہوگئی، (سنن دار قطنی:۳/ ۲۶۹، کتاب النکاح) بعض روایتوں میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت بھیجی ہے، (حوالۂ سابق) اور شہوت سے مراد یہ ہے کہ یا تو اس کی وجہ سے اس کی جسمانی کیفیت میں تغیر آئے یا قلب میں ہیجان پیدا ہو۔ (بدائع الصنائع:۲/ ۵۳۵)

تیسری بات یہ ہے کہ نسبی حرمت اور ڈھائی سال کی مدت گذرنے کے بعد دودھ والی حرمت، نکاح کے بعد پیدا نہیں ہوتی، لیکن حرمتِ مصاہرت نکاح کے وجود میں آنے کے بعد بھی پیدا ہو سکتی ہے، اور ایسی صورت میں وہ نکاح آپ سے آپ ختم ہو جائے گا؛ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی بیٹی یا ساس سے بدکاری کا مرتکب ہو تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اسی

طرح اگر کوئی شخص اپنی بہو یا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ ایسی حرکت کا ارتکاب کرے تو بہو اس کے بیٹے کے نکاح سے اور ماں اس کے باپ کے نکاح سے نکل جائے گی، اس لئے حرمتِ مصاہرت کا مسئلہ بڑا نازک ہے، اور عام مسلمانوں کو اس کے بارے میں اچھی طرح سمجھانے اور علماء، واعظین اور ائمہ کو مسئلہ کی نوعیت کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ سماجی برائیوں کے غلبہ اور مغربی تہذیب کی یلغار کی وجہ سے اب اس طرح کے واقعات نسبتاً زیادہ پیش آنے لگے ہیں۔

عارضی حرمت کے مختلف اسباب ہیں: ایک بہن کی موجودگی میں دوسری بہن، خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی میں سے ایک کی موجودگی میں دوسرے سے نکاح کرنا جائز نہیں، اور اگر عقد پڑھا بھی دیا جائے تو نکاح نہیں ہوتا، آج کل بعض واقعات سالی سے نکاح کے پیش آتے ہیں، یہ قطعاً حرام ہے، اور بعد میں کیا جانے والا نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا، اور اس سے تعلق رکھنا گناہ ہے، ہاں، اگر ایک کی موت ہو جائے یا طلاق ہو جائے تو دوسری سے نکاح درست ہے۔

اسی طرح جو عورت مسلمان نہ ہو اور یہودی اور عیسائی بھی نہ ہو جب تک وہ اسلام قبول نہ کرلے، نکاح منعقد نہیں ہوگا، یہی حکم غیر مسلم مرد کا ہے، یہودی اور عیسائی عورت اگر صحیح معنوں میں اپنے مذہب پر قائم ہو اور پاکدامن ہو تو اس سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، لیکن وہ بھی کراہت سے خالی نہیں، آج کل عام طور پر وہ اپنے اصل مذہب پر قائم نہیں ہیں، اور یہودی اور عیسائی معاشرہ میں عفت و پاکدامنی کا تصور بھی مٹتا جارہا ہے؛ اس لئے مسلمانوں کا ان سے نکاح کرنا بظاہر درست نہیں۔

اسی طرح جو عورت دوسرے شخص کے نکاح میں ہو، یا طلاق یا وفات کی عدت میں ہو، اس سے بھی اس وقت تک نکاح درست نہیں ہے جب تک کہ پہلا شخص اسے طلاق نہ دے دے، یا قاضیٔ شریعت اس کا نکاح فسخ نہ کردے اور عدت گذارنے والی کی عدت گذر نہ جائے، آج کل اس میں بھی بے احتیاطی ہوتی ہے، بعض اوقات اگر شوہر ضروریات پوری نہ کرتا ہو یا کچھ عرصہ سے غائب ہو تو بغیر طلاق حاصل کیے یا نکاح فسخ کرائے لوگ اس کا نکاح کردیتے

ہیں، یہ قطعاً درست نہیں، ایسے غافل اور حق شناس مرد کے خلاف دار القضاء سے رجوع کرنا چاہیے، اور قاضی کی طرف سے نکاح فسخ کیے جانے کے بعد ہی اس کا دوسرا نکاح کرنا چاہیے۔

اگر بیوی کو تین طلاق دے دی تو اس صورت میں وہ عورت اس پر حرام ہے، بہ حالتِ موجودہ وہ اس سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا، ہاں، اگر اس عورت کا دوسرا نکاح ہوا اور اتفاق سے اس نے بھی طلاق دے دی، نیز وہ اس عورت سے صحبت بھی کر چکا تھا تو سابق شوہر سے دوبارہ اس کا نکاح ہوسکتا ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ جہالت، احکامِ شریعت سے ناواقفیت، بے حیائی اور خدا ناترسی کی وجہ سے اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ بہت سے مسلمان نکاح جیسے اہم مسئلے میں بھی حلال وحرام سے واقف نہیں ہیں، یا ہوس کا شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پھاند جاتے ہیں، ان حالات میں ائمہ وخطباء اور علماء وواعظین کا فریضہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو شریعت کے ان احکام سے اچھی طرح آگاہ کریں، اور انہیں اس کی اہمیت ونزاکت سمجھائیں۔

۱۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ ۲۲/ جولائی ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

انسانی دودھ کی اہمیت اور اس کی خرید وفروخت

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جس صفت کا بار بار ذکر کیا ہے اور جس کو بہت ہی اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہاں تک کہ قرآن کی پہلی سورت کی پہلی آیت میں اسی خاص صفت کا ذکر آیا ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، ربوبیت کے معنی ہیں کسی شئی کی صلاحیت، ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے اس کی پرورش کرنا، اسی شانِ ربوبیت کا ایک حصہ مخلوقاتِ عالم کے لیے رزق کی فراہمی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر جتنی بھی چلنے والی چیزیں ہیں، ان کی رزق اللہ تعالیٰ پر ہے" وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا "(ہود:۶) چنانچہ طاقتور اور عظیم الجثہ شیر اور ہاتھی سے لے کر حقیر جسامت والی چیزیں چیونٹی اور مچھر تک کی روزی کا سامان اللہ کی طرف سے اس شان سے ہوتا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف اسی ایک صفت پر غور کرے تو ایمان وہدایت سے محروم نہ رہے!

انسان چوں کہ تمام مخلوقات میں اشرف اور کائنات کا خلاصہ ہے، اس لیے اس کے لیے صاف ستھری، خوش ذائقہ اور زیادہ موزوں ولذیذ رزق کا انتظام کیا گیا ہے، ہاتھی اتنے بڑے ڈیل ڈول کا جانور ہے، لیکن اسے گھاس پھوس پر قناعت کرنی پڑتی ہے، یہ حضرت انسان ہیں، کہ ان کے لئے ایک سے ایک پکوان ہیں، گوشت بھی اور سبزی بھی، نمکین غذائیں بھی ہیں میٹھی بھی اور کھٹی بھی، ہر ایک کی اپنی اپنی لذت ہے، اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور کام ودہن کی لذت کے لئے ایک سے ایک قسمیں موجود ہیں۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو شاید وہ تمام جانوروں میں زیادہ نازک اور کمزور ہوتا ہے، اس میں ہضم کی قوت بھی اتنی کم ہوتی ہے کہ ٹھوس ہی نہیں سیال غذا بھی اس کے لیے مہلک اور قاتل ثابت ہوسکتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا ایک مظہر یہ ہے کہ جوں ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، ماں کے سینہ میں اس کی غذا رکھ دی جاتی ہے، گائے، بھینس تو گھاس پھوس کھا کر

انسان کے لیے صاف وشفاف، صحت افزاء اور فرحت بخش غذا فراہم کرتی ہے، لیکن ماں کے دودھ کا حال یہ ہے کہ جسم کا وہ فاسد خون جو رحم کے ذریعہ باہر آتا ہے، وہی ناپاک اور گندا خون ماں کے سینہ میں صاف وشفاف پاک اور صحت مند دودھ کا چشمہ بن کر ابلتا ہے، یہ بچہ کی ایسی غذا ہے جسے قدرت کے ہاتھوں نے انسانی کاریگری کے کسی واسطہ کے بغیر بنایا ہے، اس لیے یہ سر تا پا نافع ہے۔

طبّی ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچہ کے لیے دو سال کی عمر تک ماں کے دودھ سے زیادہ محفوظ و مامون، صحت بخش اور زود ہضم کوئی اور غذا نہیں، ماں کے دودھ سے انسان کے پانچوں حواس یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور محسوس کرنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، تجربہ کیا گیا ہے کہ ماں کا دودھ پینے والے بچے نسبتاً زیادہ ذہین اور ہوشمند ہوتے ہیں، اور اس کا اثر ان کی عمر بھر کی زندگی پر پڑتا ہے، اس لیے قرآن مجید نے تاکید کی ہے کہ ماؤں کو چاہئے کہ پورے دو سال بچوں کو دودھ پلائیں، وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (البقرہ:۲۳۳) یا بچوں کا ماں پر اخلاقی حق ہے کہ اسے دودھ پلائے، اس لیے کم سے کم اس کے مستحب اور مطلوب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ مفسرین نے قرآن کی اس آیت میں دیئے جانے والے حکم کو 'امر استحبابی' قرار دیا ہے۔(دیکھئے: تفسیر کبیر:۴۱۳)

پھر قدرت نے خود دودھ پلانے کے لیے جو نظام مقرر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ براہِ راست ماں کے سینہ سے بچہ دودھ پیئے، یہ نہ صرف فطرت کی آواز ہے، اور انسانی رہنمائی وہدایت ہے، بلکہ سائنسی اعتبار سے بھی بچہ اور اس کی ماں کے لیے نہایت فائدہ بخش ہے، چھاتی سے دودھ پینے کی وجہ سے نومولود اسہال اور نمونیا جیسی بیماری سے محفوظ رہتا ہے، اس میں سیکھنے اور تجربہ کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور خود ماں کی صحت کے لیے یہ صورت بہت ہی مفید ہے، اطباء کی رائے ہے کہ اس سے زچہ کے مدافعتی نظام میں تقویت حاصل ہوتی ہے، چھاتی، رحم اور بیضہ دان کے کینسر سے حفاظت میں مدد ملتی ہے، حمل کے دوران بڑھ جانے والا وزن کم ہوتا ہے، جسم میں توازن پیدا ہوتا ہے، اور دودھ پلانے والی خواتین خون کی کمی کی بیماری سے کم دوچار ہوتی

ہیں اور دو بچوں کے درمیان مناسب فصل بھی قائم رہتا ہے۔

خدا نے عورت کے اندر اپنی اولاد کی محبت اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا ایسا وافر جذبہ رکھا ہے کہ وہ اپنے بچہ کے لیے بڑی سے بڑی مشقت کو اس طرح انگیز کرتی ہے، کہ گویا یہ اس کے لیے باعثِ کلفت نہیں ؛ بلکہ سامانِ راحت ہے، لیکن مغرب نے عورت کے اندر اپنے حسن کا جادو جگانے اور شمع خانہ کے بجائے شمع محفل بننے کا ایسا صور پھونک دیا ہے کہ ماں کی ممتا بھی اس کے سامنے سپر انداز ہو جاتی ہے، چنانچہ آج کل بچوں کو دودھ نہ پلانا بھی ایک فیشن ہو گیا ہے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ عورتوں میں سینہ اور رحم کا کینسر تیزی سے بڑھ رہا ہے، بظاہر اسے خواتین اپنے حسن و شباب کے بچاؤ کے لیے کرتی ہیں، لیکن حقیقتاً یہ ان کی زندگی ہی کے لیے ہلاکت کا پیغام ہے، اس لیے ماؤں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ بچوں کو اپنے سینہ سے دودھ پلائیں، یہ شریعت کی ہدایت ہے، فطرت کی آواز ہے اور خود عورت اور اس کے بچہ کی صحت کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

جب آدمی ایک دفعہ قانونِ فطرت کی حدوں کو توڑتا ہے تو پھر یکے بعد دیگرے غلطیوں کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے، چنانچہ بچوں کو دودھ نہ پلانے کے رجحان سے صرف ماں اور بچوں کی صحت ہی پر اثر نہیں پڑا، بلکہ اب ماں کی حرمت اور تقدس بھی خطرہ میں ہے، پچھلے دنوں اخبارات میں خبر آئی ہے کہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی نے اپنے دودھ کا عطیہ دینے والی خواتین کا دودھ جمع کرنے اور اسے تجارتی پیمانہ پر فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ انسانی دودھ بند ڈبہ میں فروخت ہوگا اور ہر ایک کو دستیاب ہو سکے گا، گویا اب انسان بھی جانوروں کی سطح پر آ گیا ہے، جیسے گائے اور بکری کے دودھ فروخت کیے جاتے تھے، اسی طرح اب انسان کے دودھ بھی فروخت ہوں گے، غور کیجئے کیا یہ انسانی حرمت اور تقدس کے خلاف نہیں؟

ماں کا دودھ چوں کہ انسان کے ذریعہ حاصل ہونے والی غذا ہے اور اس کی خاص اہمیت ہے، اس لیے دودھ سے کئی شرعی احکام متعلق ہیں، جس کی بنیاد یہ ہے کہ دودھ پینے والا بچہ اور دودھ پلانے والی عورت ایک دوسرے کے لیے محرم ہو جاتے ہیں، پھر یہ حرمت صرف پینے

والے اور پلانے والے پر محدود نہیں رہتی ، بلکہ دونوں طرف بہت سے قرابت داروں تک حرمت کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے،اس سلسلہ میں رسول اللہ ا کا یہ ارشاد اصولی حیثیت کا حامل ہے، کہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوجاتے ہیں وہ رضاعت یعنی دودھ کی وجہ سے بھی حرام ہوجاتے ہیں''یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ''(نسائی:۳۳۰۴)بعض رشتے اس سے مستثنیٰ ہیں،جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

پھر یہ دودھ کی وجہ سے پیدا ہونے والی حرمت کئی باتوں کو شامل ہے : جو لوگ ایک دوسرے کے محرم ہوں،ان کے لیے ایک دوسرے سے نکاح کرنا درست نہیں ہوگا،ان کے لیے ایک دوسرے سے پردہ کے احکام میں خصوصی رعایت ہوگی اور جن اعضاء کا اپنے باپ بیٹے کے سامنے کھولنا جائز ہے ان محرم رشتہ داروں کے سامنے بھی کھولنا جائز ہوگا ، اسی طرح اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتو وہ مرد وعورت ایک دوسرے کے ساتھ طویل سفر کرنے کے مجاز ہوں گے،اب اگر انسانی دودھ کا ڈیری فارم بن جائے اور پوری دنیا میں اس طرح دودھ سپلائی کیا جائے تو دودھ پینے والے اور پلانے والی کی شناخت کس طرح باقی رہ سکے گی؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کئی عورتوں کا دودھ مخلوط ہوجائے تو چاہے کسی کا دودھ غالب ہو اور کسی کا مغلوب،مقدار کی کثرت اور قلت کا اعتبار نہ ہوگا ، بلکہ یکساں طور پر ان تمام عورتوں سے حرمت متعلق ہوگی،اس لیے انسانی احترام اور دوسری جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے حنفیہ نے عورت کے دودھ کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے''لم یجز بیع لبن المرأة لأنه جزء الآدمي و هو بجميع أجزائه مكرم عن الإبتذال بالبيع''۔(البحرالرائق:۶/۸۱)

غور کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ غذا کا انسانی جسم ہی پر اثر نہیں پڑتا ، بلکہ اس کے اخلاق و اطوار پر بھی اس کا اثر مرتب ہوتا ہے،اسی لیے اہل علم نے فاسق و فاجر عورتوں کے دودھ پلانے کو پسند نہیں کیا ہے،اور مالکیہ نے تو یہودی اور عیسائی عورتوں کے دودھ پلانے کو مکروہ کہا ہے،چنانچہ علامہ ابن رشد مالکی فرماتے ہیں:''و تکره ظؤرة مثل اليهوديات و النصرانيات''۔(مقدمات ابن رشد:۲/۷۱)

پھر یہ کہ اگر سماج میں انسانی دودھ کی خرید وفروخت مروّج ہو جائے ، تو یہ عورتوں کے جبر و استحصال کا سبب بھی بن سکتا ہے، ایسا ممکن ہے کہ لالچی شوہر اور اس کے خاندان کے لوگ عورتوں کو ایسے انجکشن لگائیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ دودھ ہو، اور ظاہر ہے کہ غیر فطری طریقہ پر کسی چیز کا حاصل کرنا انسان کے لیے مضر اور نقصاندہ ہوتا ہے، جانوروں کے معاملہ میں یہی تحقیق ہے کہ جانور پر بھی اور دودھ پر بھی اس کا منفی اثر ظاہر ہوا ہے، اس لیے جب شوہر عورت کو ملازمت پر مجبور کر کے اس کی تنخواہ ہضم کر سکتا ہے، اس کو ماڈل اور ڈانسر بنا کر خبیث کمائی سے اپنے عشرت کدہ کو سجا سکتا ہے، تو اگر انسانی دودھ کی تجارت ہونے لگے تو یہ چنداں باعثِ تعجب نہیں، کیوں کہ یہ کام تو ہر عورت سے لیا جا سکتا ہے، اس کے لیے تعلیم اور کسی ڈگری کی بھی ضرورت نہیں، اس لیے حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی کوششوں پر پوری قوت سے روک لگانے اور انسان اور جانور کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کی کوشش کرے!!

۶/ رجب المرجب ۱۴۲۶ھ ۱۲/ اگست ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

دارالقضاء — ایک اہم سماجی ضرورت

دارالقضاء کے سلسلہ میں سپریم کورٹ میں مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے جناب مدن کی درخواست نے مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور اُلجھایا ہے اور اس سے مستقبل میں مسلم سماج کی مشکلات میں اضافہ ہوسکتا ہے، دارالقضاء کا نظام کئی وجوہ سے مسلم معاشرہ کے لئے بہت ہی افادیت کا حامل ہے اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ عدالتوں میں جو مقدمات جاتے ہیں، ان میں صلح اور مفاہمت کی کوشش نہیں کی جاتی ہے، عدالتیں ضابطہ کے مطابق مقدمات سنتی ہیں اور فیصلہ کرتی ہیں، وکلاء کو فریقین کے درمیان صلح کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، اس لئے کہ مقدمہ کی کاروائی جتنی دراز ہوتی ہے، ان کی فیس اور محنتانہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اس لئے معاشی نقطۂ نظر سے باہمی مصالحت اور مقدمہ کی یکسوئی ان کے لئے چنداں مفید نہیں ہوتی، ہمارے سماج میں بھی ایسی سوچ نہیں پائی جاتی کہ اپنے محلّہ کے باہمی اختلافات کو حل کرنے کے لئے سربرآوردہ لوگ آگے آئیں اور پوری غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ میل ملاپ کرادیں، نیز جہاں پنچایتیں ہوتی ہیں، وہاں کی صورت حال اکثر و بیشتر یہ ہے کہ کم پڑھے لکھے یا ان پڑھ لوگ پنچایتوں کے رکن ہیں، وہ کسی معاملہ کو طئے کرنے میں غیر جانبدار نہیں رہ پاتے —— دارالقضاء ایک ایسا پلیٹ فارم ہے، جہاں شریعت اسلامی کی روشنی میں پوری غیر جانبداری کے ساتھ فریقین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور جو معاملات آتے ہیں، ان میں سے اکثر گفت وشنید کے ذریعہ طے پاجاتے ہیں اور خوشگوار طریقہ پر حل نکل آتا ہے، بہت سی دفعہ فریقین جو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوکر آتے ہیں، باہم گلے مل کر رخصت ہوتے ہیں، یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے، بلکہ ایک عملی حقیقت اور آزمودہ واقعہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عدالتوں میں مقدمہ فیصل کرانے کے لئے بہت ہی طویل وقت

درکار ہوتا ہے اور اس کے لئے کئی اسباب ہیں، سب سے بڑا سبب ججوں کی کمی اور مقدمات کی کثرت ہے، ابھی بھی ۳۵؍ لاکھ مقدمات عدالتوں میں زیر دوراں ہیں، اندرا گاندھی کے قتل کا مقدمہ بظاہر بالکل صاف و واضح تھا، لیکن اس کا فیصلہ کرنے میں اور قاتل کو قاتل قرار دینے میں بارہ سال لگ گئے، بابری مسجد سے متعلق حقیقت کا مقدمہ ۱۹۴۵ء سے زیر دوراں ہے اور نہ معلوم کب تک اسی طرح چلتا رہے گا، پچھلے دنوں سپریم کورٹ کی ہدایت آچکی ہے کہ حکومت جب نئے قوانین بنائے، تو اسی نسبت سے ججوں کا تقرر بھی کرے، تاکہ اس قانون سے مربوط مقدمات کے فیصلے کئے جاسکیں، لیکن حکومت کس حد تک اس پر عمل کر سکے گی، یہ کہنا مشکل ہے۔

مقدمہ کے طول پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس فریق کو اپنے خلاف فیصلہ کی اُمید ہوتی ہے، وہ معمولی اعذار پیش کر کے تاریخیں آگے بڑھاتا جاتا ہے اور عدالتیں بھی ضابطہ کے تحت مہلت دینے پر مجبور ہوتی ہیں، پھر مقدمات کی کثرت کی وجہ سے ایک تاریخ ملتوی ہوتی ہے، تو بعض اوقات کئی ماہ بعد اگلی تاریخ کی نوبت آتی ہے، اس طرح کارروائی طویل سے طویل تر ہوتی جاتی ہے، حقیت وغیرہ کے مقدمات کے فیصل ہونے میں ایک ایک پشت گذر جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فسخ نکاح سے متعلق مقدمات فیصل ہونے میں بھی طویل مدت درکار ہوتی ہے اور نوجوان لڑکیوں کی عمر اتنی بڑھ جاتی ہے کہ آئندہ دوسرے نکاح کا مسئلہ ان کے لئے بہت ہی دشواری کا باعث ہو جاتا ہے، دارالقضاء میں معاملات کم ہوتے ہیں، اس لئے مقابلۃً بہت ہی کم وقت میں طئے پا جاتے ہیں اور فریقین کو راحت ملتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عدالت سے انصاف حاصل کرنا اکثر حالات میں بہت زیادہ اخراجات کا باعث ہوتا ہے، فریقین کو وکیل رکھنا پڑتا ہے اور جب تک مقدمہ چلتا رہتا ہے فیس کا سلسلہ بھی جاری وساری رہتا ہے، پھر اگر مالی مقدمات ہیں، تو بعض مقدمات میں عدالت کو رسوم بھی ادا کرنے پڑتے ہیں، اس طرح مقدمات کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ بعض دفعہ فیصلہ کے بعد جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اس سے زیادہ پہلے خرچ ہو جاتا ہے، یہ صورت حال ہے، جس کے باعث غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لئے عدالتی کارروائی ناقابل برداشت

مشقت بن جاتی ہے، بہت سے لوگ عدالتوں سے رُجوع ہونے کی ہمت ہی نہیں کر پاتے، اور بعض درمیان میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا مقدمہ خارج ہوجاتا ہے، دارالقضاء میں صرف پوسٹل اخراجات فریقین سے لئے جاتے ہیں اور بہت نادار ہوں تو وہ بھی معاف کردیئے جاتے ہیں وکیل کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ سارے سوالات اور جرح قاضی خود کر لیتا ہے اور پورا معاملہ صاف وشفاف ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی پہلو سے بھی شدید ضرورت کے بغیر عدالتوں سے رُجوع ہونا کوئی خوشگوار امر نہیں، یہ ایک کھلا راز ہے کہ جو لوگ عدالت سے رجوع ہونا چاہتے ہیں انھیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ کو مختلف قانونی دفعات میں پھنسایا جائے، عرض دعویٰ میں غلط بیان سے کام لیا جاتا ہے، پھر عدالت میں فریقین خود قرآن اٹھا کر اور قسم کھا کر اسی جھوٹ کو اضافہ کے ساتھ دہراتے ہیں، گواہ کو بھی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے کہ وہ بلاتکلف کسی جھوٹ کو اپنی زبان سے اگلیں، کیوں کہ یہاں جو لوگ آتے ہیں، ان کے سامنے صرف قانونی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے، خدا اور رسول کی رضا وخوشنودی اور اس کی ناراضگی سے بچنے کا کوئی تصور نہیں ہوتا، اس طرح مال تو ضائع ہوتا ہی ہے، دین واخلاق کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے اور '' خسر الدنیا والآخرۃ '' کی صورت حال ہوتی ہے، دارالقضاء میں لوگ اسی خیال کے ساتھ آتے ہیں کہ یہ دنیا کی نہیں آخرت کی عدالت ہے، یہاں اللہ اور رسول کی خوشنودی والا فیصلہ حاصل کرنا ہے، اس لئے فریقین بھی اور خاص کر گواہ سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک ذاتی تجربہ نقل کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، میرے پاس دارالقضاء امارت ملت اسلامیہ پنجہ شاہ حیدرآباد میں ایک ایسا مقدمہ آیا، جس میں مدعا علیہ روڈی شیٹر تھا اور مدعیہ خوف زدہ تھی کہ شاید وہ تیزاب پھینک دے، کیوں کہ وہ بہت ہی غنڈہ قسم کا آدمی ہے، ہم لوگوں نے اسے اطمینان دلایا، دو رکعت نماز پڑھ کر دُعاء کی کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ کو آسانی سے حل فرمادے، فریقین آئے، ان سے وضو کرایا، اور انھیں قرآن مجید کی عظمت اور جھوٹی قسم کی مذمت اور اس کے وبال کے بارے میں دو چار جملے کہے، پھر مدعا علیہ کے ہاتھ میں قرآن

دیا، اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور بہت خوشامدانہ انداز سے کہنے لگا کہ قرآن مجید ہمارے ہاتھ سے لے لیجئے، آپ جو کہیں گے ہم اس کے مطابق عمل کریں گے، قرآن ہاتھ سے لے لیا گیا، پھر کہنے لگا میں آئے دن عدالتوں اور پولیس اسٹیشنوں کا چکر لگاتا ہوں اور میرے جسم کے انگ انگ پر پولیس کی مار کے نشانات ہیں، اس لئے میں پولیس اور عدالت سے بے خوف ہو چکا ہوں، مگر آج میرے اندر جو گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں پیدا ہوئی —— ایمان کی یہ بجھی ہوئی چنگاری بدکار سے بدکار مسلمان کے اندر بھی موجود ہوتی ہے، یہی چیز اس کے اندر اللہ کا خوف پیدا کرتی ہے، اور یہی خشیتِ الٰہی دارالقضاء کی سب سے بڑی طاقت ہے اور جس شخص کو خدا کا خوف جھکا نہ سکے، کوئی دوسری طاقت بھی اسے مطیع اور فرمانبردار نہیں بنا سکتی، اسی لئے اعلیٰ ترین عدالتوں کے بہت سے فیصلے ہوتے ہیں، لیکن عملاً ان کا نفاذ نہیں ہو پاتا۔

دارالقضاء کا وجود خاص طور پر خواتین کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ان کے لئے کسی واسطہ اور وسیلہ کے بغیر براہ راست دارالقضاء سے رُجوع کرنا، اپنی پریشانی پیش کرنا اور اپنے مسائل کو حل کرنا آسان ہوتا ہے، جن معاملات کو طے کرانے میں سالہا سال لگتے ہیں ہزاروں روپئے کے اخراجات آتے ہیں اور دوڑ بھاگ میں چپلیں گھس جاتی ہیں، غریب عورتیں بہت کم عرصے میں بغیر کسی خرچ کے اپنے وہ حقوق حاصل کرتی ہیں اور اپنی دشواریوں کو حل کراتی ہیں، عدالتوں تک غریبوں اور کمزوروں کو رسائی حاصل کرنے میں دشواری پیش آتی ہے اور اگر کسی طرح انھوں نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں انصاف حاصل بھی کر لیا تو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک مرافعہ کی مدافعت کرنے کی طاقت ان میں ہوتی۔

دارالقضاء کے نظام شفافیت، سہولت اور اخراجات کی کمی کی وجہ سے ملک کے مختلف دارالقضاء میں بہت سے غیر مسلم بھائیوں نے بھی اپنے باہمی معاملات کو حل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے، بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نزاعی اُمور کو طے کرنے میں بھی دارالقضاء کو ترجیح دی ہے، اسی لئے ہندوستان میں دارالقضاء کی شاندار روایات رہی ہیں اور

ہزاروں مقدمات ان پرائیوٹ مسلم پنچایتی اداروں کے ذریعہ طے پاتے ہیں، اس لحاظ سے یہ عدلیہ کے معاون ادارے ہیں، ملک میں مہیلا کورٹ، لوک عدالت وغیرہ کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ بہت سے فیصلے عدالتوں سے باہر ہوجائیں اور عدالتوں پر مقدمات کے جو بوجھ ہیں وہ کم ہوں، اسی طرح بہت سے قبائلی گروہ ہیں جن کی پنچایتیں ہیں اور وہ اپنے باہمی مسائل کو خود طے کرتے ہیں اور انھیں سماجی طور پر قبول کیا جاتا ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ مسلمانوں کے نظام قضاء کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور ان کو قوت پہنچائی جائے تاکہ مسلم پرسنل لاء کے دائرہ میں آنے والے مسائل کو وہ حل کیا کریں، اس میں مسلمان سماج کی بھی بھلائی ہے، خواتین کے لئے سہولت ہے اور خود ملک کے نظام عدل کے لئے تعاون ہے، نیز مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے معاملات دارالقضاء کے ذریعہ حل کرائیں کہ اس میں ان کی دنیا کی بھی بہتری ہے اور آخرت کی بھی اور اس میں ان کے لئے کوئی قانونی دشواری اور رکاوٹ بھی نہیں ہے!

۲۶ / اگست ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

روزہ کے کچھ اہم مسائل

انسان کے لئے وقت جاننے کے دو ذریعے ہیں، سورج اور چاند" الشمس والقمر بحسبان "(الرحمٰن: ۵) لیکن سورج کی رفتار سے واقف ہونا دقیق ترین سائنسی وسائل کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ سوج کو دیکھ کر تاریخ کا اندازہ کیا جا سکے؛ کیوں کہ سورج روزانہ مکمل طلوع ہوتا ہے اور شروع سے آخیر تک اپنے پورے حجم کے ساتھ ہماری اس زمین سے نظر آتا ہے، چاند ایسا سیارہ ہے جو تاریخوں کے لحاظ سے گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے، اس کی ابتداء ہلال سے ہوتی ہے، جو باریک نصف دائرہ کی شکل میں ہوتا ہے اور اس کی انتہاء بدر پر ہوتی ہے، یعنی چودھویں کا چاند جس میں چاند کا پورا دائرہ روشن نظر آتا ہے، اس لئے چاند کو دیکھ کر تاریخوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور پہلے زمانہ میں تو چاند ہی تاریخوں کی تعیین اور اس کو جاننے کا واحد ذریعہ تھا، آج بھی دنیا کے بہت سے علاقے وہ ہیں جہاں معلومات کے جدید وسائل دستیاب نہیں، اس لئے اسلام میں تاریخوں سے جڑی ہوئی عبادتوں کو چاند سے متعلق رکھا گیا ہے۔

بعض اوقات چاند کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اختلاف انتشار کا سبب بنتا ہے، بعض لوگ اسے شریعت کا قصور سمجھتے ہیں، یہ محض نادانی اور ناسمجھی کی بات ہے، شریعت کے احکام بالکل واضح ہیں، اصل میں ملک کے مختلف صوبوں میں موجود رؤیت ہلال کمیٹیوں کے درمیان ارتباط کے مفقود ہونے کی وجہ سے اختلاف وانتشار کی نوبت آتی ہے، ضرورت ہے کہ ہر صوبہ کی رؤیت ہلال کمیٹی کا ملک گیر سطح پر ایک وفاق ہو اور وہ آپس میں معلومات کا تبادلہ کریں اور ایک دوسرے سے مشورہ کر کے فیصلہ کریں، اس طرح نہ صرف یہ کہ مسلمان باہمی انتشار سے بچیں گے بلکہ دوسروں کو اور خاص کر ذرائع ابلاغ کو جو ہم پر ہنسنے کا

موقع ملتا ہے، اس کا بھی تدارک ہو سکے گا، بہرحال روزہ کی ابتداء اور انتہاء دونوں چاند دیکھنے ہی سے متعلق ہے اور اس سلسلہ میں محض فلکیاتی اُصول ومعلومات کا اعتبار نہیں۔

روزہ ایسی چیزوں سے ٹوٹتا ہے جو جسم کے اندر داخل ہو، اُصولی طور پر جسم سے خارج ہونے والی چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اسی لئے اگر جسم سے خون نکالا جائے یا میڈیکل ٹسٹ کے لئے کسی اور جز کو نکالا جائے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، ہاں جسم سے اتنا خون نکالنا کہ بہت زیادہ کمزوری کی وجہ سے روزہ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو، مکروہ ہے۔

اگر کان میں دوا ڈالی جائے تو ہمارے فقہاء نے عام طور پر اسے روزہ کے ٹوٹنے کا باعث قرار دیا ہے، کیوں کہ قدیم اطباء کان اور جوف دماغ کے درمیان راستہ مانتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ کان میں ڈالی جانے والی چیز جوف دماغ تک پہنچ جاتی ہے، لیکن جدید میڈیکل تحقیق اس کے برخلاف ہے کہ کان سے دماغ تک راستہ نہیں جاتا ہے، بلکہ کان کا سوراخ پردۂ سماعت پر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے اس حقیر کی رائے میں کان میں دوا ڈالنا روزہ کے لئے مفسد نہیں ہے، البتہ احتیاط کرنا بہتر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے روزہ کی حالت میں سرمہ کا استعمال کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر روزہ دار آنکھ میں کوئی دوا ڈالے تو اس سے اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا، رہ گئی یہ بات کہ آنکھ کی دوا کا ذائقہ حلق میں محسوس ہوتا ہے تو فقہاء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آنکھ سے حلق تک اصل شئ نہیں پہنچتی بلکہ اس شئ کا اثر پہنچتا ہے اور روزہ اصل شئ کے داخل ہونے سے ٹوٹتا ہے نہ کہ کسی چیز کے اثر سے۔

ناک کا راستہ حلق کی طرف پایا جاتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، اسی لئے مریضوں کو ناک سے غذا پہنچائی جاتی ہے، لہٰذا ناک میں کوئی دوا ڈالی جائے تو بالاتفاق روزہ ٹوٹ جائے گا، البتہ اگر کوئی دوا ایسی ہو جو صرف سونگھی جاتی ہو یا کسی نے عطر کا استعمال کیا، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ سونگھنے کے ذریعہ اصل شئ جسم کے اندر داخل نہیں ہوتی، صرف اس کا اثر جسم تک پہنچتا ہے اور انسان کی قوت شامہ اس کا ادراک کرتی ہے۔

منہ معدہ تک کسی چیز کو پہنچانے کا فطری و بنیادی راستہ ہے، منہ میں کسی چیز کے داخل کرنے کے مختلف مراحل ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ کسی چیز کو صرف زبان سے چکھ لیا جائے اور چکھ کر تھوک دیا جائے، بلا عذر ایسا کرنا گو مکروہ ہے؛ لیکن اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیوں کہ کھانا حلق سے نیچے کسی شئ کے اترنے کا نام ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ حلق سے نیچے جائے لیکن جانے والی چیز کسی شئ کی بہت ہی دقیق ذرات ہوں، جیسے گرد وغبار، دھواں، اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ یہ بلا ارادہ حلق سے نیچے گیا ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ بعض اوقات اس سے بچنا دشوار ہوتا ہے، گویا یہ ایک مجبوری ہے اور اگر قصداً ایسی چیزیں لی جائیں، جیسے عود کی دھونی، بھپارہ، یا دمہ کے مریضوں کے لئے انہیلر، تو روزہ فاسد ہو جائے گا، کیوں کہ ان صورتوں میں بعض اشیاء کے ذرات حلق سے نیچے تک پہنچتے ہیں، اسی حکم میں بیڑی، سگریٹ اور حقہ بھی ہے، ان سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، فرق یہ ہے کہ عود کی دھونی یا کسی بھی دھواں کو قصداً لینے کی وجہ سے روزہ تو ٹوٹے گا، کفارہ واجب نہیں ہوگا، لیکن سگریٹ وغیرہ سے چوں کہ لذت اور تسکین نفس بھی متعلق ہے اس لئے اس سے کفارہ بھی واجب ہوتا ہے، فقہاء کی صراحت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔

اگر منہ کے ذریعہ معدہ تک کوئی چیز پہنچائی جائے لیکن اسے معدہ میں چھوڑا نہ جائے، نکال لیا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، فقہ کی کتابوں میں اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ بعض میڈیکل ٹسٹ ایسے ہوتے ہیں کہ باریک وائر اور کیمرہ معدہ تک پہنچائے جاتے ہیں، پھر اسے واپس نکال لیا جاتا ہے، نیز بعض میڈیکل آلات معدہ کے اندرونی حصہ میں بھیجے جاتے ہیں، جو میڈیکل ٹسٹ کے لئے گوشت کا کوئی ٹکڑا لے کر واپس آجاتا ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

معدہ کی طرف جانے والا دوسرا فطری راستہ انسان کا پچھلا راستہ ہے، قدیم زمانہ میں بھی اطباء بہت سے امراض کے علاج میں حقنہ استعمال کرتے تھے، حقنہ میں نلکی کے ذریعہ سیال دوائیں براہ راست معدہ تک پہنچائی جاتی تھیں، اب بھی یہ طریقہ علاج بہت سے امراض میں

استعمال ہوتا ہے، اسی طرح بواسیری مسوں پر مرہم لگانے کا مسئلہ ہے، یہ مسے بعض اوقات جسم کے اندرونی حصہ پر ہوتے ہیں اور اوپر کی طرف چڑھ جاتے ہیں، ان صورتوں میں بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، البتہ اگر میڈیکل ٹسٹ کے لئے انڈواسکوپی کی جائے جس میں وائر کے ذریعہ کیمرہ آنت تک پہنچایا جاتا ہے اور فوٹو حاصل کی جاتی ہے تاکہ زخم وغیرہ کی موجودگی اور اس کی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکے، اور اس میں کوئی دوا استعمال نہ کی جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

جسم کے بیرونی حصہ سے اندرونی حصہ کی طرف ایک فطری راستہ عورتوں میں اندام نہانی کا ہے، بعض دوائیں اندام نہانی میں ڈالی جاتی ہیں، ایسی دواؤں کے استعمال سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

انجکشن دوا پہنچانے کا ایک ایسا ذریعہ ہے، جو جسم کے اندرونی حصہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بہت ہی باریک سوراخ کرتا ہے، اور دوا پہنچاتا ہے، انجکشن کے ذریعہ گوشت یا رگوں میں دوا پہنچتی ہے، براہ راست معدہ میں دوا نہیں پہنچتی، اس لئے انجکشن کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، ہاں اگر کوئی انجکشن براہ راست معدہ ہی میں دیا جاتا ہو، جیسا کہ غالباً سگ گزیدہ شخص کو پہلے دیا جاتا تھا، تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، گلوکوز چڑھانا بھی انجکشن ہی کی ایک صورت ہے، اس لئے راجح یہی ہے کہ گلوکوز کے چڑھانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا، البتہ اگر گلوکوز غذائی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہو اور اس کے چڑھانے کی وجہ سے بھوک و پیاس کا احساس ختم ہوجاتا ہو تو اس حقیر کے خیال میں یہ صورت کراہت سے خالی نہیں ہوگی، کیوں کہ روزہ کا مقصد شہوات اور خواہشات پر قابو پانا ہے اور اس سلسلہ میں ہونے والی مشقتوں کو برداشت کرنا ہے، اگر انسان مشقتوں سے دوچار ہی نہ ہو تو روزہ کا یہ مقصد مجروح ہوگیا، اور عبادت کے بجائے تفریح طبع کے درجہ میں آ گیا، اس لئے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

شریعت میں بعض لوگوں کو وقتی طور پر روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے اور ان پر قضاء واجب کی گئی ہے، جیسے مسافر اور مریض، اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مسافر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے گھر سے ۷۷ کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ کا سفر کرے، اور اس کا

سفر روزہ کی ابتداء سے پہلے شروع ہو گیا ہو، اگر کوئی شخص دن کے ابتدائی حصہ میں مقیم تھا، بعد میں مسافر ہوا تو اس کے لئے روزہ توڑنا جائز نہیں ہوگا، سفر خواہ آرام دہ ہو یا تکلیف دہ، معمولی رفتار کی سواری ہو یا تیز رفتار سواری، ہر ایک کے لئے یہی حکم ہے۔

مریض سے مراد ایسا شخص ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کی بیماری میں اضافہ کا، یا اس کی صحت یابی میں خاصی تاخیر کا اندیشہ ہو، معمولی بیماریوں کی وجہ سے روزہ توڑ لینا درست نہیں، اس سلسلہ میں قابل اعتبار مسلمان معالج کے مشورہ کو بنیاد بنانا چاہئے اور خود نفس کے دھوکوں سے چوکنا رہنا چاہئے۔

بہت بوڑھے شخص کے لئے روزہ نہ رکھنے اور اس کی جگہ فدیہ ادا کر دینے کی گنجائش ہے، ایسے شخص کو فقہ کی اصطلاح میں ''شیخ فانی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی عمر متعین نہیں ہے کیوں کہ مختلف لوگوں کے قویٰ الگ الگ ہوتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ عمر کے زیادہ ہونے کی وجہ سے پورے دن بھوک و پیاس برداشت کرنے کی قوت باقی نہ رہے، یہی حکم ایسے شخص کے لئے بھی ہے جو بیمار ہو، اور جس کے اس بیماری سے شفایاب ہونے کی توقع نہ ہو۔

جو عورتیں حیض یا نفاس کی حالت میں ہوں ان کے لئے روزہ رکھنا جائز نہیں، البتہ وہ بعد میں قضاء کریں گی، بعض خواتین روزہ نہیں رکھتی ہیں، لیکن رمضان کے احترام کے طور پر کھانے پینے سے رکی رہتی ہیں، ایسا کرنا مکروہ ہے، کھانے پینے سے رکا رہنا روزہ داروں کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے ہے، اور اس حالت میں روزہ کی مشابہت اختیار کرنا اس عبادت کی بے احترامی کے مترادف ہے، اس لئے فقہاء نے اس سے منع کیا ہے۔

۲۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

نکاح میں ولی کے کردار کی اہمیت

کائنات کی یہ وسیع وعریض اور حسین وجمیل بستی حضرت انسان کے لیے بسائی گئی ہے اور جمادات اور حیوانات سے لے کر ملائکہ تک شب و روز ان کی خدمت اور ان کے لیے سہولتوں کی فراہمی میں مشغول ہیں، اس بستی کو قیامت تک آباد رہنا ہے اور پھر قیامت کے بعد انہیں آباد کاروں سے جنت ودوزخ کی آبادی بھی متعلق ہے، اسی لیے انسان کے اندر افزائش نسل کا ایک قدرتی نظام رکھا گیا ہے، اس نظام کو جاری وساری رکھنے کے لیے مرد وعورت میں مخصوص قسم کی تولیدی صلاحیت رکھی گئی ہے اور اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کی غرض سے انسان کے اندر صنفی جذبات اور اولاد کی خواہش رکھی گئی ہے، اس سے یہ بستی ہمیشہ شاد وآباد رہتی ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ مرد وعورت کا یہ تعلق اصول وقانون سے آزاد ہو، جیسا کہ جانوروں میں ہے، ایسی آزادانہ صنفی زندگی سے بچوں کی پیدائش تو ہو سکتی ہے، لیکن کوئی خاندان وجود میں نہیں آ سکتا، انسان دادیہالی، نانیہالی، اور سسرالی قرابت مندیوں کے حصار میں جب اپنی زندگی گذارتا ہے تو اس کے ساتھ دکھ سکھ میں ایک بڑی تعداد شریکِ حیات ہوتی ہے، یہ شرکت خوشی کو دوبالا اور غم کو ہلکا کرتی ہے، اس سے انسان کو خاندانی تحفظ حاصل ہوتا ہے، سماج میں اس کی شناخت اور پہچان بنتی ہے اور اس کے بزرگوں کے کارنامے عملی زندگی میں حوصلہ مندی اور جوشِ عمل کا باعث بنتے ہیں، پس ازدواجی نظام انسانی فطرت کا ایک حصہ اور انسانی سماج کی بہت اہم ضرورت ہے۔

اسی لیے اسلام نے نکاح کی بڑی تاکید کی ہے اور تجرد کی زندگی کو پسند نہیں کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر نوجوانوں کو تاکید فرمائی کہ ان میں سے جن کے اندر نکاح کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہو، انھیں نکاح کر لینا چاہئے ''من استطاع منکم الباءۃ

فــلیتــزوج ‘‘ یہ تعلیم نہ صرف نوجوانوں کو دی گئی، بلکہ سماج کو بھی متوجہ کیا گیا کہ جو لوگ تجرد کی حالت میں ہوں خواہ ابھی ان کی شادی نہ ہوئی ہو یا شادی ہوئی ہو اور اب وہ کسی وجہ سے تجرد کی زندگی گزار رہے ہوں، ان کا نکاح کیا جائے فَانْكِحُوا الْأَيَامىٰ مِنْكُمْ (نور:۳۲) کیوں کہ نکاح سے گریز نسل انسانی کی افزائش کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور اس سے سماج میں اخلاقی قدریں بھی پامال ہوتی ہیں، چنانچہ آج مغربی معاشرہ اس کی واضح مثال ہے۔

نکاح کے سلسلہ میں شریعت نے جو ضوابط مقرر کئے ہیں، ان میں ایک قانونِ ولایت ہے، ولایت کے معنی دوستی، نگرانی، سرپرستی، محبت وغیرہ کے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مؤمن مرد و عورت ایک دوسرے کے ولی ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے اور مدد کرنے والے ہیں ’’وَالْمُؤْمِنُونَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ‘‘ (التوبہ:۷۱) اسی سے ولی کا لفظ ہے، فقہ کی اصطلاح میں ’’ولایت سے مراد ہے اپنی رائے کو دوسرے پر نافذ کرنے کا اختیار۔‘‘

فقہ کی کتابوں میں ولایت کے سلسلہ میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، چنانچہ احکام کے اعتبار سے ولایت کی تین قسمیں کی گئی ہیں: ولایت علی النفس یعنی کسی کی ذات پر ولایت، اس میں نکاح، تعلیم، علاج، کام میں لگانے وغیرہ کی ذمہ داری آتی ہے، ولایت علی المال یعنی مالی امور کی ولایت، اس میں زیر ولایت شخص کے مال کی حفاظت، اس پر خرچ کرنا، اس کی سرمایہ کاری اور تفریق وغیرہ کرنا داخل ہے، تیسری قسم ہے ولایت علی النفس والمال یعنی جان و مال دونوں کی سرپرستی اور نگرانی۔

ولایت بنیادی طور پر نابالغ اور فاتر العقل لڑکوں اور لڑکیوں پر حاصل ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ دونوں خود درست فیصلہ کرنے اور اپنے نفع و نقصان کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لیے اس بات پر فقہاء متفق ہیں کہ نابالغ اور فاتر العقل شخص خود اپنا نکاح نہیں کرسکتا، اولیاء ہی کو حق ہے کہ اس کا نکاح کریں، لیکن بالغ ہونے کے بعد بھی مستحسن طریقہ یہ ہے کہ اولیاء کو اعتماد میں لے کر نکاح کیا جائے، اس لیے کہ وہ اپنے تجربہ اور جہاں بینی کی بنیاد پر جتنا درست

فیصلہ کر سکتے ہیں، خود یہ لڑکے اور لڑکیاں نہیں کر سکتے ، اسی لیے احناف کے نزدیک اختیارات کے اعتبار سے ولایت کے تین درجے ہیں ، ولایتِ الزام، ولایتِ اجبار اور ولایت ندب ، ولایتِ الزام سے مراد یہ ہے کہ ولی کا کیا ہوا نکاح زیرِ ولایت شخص کے حق میں لازم ہو جائے اور اس کو نکاح رد کرنے کا حق باقی نہیں رہے؛ چنانچہ والد یا دادا نے اگر نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دیا تو وہ نکاح لازم ہو گیا، بشرطیکہ ولی نکاح کرتے وقت نشہ کی حالت میں نہ رہا ہو اور وہ اپنے اختیارات کے غلط استعمال کرنے میں معروف نہ ہو، لڑکے اور لڑکیاں بالغ ہونے کے بعد بھی اس نکاح کو رد نہیں کر سکتے۔

دوسرا درجہ ولایتِ اجبار کا ہے، ولایتِ اجبار سے مراد یہ ہے کہ زیرِ ولایت شخص کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کر دینا درست ہو، لیکن یہ اس پر لازم نہ ہو، بالغ ہونے کے بعد اگر انہیں رشتہ پسند نہ آئے تو وہ اس رشتہ کو رد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس اختیار کو ’ خیارِ بلوغ ‘ کہتے ہیں، یہ ولایت باپ دادا کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں چچا، بھائی وغیرہ (جن کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے) کو حاصل ہوتی ہے، البتہ اس میں کسی قدر اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لڑکی کو بھی بالغ ہونے کے بعد اپنی ذات کے بارے میں اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اپنا نکاح کر سکتی ہے ، اور دوسرے فقہاء کے نزدیک بالغ ہونے کے بعد بھی ولی کی وساطت کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

تیسرا درجہ ’ ولایتِ ندب ‘ کا ہے، یعنی جن کو خود اپنا نکاح کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن مستحب اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ ولی کی رضامندی ہی سے نکاح کرے ، یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں دونوں ہی کے لیے ہے، لیکن لڑکیاں چوں کہ اندرونِ خانہ رہتی ہیں ، حالات سے واقف نہیں ہوتیں اور اپنی جذباتیت کی وجہ سے بعض دفعہ بہت جلد مردوں کے دام میں آ جاتی ہیں، اس لیے عورتوں کے لیے اس کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے، اسی لیے خواتین کو اس سلسلہ میں زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اسی لیے بعض فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ لڑکیاں بالغ ہونے کے بعد بھی خود اپنا نکاح نہیں کر سکتیں۔

حدیثوں میں بڑی اہمیت کے ساتھ ولی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نکاح بغیر ولی کے نہیں کیا جائے، **''لا نكاح إلا بولي''** (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۰۱) جمہور کے نزدیک اس کا مطلب ہے کہ بغیر ولی کے نکاح درست ہی نہیں ہوگا، اور حنفیہ کے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح کرنا بہتر نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس عورت نے اس کے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرلیا، اس کا نکاح باطل ہے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۰۲) جمہور کے نزدیک اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ اس کا نکاح ہی درست نہیں ہوگا، حنفیہ اس سے مراد لیتے ہیں کہ اس کا نکاح نفع بخش نہیں ہوتا ہے، حنفیہ کے پیش نظر قرآن مجید کی وہ آیات جن میں خود عورتوں کی طرف نکاح کرنے کی نسبت کی گئی ہے، (بقرہ: ۲۳۲، ۲۳۰) نیز یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو ان کے کسی ولی کے بغیر، اور حضرت عائشہ رضی للہ عنہا نے اپنی بھتیجی کا نکاح فرمایا بھائی سے اجازت لیے بغیر، اس لیے حنفیہ نے بالغ ہونے کے بعد لڑکیوں کو خود اپنے نفس پر مختار قرار دیا ہے، بہر حال ان آیات واحادیث کی جو بھی تشریح کی جائے، لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ خاص طور پر لڑکیوں کے نکاح کے سلسلہ میں ولی کی خاص اہمیت ہے اور اس کی رائے نظر انداز کر دینا کسی طور پر مناسب نہیں۔

لیکن افسوس کہ آج کل اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، کچھ لوگ وہ ہیں جو لڑکیوں کو اس کے حق انتخاب ہی سے محروم کر دیتے ہیں، اور بغیر لڑکی کے مشورہ کے اس کا رشتہ طے کر دیتے ہیں؛ حالاں کہ ولی کے لیے ضروری ہے کہ وہ لڑکی کی رضا معلوم کر کے ہی اس کا نکاح کرے، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ لڑکی بمقابلہ اپنے ولی کے اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے اور کنواری لڑکی سے بھی نکاح کے سلسلہ میں اجازت لی جائے گی **''الأيّم أحق بنفسها من وليها ......''**۔ (مؤطا امام مالک، حدیث نمبر: ۱۱۳۶)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں ایک کنواری لڑکی حضور ﷺ کی خدمت میں آئی کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا ہے، حالاں کہ وہ اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہے، آپ

ﷺ نے سنا تو اس لڑکی کو اختیار دیا کہ چاہے تو اس نکاح کو باقی رکھے یا ختم کردے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۰۹۶) اس لیے بعض سرپرستوں کا یہ رویہ کہ بغیر پوچھے اور اجازت لیے ہوئے لڑکی کا نکاح کردیں درست نہیں، یہ عورتوں کے ساتھ ظلم ہے اور شریعتِ اسلامی میں دی گئی شخصی آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات نوجوان لڑکیاں چھپ کر اپنا نکاح کرلیتی ہیں یا بعض لوگ ورغلا کر انہیں اپنے نکاح میں لے آتے ہیں، چاہے یہ نکاح دو گواہ کی موجودگی کی وجہ سے درست ہو جائے؛ لیکن یہ شریعت کی روح کے خلاف ہے اور اگر لڑکی نے بے جوڑ رشتہ کرلیا ہو، جو اس کے اہل خاندان کے لئے شرمساری کا باعث ہو، تو اولیاء کو اس پر اعتراض کرنے اور قاضی کے ذریعہ اس نکاح کو رد کردینے کا اختیار حاصل ہے، رسول اللہ ﷺ نے چھپ کر نکاح کرنے کو منع فرمایا ''**نهى عن نكاح السر**'' (مجمع الزوائد عن ابی ہریرۃ:۴/۲۸۵) اس لیے نکاح میں اعلان واظہار کا حکم دیا گیا ہے اور مسجد میں نکاح کرنے کی ترغیب دی گئی ہے؛ کیوں کہ مسجد میں عام طور پر حاضرین کی اچھی خاصی تعداد موجود ہوتی ہے، ''**أعلنوا هذا النكاح و اجعلوه في المساجد**'' روایتوں میں اضافہ ہے کہ حلال وحرام کے درمیان اعلان ہی سے فرق ہوتا ہے:

''**فإن فصل ما بين الحلال و الحرام الإعلان**''۔ (مجمع الزوائد، حدیث نمبر:۷۰۴۱)

اب اس نکاح سے زیادہ برا نکاح کون ہوگا، جس میں باپ تک کو نکاح کی خبر نہ ہو؟ ایسے نکاح عام طور پر وقتی جذبات کے تحت کیے جاتے ہیں اور اپنے انجام کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ایسے رشتوں میں نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکیاں صورت وشکل، گفتگو اور اظہارِ محبت سے متاثر ہوکر نکاح پر آمادہ ہو جاتی ہیں، اور دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر اس طرح کے نکاح دیرپا ثابت نہیں ہوتے، اس لیے سماج صالح اور نکاح کے مقاصد کے اعتبار سے یہ بات ضروری ہے کہ نکاح میں سرپرست کو بھی اعتماد میں لیا جائے، خاص کر جو لوگ دینی کاموں سے متعلق ہوں، ان کے لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے، کیوں کہ ولی کی شمولیت کے بغیر نکاح تہمت کا موقع پیدا کرتا ہے، اس سے بدگمانی کی راہ کھلتی ہے، اور جو لوگ دین کی خدمت میں مشغول

ہوں، ان کے لیے خاص طور پر مواقع تہمت سے دور رہنا اور اپنے آپ کو شکوک وشبہات کی جگہ سے بچانا ضروری ہے۔

غرض کہ اس سلسلہ میں توازن اور اعتدال کی ضرورت ہے، نہ یہ درست ہے کہ لڑکیوں کی جائز خواہش اور پسند کا خون کر دیا جائے، اور انہیں ایک ایسے رشتہ پر مجبور کر دیا جائے جو ان کے دل کو قبول نہ ہو اور نہ یہ مناسب ہے کہ لڑکے اور خاص کر لڑکیاں سرپرستوں کے مشورہ کو خاطر میں نہ لائیں اور انہیں اعتماد میں لیے بغیر نکاح کر لیں۔

۱۵/شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ ۱۸/نومبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

فون ٹیپنگ — اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بنایا ہے جس کو جلوت بھی مطلوب ہے اور خلوت بھی ، جسے انجمن کی ہنگامہ خیزی بھی چاہیے اور تنہائی کا گوشۂ سکون بھی ، وہ منظر عام پر آنا اور نمایاں ہونا بھی چاہتا ہے اور چھپنا اور دیدار سے پڑے رہنا بھی ، وہ کبھی گرمیٔ محفل سے مستفید ہونا چاہتا ہے اور اس طرح بھی رہنا چاہتا ہے کہ کوئی نگاہ اسے دیکھنے والی اور کوئی اسے ٹوکنے والی نہ ہو ، اس لیے لوگوں کا ساتھ بھی اس کے لیے ایک ضرورت ہے اور تنہائی بھی اس کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

اسلام میں اسی لیے انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں تعلیمات موجود ہیں ، اجتماعی زندگی میں اس کا طرز کیا ہوگا ؟ اور اس انفرادی حالت میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے ، ایثار سے کام لیا جائے ، اور جہاں انسان تنہائی ، خلوت اور پوشیدگی چاہتا ہے وہاں دخل اندازی سے بچا جائے...... ٹیلیفون ٹیپ کیے جانے کے جو الزامات سیاسی قائدین ایک دوسرے پر لگا دیتے ہیں اور جو اس وقت اخبار کا موضوع بنا ہوا ہے ، اس نے سیاسی قیادت میں پائی جانے والی اخلاقی بے راہ روی اور مسلمہ انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کو ایک بار پھر طشت از بام کر دیا ہے ، جب زعماء و قائدین دیانت و اخلاق کی اس سطح پر اتر آئیں تو دوسروں کا کیا ذکر اور بیچارے عوام سے کیا گلہ؟؟

کسی کا ٹیلیفون سننا یا بلا اجازت اسے ریکارڈ کر لینا دوسرے کے گھر میں جھانکنے کے مترادف ہے ، حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے پردہ ہٹا دیا اور بلا اجازت کسی کے گھر میں دیکھا اور اہل خانہ کی قابل ستر چیز اس کی نظر میں آ گئی تو وہ ایک ایسی حد کو پہنچ گیا جو قطعاً اس کے لیے جائز نہیں ، اگر اس کے دیکھنے کے وقت

گھر کے لوگوں میں سے کسی کا سامنا ہوجائے اور وہ اس دیکھنے والے کی آنکھ کو پھوڑ دے تو میں اسے ہدف تنقید نہیں بناؤں گا (ما عیرت علیه) اور اگر دروازہ کھلا ہوا ہو اور پردہ نہ ہو اور پھر گزرنے والا شخص دیکھے تو وہ قصوروار نہیں، بلکہ قصور اہل خاندان کا ہے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۵۷) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک صاحب نے حضور ﷺ کے بعض حجروں میں جھانکنے کی کوشش کی، آپ ﷺ چاقو لے کر کھڑے ہوگئے اور اس کی طرف بڑھایا کہ اس پر وار کریں، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۱۷۱) بعض روایات میں ہے کہ وہ شخص پیچھے ہٹ گیا۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۰۸)

ان روایات سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ جو فون عوامی مقامات پر ہو اور ہر شخص کو سننے کی اجازت ہو، یا ایسے ہینڈ فری فون جن کی آواز شرکاء محفل سنتے ہوں، کو سننے کی اجازت ہے، لیکن فون کرنے والے کے لیے فون کے اصل مخاطب کی اجازت کے بغیر اس کو رکارڈ کرنا درست نہیں، اور جو فون افراد کے درمیان بات چیت کے لیے کیا جاتا ہے، اسے متعلق شخص کا نہ سننا درست ہے اور نہ ٹیپ کرنا —— حدیث میں جو قابل ستر چیزوں کے دیکھنے کی بات آئی ہے، اگر اس کے مقصد کو پیش نظر رکھا جائے اور اس کی معنوی گہرائی اور وسعت ملحوظ رہے، تو نجی بات چیت بھی اس میں شامل ہے؛ کیوں کہ بہت سی گفتگو بھی قابل ستر ہوتی ہے، کبھی شوہر و بیوی فون پر بے تکلف گفتگو کرتے ہیں، کبھی گفتگو کے دوران بعض مردوں اور عورتوں کے بارے میں کوئی منفی تذکرہ آجاتا ہے، بعض اہمیت کی حامل نجی اور راز کی باتیں ہوتی ہیں، یہ بھی قابل ستر ہیں، اور ان کو سننا اور جاننے کی کوشش کرنا دراصل ان کو دیکھنا ہے!

قرآن مجید نے اس مقصد کے لیے خاص طور پر ''استیذان'' کا قانون مقرر کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کے لیے تو ہر وقت اجازت لے کر ہی گھر میں داخل ہونے کی ہدایت فرمائی ہے، ساتھ ہی ساتھ بچے اور غلام —— جو عام طور پر بلا اجازت ہر وقت گھر میں آتے رہتے ہیں —— ان کے بارے میں بھی ہدایت دی گئی ہے کہ :

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! تمہارے غلام اور تم میں سے نابالغوں

کو بھی چاہیے کہ وہ تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں، نماز فجر سے پہلے، دوپہر میں جب کہ تم اپنے (زائد) کپڑے اتار لیتے ہو، اور نماز عشاء کے بعد، یہ تین وقت تمہارے لیے (ان سے بھی) پردہ کے ہیں، ان اوقات کے بعد (بلا اجازت) تم پر اور ان پر کوئی حرج نہیں ؛ کیوں کہ تم ایک دوسرے پر کثرت سے آمد و رفت کرتے رہتے ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔ (نور: ۵۸)

......معلوم ہوا کہ خلوت کے بعض مواقع ایسے بھی ہیں جس میں اولاد اور والدین کے لیے بھی ستر کی رعایت ضروری ہو جاتی ہے اور اجازت کے بغیر آمد و رفت کی ممانعت ہوتی ہے۔

جس بات کو بولنے اور سننے والے اپنے دائرہ میں محفوظ رکھنا چاہتے ہوں اور ان کی خواہش ہو کہ دوسرے لوگ اس میں دخیل نہیں ہوں، ان کو سننے کی کوشش کرنا اور اچک لینا دراصل ایک طرح کی چوری ہے، اور خود قرآن مجید میں اس کو چوری ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ فرشتوں کو احکام ربّانی دیا جاتا ہے شیطان اس کا سن گن لینے کے لیے کوشاں رہتا ہے، ان شیاطین پر فرشتے ''شہابِ ثاقب'' پھینکتے رہتے ہیں، شیطان کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے صراحۃً 'بات کی چوری' سے تعبیر کیا ہے، (حجر: ۱۸) ـــــ اس لیے کسی کی مخفی باتوں کو سننے کی کوشش کرنا ''چوری'' میں داخل ہے، اور چوں کہ اس سے انسان کی عزت و آبرو متعلق ہوتی ہے، اس لیے یہ کسی بھی طرح مال و اسباب کی چوری سے کم درجہ کی چوری نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات اس کا نقصان اس چوری سے بڑھ جاتا ہے۔

دوسروں کا فون سننے اور اسے ٹیپ کرنے کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وہ ہے تجسس اور دوسرے کی راز کی باتوں سے واقف ہونا، جب انسان ایک دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے اور اس کے بارے میں نفرت اور کدورت کے جذبات اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے تو یہی چیز انسان کو تجسس کی طرف لاتی ہے اور تجسس آمیز طبیعتیں ایسی اوچھی حرکتوں پر اتر آتی ہیں ؛

اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹیلیفون ٹیپنگ غیر شریفانہ، غیر اسلامی اور غیر انسانی حرکت ہے اور ایسے لوگوں سے جن کے ہاتھوں میں ملک وملت کی قیادت ہے، ایسی حرکت کا صدور نہایت ہی افسوس ناک اور باعث شرم ہے!

اس سے اگر کوئی صورت مستثنیٰ ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اس کا مقصود مجرمین کو گرفت میں لانا اور ملک وقوم کو خطرات سے بچانا ہو؛ کیوں کہ انفرادی مضرت کے مقابلہ میں اجتماعی مضرت کی اہمیت زیادہ ہے، اس پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے جس میں غزوۂ بدر کے موقع سے حضور ﷺ کے حکم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مشکوک عورت کو پکڑا تھا، جس نے اپنے بال میں اہل مکہ کے نام ایک ایسا خط چھپا رکھا تھا جس سے مسلمانوں کے بعض فوجی راز کا افشاء ہوتا تھا، حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی باندی خط دینے کو تیار نہیں تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے آسانی سے تحریر حوالہ نہیں کی اور اس کے حاصل کرنے کے لیے تمہیں بے لباس کرنا پڑا تو میں اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا، چار و نا چار اس نے خط حوالہ کیا، —— اس سے معلوم ہوا کہ قومی سلامتی اور اجتماعی مفاد کے لیے تجسس سے کام لیا جاسکتا ہے اور جب جسم کے قابل ستر حصہ کا دیکھنا اس کے لیے جائز ہے تو باتوں کا سننا اور ان کو ٹیپ رکارڈ کے ذریعہ محفوظ کرنا بدرجۂ اولیٰ درست ہوگا۔

اپنی راز کی باتوں کو چھپانے کا اور غیر معمولی حالات میں سلامتی سے متعلق اداروں کے اس میں دخیل ہونے کا حکم بلا کسی امتیاز سبھوں کے لیے ہے، اس میں حاکم اور محکوم، حکومت اور رعایا، لیڈر اور عوام، اور اکثریت اور اقلیت کے درمیان فرق کرنا اور دوہرا برتاؤ روا رکھنا درست نہیں؛ لیکن افسوس کہ ہمارے ملک میں اس پہلو سے بھی امتیاز وتفریق کی روش اختیار کی جاتی ہے، حزب اقتدار حزب اختلاف کو کمزور کرنے اور اپنے اقتدار کو مستحکم رکھنے کی غرض سے اس ہتھیار کا استعمال کرتا ہے، اسی طرح اقلیتی طبقہ کی معتبر اور خالص مذہبی شخصیتوں کے بارے میں بھی یہ طریقہ اپنایا جاتا ہے، ایسے بدنیت اور قانون شکن لوگ ملک وقوم کو بے آبرو کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں، اور ان کی وجہ سے سماج اخلاقی پستی کا شکار ہوتا جارہا ہے، حضرت معاویہ

ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ اگر تم لوگوں کے راز اور مخفی باتوں کے پیچھے پڑو گے تو انہیں بگاڑ میں مبتلا کر دو گے ’’إنک إن اتبعت عورات الناس أفسدتھم أو کدت أن تفسدھم‘‘۔(ابوداؤد:۴۸۸۸)

۲۷/جنوری ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

نکاح کا رجسٹریشن — جائزہ اور تجویز

خدا نے انسان کی فطرت میں انس و محبت رکھا ہے، وہ خود محبت کا پیکر ہے اور دوسروں کی محبت کا بھوکا، اسی لئے انسان کو قدرت نے ایک وسیع خاندان عطا کیا ہے، جس میں اس کا دادیہال بھی ہے، نانیہال بھی ہے اور سسرال بھی، یہ تمام رشتے بنیادی طور پر نکاح ہی کی دَین ہیں، دادیہال اور نانیہال ماں باپ کے نکاح سے وجود میں آتا ہے اور سسرال خود اس کے نکاح سے، اس لئے اسلام میں نکاح کی خاص اہمیت ہے، اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور تجرد کی زندگی سے منع کیا گیا ہے، قرآن مجید میں نکاح سے متعلق مضامین اتنی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں کہ نماز کے احکام بھی اتنی تفصیل سے وارد نہیں ہوئے، یہاں تک کہ ہمارے فقہاء نے شادی شدہ زندگی گزارنے کو نفل عبادت کی کثرت سے بھی بہتر قرار دیا ہے۔

شریعتِ اسلامی میں نکاح بنیادی طور پر ایک معاہدہ ہے، جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے اور زندگی کے سرد و گرم میں ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کو نباہنے کا عدہ کرتے ہیں، اسی لئے جیسے تمام معاہدات ایجاب و قبول کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، نکاح بھی ایجاب و قبول کے ذریعہ ہی منعقد ہوتا ہے، ایجاب سے مراد ہے ایک فریق کی طرف سے کسی معاملہ کی پیش کشی، اور قبول سے مراد ہے دوسرے شخص کی طرف سے اس پیشکش کو تسلیم کر لینا اور فریقین کا اس پر راضی ہو جانا، البتہ نکاح میں معاہدہ ہونے کے ساتھ ساتھ تقدس کا پہلو بھی ہے؛ کیوں کہ اس سے نسل انسانی کی بقا متعلق ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کی مبارک سنت ہے اور اس میں عزت و آبرو کی حفاظت اور گناہ سے بچاؤ بھی ہے، اسی لئے یہ ایک مقدس اور اہم ترین معاہدہ ہے، چنانچہ نکاح سے بعض ایسی شرائط اور آداب متعلق کئے گئے ہیں جو دوسرے معاہدات میں نہیں ہیں۔

جیسے نکاح میں مہر کو ضروری قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اگر عورت بغیر مہر کے نکاح

کرنے پر راضی ہوجائے، تب بھی مہر واجب ہوگا، اسی طرح عام معاملات میں گواہان کا ہونا مستحب تو ہے واجب نہیں، لیکن نکاح میں ایجاب وقبول کے وقت دو مسلمان مردوں اور مرد نہ ہوتو ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے، سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے لئے جو شرطیں نقل فرمائی ہیں، ان میں ایک یہی گواہان کا ہونا ہے، (اعلاء السنن :۱۱/۱۷، بحواله صحیح ابن حبان) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کا قول ہے کہ نکاح بغیر گواہان کے نہیں ہوسکتا ''لا نكاح إلا ببينة '' (ترمذی :۱۱۰۴) نیز نکاح کے مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ خطبہ ہو، نکاح اظہار واعلان کے ساتھ ہو اور اس میں دعوتِ ولیمہ کا اہتمام ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک معاہدات کو تحریر میں لانے کا تھا، صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ طے ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت علی ﷺ کو املا کرایا اور انھوں نے اسے لکھا، حدیث وسیرت کی بیشتر کتابوں میں اس کا ذکر ہے، اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور مدینہ تشریف لے گئے تو مسلمانوں اور یہودیوں کے قبائل کے درمیان کچھ اُصول پر معاہدہ ہوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ سب لوگ ایک دوسرے کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام کریں گے اور اپنے اپنے طریقہ پر زندگی گزاریں گے، البتہ اگر کوئی باہر سے حملہ آور ہوتو سب مل کر مدافعت کریں گے، اس معاہدہ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور تمام قبائل کے نمائندوں سے اس پر دستخط لیا، یہ معاہدہ میثاقِ مدینہ کہلاتا ہے، جو ۵۲ دفعات پر مشتمل تھا، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدے لکھوائے ہیں، ان کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ (دیکھئے: ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضراتِ حدیث: ۲۷۳)

معاہدات اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کے بھی ہوتے ہیں کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ اجتماعی حیثیت میں کوئی معاملہ طے کرے، اور معاہدات شخصی اور انفرادی بھی ہوتے ہیں کہ فرد فرد کے ساتھ معاہدہ کرے، جیسے خرید وفروخت، ہبہ، وغیرہ، ایسے معاہدات کو لکھنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

خرید وفروخت کے معاہدہ کوتحریر میں لانے کا ذکر آیا ہے، ایسے ہی انفرادی اور شخصی معاملات کے بارے میں خاص کر اس وقت جب اس معاہدہ سے متعلق کسی شئ کی ادائیگی باقی ہو، تحریر میں لے آنے کی قرآن مجید نے ترغیب دی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمىٰ فاكتبوه . (البقرہ:۲۸۲)

جب ایک متعین مدت کے لئے دَین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اسی لئے قضاء پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اہل علم نے ایک مستقل باب ''شروط'' کا قائم کیا ہے، ''شروط'' سے مراد دراصل یہی دستاویزات ہیں جو کسی معاملہ سے متعلق لکھی جاتی ہیں۔

اس پس منظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ معاہدۂ نکاح کو تحریر میں لانا مستحب ہے، اس کے ذریعہ نکاح کا ریکارڈ محفوظ ہوجاتا ہے، اگر خدانخواستہ زوجین میں سے کوئی نکاح کا انکار کردے، بچہ کے نسب کو مشکوک کرنے کی کوشش کی جائے، مہر کے سلسلہ میں نزاع پیدا ہو یا میراث کے مستحق ہونے اور نہ ہونے کی بابت کوئی اختلاف کھڑا ہو، تو نکاح کا لکھا ہوا دستاویز ان مواقع پر صحیح نتیجہ تک پہنچنے اور نزاع کو ختم کرنے میں معاون ہوسکتا ہے؛ اس لئے نکاح کا رجسٹریشن اور اس کو تحریر میں لے آنا شریعت کے مزاج ومذاق کے عین مطابق ہے۔

حکومتِ ہند اس وقت نکاح کے رجسٹریشن سے متعلق قانون لا رہی ہے، اس قانون کی رو سے اندازہ ہے کہ رجسٹریشن کو لازم قرار دیا جائے گا ، جہاں تک رجسٹریشن کی بات ہے تو مسلمان اس کے مخالف نہیں ہیں ، بلکہ ہندوستان کے بعض علاقوں خاص کر دکن اور بھوپال میں پہلے سے وقف بورڈ کے ذریعہ نکاح کے اندراج کا نہایت منضبط طریقہ موجود ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ائمۂ مساجد کے پاس نکاح کے رجسٹرات موجود ہوتے ہیں، لوگ ان رجسٹرات میں نکاح کی تفصیلات درج کراتے ہیں، لیکن یہ بات کہ نکاح کے ثبوت کے لئے تنہا رجسٹریشن ہی کو تسلیم کیا جائے اور اس کے بغیر نکاح کو معتبر نہیں سمجھا جائے، قطعاً نا قابل قبول ہے؛ کیوں کہ شریعت میں کسی امر کو ثابت کرنے کے اُصول

مقرر ہیں، اگر دو معتبر مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اپنے مشاہدہ یا خاندان اور محلّہ میں شہرت کی بنیاد پر نکاح کی گواہی دیں تو یہ نکاح کے ثابت ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے نکاح کے رجسٹریشن کو ثبوتِ نکاح کے لئے لازم قرار دینا اور جس نکاح کا رجسٹریشن نہیں ہوا اس کو غیر معتبر قرار دیا جانا درست نہیں ہے اور اس میں بہت سے مفاسد کا اندیشہ ہے۔

ہندوستان ایک بہت ہی وسیع ملک ہے، اس کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس ملک کی اکثریت دیہات وقریہ جات میں رہتی ہے، غربت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں حکومت کی انتظامیہ کی بھی رسائی نہیں ہے، خواندگی کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں شعور بھی کم ہے، ان حالات میں اگر نکاح کے رجسٹریشن کو اس طرح لازم قرار دیا جائے کہ اسی پر نکاح کی صحت موقوف ہو اور اس کے بغیر نکاح کو معتبر ہی نہ سمجھا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے ظلم وزیادتی کا راستہ کھل جائے گا، بعض خدا ناترس لوگ نکاح سے متعلق ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کریں گے، ورثاء کے ساتھ حق تلفی کی جائے گی اور حقیقی ورثہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا جائے گا، بہت سے میاں بیوی کے تعلق کو غیر قانونی تعلق قرار دے دیا جائے گا، اس لئے مغربی ممالک کے طرز پر نکاح کے رجسٹریشن کو نکاح کے معتبر ہونے کے لئے لازمی قرار دینا نہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے اور نہ ہندوستان کے موجودہ سماجی حالات سے ہم آہنگ۔

مغربی ممالک کا مزاج اور ہے، وہاں مرد وعورت کے تعلق کے لئے نکاح کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، غیر قانونی رشتوں سے وجود میں آنے والے بچوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب یہ ان کے یہاں باعثِ عار نہیں رہا، مردوں اور عورتوں کے حقوق کی تعیین میں اس درجہ عدمِ توازن ہے کہ لوگ نکاح کی ڈوری میں بندھنے سے بہتر اس بات کو سمجھتے ہیں کہ غیر قانونی طریقہ پر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاریں اور جب جی چاہے کسی اور سے آشنائی کرلیں، اس لئے وہاں کسی نکاح کا ثابت نہ ہونا کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں بنیادی طور پر ایسے اخلاق سوز اور حیا باختہ رویوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا، جس سے

مستقبل میں خاندانی نظام کے تار و پود بکھر کر رہ جائیں۔

اس لئے نکاح سے متعلق رجسٹریشن قوانین میں چند باتوں کی رعایت ضروری ہے :

(۱) جن مقامات پر وقف بورڈ کے ذریعہ نکاح خواں مقرر ہے، یا جہاں ائمۂ مساجد نکاح نامے جاری کرتے ہیں، وہاں ان کو قانونی طور پر تسلیم کیا جائے اور مختلف قوموں کے مذہبی اداروں کو نکاح کے رجسٹریشن کے لئے مجاز مانا جائے۔

(۲) رجسٹریشن قوانین میں مسلمانوں کے حق میں اسلامی قوانین کو بھی ملحوظ رکھا جائے ، جیسے محرماتِ نکاح ، گواہان کی موجودگی ، نابالغوں کے نکاح میں ولی کا موجود ہونا ، عاقدین کا مسلمان ہونا ، مہر کا ذکر وغیرہ ؛ کیوں کہ اس کی رعایت کے بغیر جو نکاح ہوگا ، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معتبر ہوگا۔

(۳) نکاح کے ثبوت کے لئے رجسٹریشن کو لازم قرار نہیں دیا جائے ؛ بلکہ اگر شرعی اُصولوں کے مطابق نکاح کا ثبوت مہیا ہو تو اسے معتبر تسلیم کیا جائے۔

(۴) نکاح کے رجسٹریشن کے نظام کو گاؤں گاؤں کی سطح تک پہنچایا جائے ، تاکہ رجسٹریشن کے لئے لوگوں کو گاؤں سے شہر تک آنا نہ پڑے اور جو لوگ نکاح کو رجسٹرڈ کرنے کے مجاز ہیں ، وہ لوگوں کا استحصال نہ کر سکیں اور ان سے من مانی فیس وصول نہیں کریں۔

(۵) رجسٹریشن کے لئے مہلت دی جائے ، یعنی اس بات کی گنجائش ہو کہ اگر عقد کے وقت رجسٹریشن نہیں ہو سکا ، تو ایک مخصوص مدت جیسے تین ماہ یا چھ ماہ کے اندر زوجین رجسٹرار کے پاس جا کر گواہان کے ساتھ اقرار کریں کہ ہم دونوں نے فلاں تاریخ کو فلاں

مقام پر فلاں فلاں گواہوں کے سامنے نکاح کی تمام شرطوں کی رعایت کرتے ہوئے آپس میں نکاح کرلیا ہے ، تاکہ جہاں رجسٹریشن کی سہولت موجود نہیں ہے، وہاں کے لوگوں کو دقت نہ ہو۔

(۶) رجسٹریشن کی فیس بہت ہی معمولی ہونی چاہئے جس کا ادا کرنا عام لوگوں کے لئے بھی دشواری اور زیرباری کا باعث نہ ہو۔

یہ نکات جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اہم ہیں ، وہیں ہندوستان کے سماجی حالات اور ذرائع و وسائل کے اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں، اگر ان کی رعایت نہ کی جائے اور نکاح کے رجسٹریشن کو لازمی قرار دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اس سے فائدہ کم ہوگا اور نقصان زیادہ۔

۲۴؍مارچ ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

معالج — مقام اور ذمہ داریاں

یکم جولائی کی تاریخ گذر چکی ہے، اس تاریخ کو ''ڈاکٹر ڈے'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، کسی بھی سماج میں ڈاکٹر اور معالج کی خاص اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں ایسا وجود عطا کیا ہے جس میں خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور مجبوریوں کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، انسان کی طاقت وقوت کا حال یہ ہے کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور طاقتور سے طاقتور ترین مخلوق بھی انسان کی قوتِ تسخیر کی اسیر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوری اور ناطاقتی کا حال یہ ہے کہ معمولی کیڑے مکوڑے بھی اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، ایک بالشت کا سانپ بھی اس کی جان لے سکتا ہے اور بیماریاں اسے آسانی سے بچھاڑ سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں زہر کے ساتھ ساتھ اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا ہے اور بیماریوں کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے، ''ما خلق الله داءً إلا خلق له الدواء'' (مجمع الزوائد: ۸۴/۵)، اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور تجربہ کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے دواؤں کو دریافت کرے، اس کام کو میڈیکل سائنٹسٹ اور ڈاکٹرس انجام دیتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی خدمات نہایت اہم ہیں، بھوکے کو کھانا کھلانا، محتاج کو کپڑے پہنانا، معذور کے کام میں ہاتھ بٹانا اور ضرورت مند کی حاجت پوری کرنا یہ سب مخلوق کی خدمت ہے، لیکن انسان سب سے زیادہ خدمت کا محتاج اس وقت ہوتا ہے جب وہ مریض ہو، بیماری انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ کھانا موجود ہونے کے باوجود وہ کھا نہیں سکتا، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، لیکن وہ ایک قدم چل نہیں سکتا اور تیمارداری اور مددگاروں کے رحم وکرم کا محتاج ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے مریض کی عیادت اور تیمار داری کو بے حد اجر کا باعث قرار دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تک ایک شخص مریض کی عیادت میں رہتا ہے گویا وہ جنت کے باغ میں ہے (مسلم:۶۵۵۱)، اس طرح ڈاکٹر گویا اپنی ڈیوٹی کے پورے وقت اس حدیث کا مصداق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے اور کون ہے جو انسانوں کے لئے ڈاکٹر اور معالج سے بڑھ کر نافع ہو؟ اس طرح گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ڈاکٹر کو ''خیر الناس ''(بہترین انسان) کا ایوارڈ ملا ہے، ان سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہوسکتا ہے، فن طب کی اسی اہمیت کی وجہ سے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں: فقہ، کہ زندگی گذارنے کا طریقہ معلوم ہو اور طب تا کہ جسم انسانی کی اصلاح پر قدرت ہو سکے، ''**العلم علمان : الفقه للادیان وعلم الطب للابدان** ''۔(مفتاح السعادۃ:۱/۲۶۷)

واقعہ ہے کہ یہ گروہ انسانیت کا سب سے بڑا محسن ہے اور اس نسبت سے ان کی توقیر و تکریم سماج کا فریضہ ہے، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ علاج سے جلدی فائدہ نہیں ہوا، یا مریض کی موت واقع ہوئی تو لوگ ڈاکٹر سے اُلجھ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اس کی جان کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں، یہ غیر سنجیدہ طرزِ عمل ہے، اس لئے کہ علاج تو انسان کے اختیار میں ہے، لیکن صحت وشفا خدا کی مشیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ''**وإذا مرضت وهو یشفین** ''(شعراء:۸۰)، زندگی کو بچانے کا مکلّف قرار دینا اس پر اس کی صلاحیت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

جو شخص جس مقام کا حامل ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، اس لئے ڈاکٹر اور معالج حضرات کو اپنی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دینی چاہئے، ڈاکٹر کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیشہ میں خدمت کے پہلو کو مقدم رکھے، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مریضوں کا مفت علاج کریں اور اپنے گھر سے دوائیں لا کر کھلا دیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس

پیشہ کو محض تجارت اور بزنس نہ بنادیا جائے اور اجرت کے ساتھ ساتھ اجر کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے ، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تعلیم اور علاج نے ایک زبردست کاروبار کی صورت اختیار کرلی ہے اور معاشی کشش کی وجہ سے بہت سے ہوٹل ، ہاسپٹل میں تبدیل ہوگئے ہیں ، ڈاکٹروں کی فیس مریض کے لئے ناقابل برداشت بوجھ بن گئی ہے ، پھر فیس کے سلسلے میں بھی ایک نئی روایت یہ قائم ہورہی ہے کہ مریض جتنی بار مشورے کے لئے جائے ہر بار فیس ادا کرے ، اس طرح بعض اوقات ہر ہفتہ ڈاکٹر زفیس وصول کرلیتے ہیں ، پھر آمدنی کے بالواسطہ ذرائع بھی پیدا کرلئے گئے ہیں ، دوائیں لکھی جاتی ہیں اور مخصوص و متعین دوکانوں سے دوا خرید کرنے کو کہا جاتا ہے ، تاکہ ان سے کمیشن مل سکے ، مریض پر بوجھ ڈالنے اور اپنی جیب بھرنے کے لئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو دوائیں پہلے لکھی گئی تھیں ابھی وہ ختم بھی نہیں ہوئی کہ دوا تبدیل کردی جاتی ہے اور اسی فارمولہ کی دوسری دوا ، جس کا نام کمپنی بدل جانے کی وجہ سے بدلا ہوا ہوتا ہے ، لکھ دی جاتی ہے ، بیچارے مریض کو ڈاکٹر صاحب کی اس ہوشیاری کی خبر بھی نہیں ہوتی ، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جتنی دوا مطلوب ہے اس سے زیادہ لکھ دی گئی اور چند دنوں میں نسخہ بدل دیا گیا اور زائد دوائیں بیکار ہوگئیں ، یہ بھی ہوتا ہے کہ نقلی دوائیں دی جاتی ہیں اور معیاری دواؤں کی قیمت وصول کی جاتی ہے ۔

امراض کے ٹسٹ کا معاملہ تو سب سے سوا ہے ، بے مقصد ٹسٹ کرائے جاتے ہیں ، مریض نے اگر کسی دوسرے ڈاکٹر سے ٹسٹ کرایا ہو تو چاہے وہ رپورٹ دن ، دو دن پہلے ہی کی کیوں نہ ہو ، لیکن نیا ڈاکٹر پھر سے پورے ٹسٹ کراتا ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر نے جس پیتھالوجسٹ کا مشورہ دیا ہے اسی کے یہاں ٹسٹ کرایا جائے ، ان اقدامات میں مخلصانہ جستجو و تحقیق کا جذبہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ، اکثر اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ کمانا اور اپنی جیب بھرنا ہوتا ہے ، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر یا کسی خاص ہاسپٹل کو مریض ریفر (Refer) کرتا ہے ، یہ تمام صورتیں اگر مریض کی بھلائی کے جذبہ سے ہوں تب تو ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ، لیکن افسوس کہ ان سب کا مقصد کمیشن کھانا ہوتا ہے ، دواؤں پر

کمیشن ، ٹسٹ پر کمیشن ، مریض کے بھیجنے پر کمیشن اور جہاں جہاں ممکن ہو وہاں سے کمیشن کا حصول، ان کمیشنوں اور ان کی بڑھتی ہوئی شرحوں نے مریض کی کمر توڑ دی ہے اور غریب لوگوں کے لئے ہاسپٹل جانے کا تصور بھی ایک بوجھ ہوتا ہے، یہ کمیشن فقہی اعتبار سے رشوت ہے، اس کا لینا حرام ہے اور اس میں واسطہ بننا بھی حرام ہے۔

حکومت کی طرف سے اس بات پر پابندی ہے کہ سرکاری ہاسپٹلوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر الگ سے اپنے نرسنگ ہوم چلائیں، لیکن جسے خدا کا خوف نہ ہو اس کے قدم کون تھام سکتا ہے؟ چنانچہ عام طور پر سرکاری ڈاکٹرز بھی فرضی ناموں سے نرسنگ ہوم چلاتے ہیں، جو مریض سرکاری ہاسپٹل میں آتا ہے، اسے بے توجہی سے دیکھتے ہیں اور صراحتاً یا اشارتاً انھیں نرسنگ ہوم میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے، یا عملی طور پر انھیں اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے؛ تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ پیسے اینٹھے جاسکیں، اس عمل میں جھوٹ بھی ہے اور دھوکہ بھی اور بعض دفعہ پریکٹس نہ کرنے کا الاونس بھی دیا جاتا ہے، لہٰذا اب اس کے باوجود پیسے لے کر پرائیوٹ پریکٹس حرام طریقہ پر مال حاصل کرنے کی مجرمانہ کوشش بھی ہے اور یہ قرآن کے اس ارشاد کہ، باطل طریقے پر مال نہ کھاؤ، کے قطعاً مغایر ہے،'' **ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل**''۔(بقرہ:۱۸۸)

اسی طرح ایک نئی صورتِ حال یہ ہے کہ جن امراض کا علاج دواؤں کے ذریعہ ممکن ہے، ان میں بھی آپریشن کا مشورہ دیا جاتا ہے، تا کہ علاج گراں بار ہو اور مریض کی یہ گرانی معالج کے لئے ارزانی کا باعث ہے، خاص کر ولادت کے کیس میں کثرت سے اس طرح کی بات پیش آتی ہے اور آپریشن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ زچگی کرائی جاتی ہے اور حکومت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، کیوں کہ یہ بالواسطہ فیملی پلاننگ کو بروئے کار لانا ہے، اسی طرح مریض کی موت کے باوجود اسے مصنوعی آلۂ تنفس پر رکھا جاتا ہے، تا کہ بل بڑھتا رہے، یہ کس درجہ ناشائستہ طریقہ ہے۔

ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ آپریشن کی میز پر پیٹ چیرنے کے بعد ڈاکٹر کی

طرف سے نیا مطالبہ سامنے آتا ہے اور مریض اور اس کے متعلقین اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ تمام صورتیں شرعاً ناجائز اور گناہ ہیں، اور اکثر صورتوں میں آمدنی بھی حرام ہے، افسوس کہ بہت سے دیندار لوگ بھی اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان گناہوں میں مبتلا ہیں، ڈاکٹر کے لئے صرف اس کی تنخواہ اور پرائیوٹ علاج کی صورت میں اس کی فیس، نیز مریض کو اس نے جو دوائیں دی ہیں، ان کی معروف اور مروجہ قیمت ہی جائز ہے۔

معالج کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنے فن کو باضابطہ طور پر پڑھا ہو، محض چند سنی سنائی باتوں پر علاج شروع کر دینا درست نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے طب کا علم حاصل نہ کیا ہو، وہ علاج کرے تو وہ نقصان کا ضامن ہوگا، **من تطب ولم یعلم منه قبل ذلک الطب فهو ضامن** (ابوداؤد:۶۳۰/۲)، اسی لئے فقہاء نے ایسے طبیبوں پر پابندی لگانے کا حکم دیا ہے (بدائع الصنائع:۱۶۹/۷)، ناواقف طبیب سے مراد وہ شخص ہے جس میں بیماری اور اس کی دوا کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، دواؤں کے اثرات سے واقف نہ ہو، نیز دوائیں دے دیتا ہو اور اس کے ری ایکشن کو روکنے والی دواؤں کا علم نہ رکھتا ہو، **یسقی الناس دواء مهلکا ولا یقدر علی ازالة ضرر دواء اشتد تاثیره علی المرضی**، (الفقہ الاسلامی وادلتہ :۴۴۹/۵)، لہٰذا ایسے ناواقف اور کوتاہ علم طبیب کی کوتاہیاں قابل ضمان ہوں گی اور ان کو سزا دی جائے گی، یہ سزا جسمانی سرزنش بھی ہوسکتی ہے، قید بھی اور خوں بہا بھی۔ (بدایۃ المجتہد :۲۳۳/۲)

جو معالج تعلیم یافتہ ہو، لیکن اس نے علاج میں کوتاہی سے کام لیا ہو، مناسب تحقیق نہیں کی ہو اور اس کی اس کوتاہی کی بنا پر مریض کو نقصان پہنچا ہو تب بھی وہ ذمہ دار ہوگا اور اس سے ہرجانہ وصول کیا جائے گا، ہاں اگر اس نے فن طب کو پڑھا بھی ہو اور اُصول کے مطابق علاج بھی کیا ہو، لیکن اس کے باوجود مریض کو صحت نہیں ہوسکی یا اس کا مرض اور بگڑ گیا، تو اب وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا، چنانچہ مشہور فقیہ علامہ دردیر فرماتے ہیں: **إذا عالج طبیب عارف ومات المریض عن علاجه المطلوب فلا شئ علیه** (سیر صغیر:۲۲۰/۴)، افسوس کہ آج کل علاج کی ایسی سنگین کوتاہیاں سامنے آتی ہیں کہ بعض دفعہ تو سرجن قینچی اور چھری بھی مریض کے جسم میں

بھول جاتا ہے، ایسے غفلت شعار ڈاکٹر انسانیت کے خادم نہیں ہادم ہیں اور وہ سماج کے لئے رحمت کے بجائے زحمت ہیں، غرض کہ طب وعلاج کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور معالج انسانی خدمت کے اعتبار سے سب سے اہم ذمہ داری انجام دیتا ہے، وہ اپنے پیشے میں اُجرت کے ساتھ ساتھ اجر اور دنیا کے نفع کے ساتھ ساتھ آخرت کے نفع کو بھی پاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس پیشہ کو محض تجارت کے طور پر اختیار نہ کرے، بلکہ اس میں خدمت کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھے اور جھوٹ، دھوکہ اور حرام طریقہ پر کسبِ معاش سے اپنے دامن کو بچائے۔

۷؍ جولائی ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

بم دھماکے — اسلامی نقطۂ نظر

بم دھماکوں کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں، جہاز اور ٹرین میں تو دھماکے ہوہی رہے تھے، اب عبادت گاہیں بھی ان کا نشانہ بن رہی ہیں، عبادت گاہ خواہ کسی قوم کی ہو، اس کا بنیادی مقصد ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کی بندگی کرنا ہوتا ہے، ایسی جگہوں کی بے احترامی سے گذر کر وہاں آنے والوں پر جان لیوا حملے کرنا یقیناً انسانیت سوز عمل ہے، حملہ چاہے اکثر ادھام مندر پر ہو یا دہلی کی جامع مسجد اور مالیگاؤں کی نورانی مسجد پر، بہر صورت نہایت قابل مذمت اور افسوسناک ہے، اور جس کسی نے بھی اس جرم کا ارتکاب کیا ہو، وہ نہ صرف قتل انسانی کا مجرم ہے بلکہ اخلاق، شرافت اور مسلمہ انسانی قدروں کا قاتل بھی ہے۔

مسجدیں تو ہمارے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کا گھر اور خدائے واحد کی عبادت کا مرکز ہیں، اس لئے ان کی جو عظمت و تقدیس ایک مسلمان کی نظر میں ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، لیکن انسانی جذبات کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کو بھی پسند نہیں کیا ہے، چنانچہ قرآن نے مذمت کے لہجہ میں عبادت گاہوں کے انہدام کا ذکر کرتے ہوئے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہ کا ذکر کیا ہے، پھر مسجد کا: ''**ولو لا دفع الله الناس بعضهم لهدمت صوامع و بيع وصلوات و مسجد يذكر فيها اسم الله كثيراً** ''(الحج: ۴۰)، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غیر مسلم قبائل سے جو معاہدہ امن فرمایا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کی عبادت گاہیں نہیں ڈھائی جائیں گی اور ان کے مذہبی پیشوا وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ **ان لا تهدم لهم بيعة ولا يخرج لهم قس**. (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱)

حالت امن کی تو بات ہی اور ہے، حالت جنگ میں بھی صحابہ ﷺ کو جن باتوں کی

تلقین کی جاتی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم فوج بھیجتے وقت جو ہدایات دیتے، ان میں ایک یہ بھی ہوتی کہ مذہبی پیشواؤں اور عبادت گاہوں کے خادموں کو قتل نہ کیا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج روانہ کرتے وقت یہ ہدایات دیتے :

> تم لوگ اللہ کے نام سے نکلو، ایمان نہ لانے والوں سے اللہ ہی کے لئے جہاد کرو، دھوکہ نہ دو، خیانت نہ کرو، کسی کو مثلہ نہ کرو، بچوں کو اور چرچ والوں کو قتل نہ کرو۔ (مجمع الزوائد: ۳۱۶/۵، بحوالہ مسند احمد وغیرہ)

اس سے اسلام کی فراخدلی، وسیع القلبی اور کشادہ چشمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عین جنگ کے وقت جب اکثر قانون کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور یہ بھی اس زمانہ میں جب قوموں کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں تھا اور نہ جنگ کے کسی قانون پر حکومتوں نے دستخط کئے تھے، یک طرفہ طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہذب قوانین جنگ انسانیت کو دیا اور دوسرے قوموں کے مذہبی جذبات کو ملحوظ رکھا۔

بم دھماکوں کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو جاننے کے لئے چند اُمور کو ملحوظ رکھنا چاہئے :

(۱) ان دھماکوں میں صرف قصور وار اور مجرمین کی جانیں نہیں جاتیں بلکہ بے قصور لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

(۲) ان دھماکوں میں بوڑھے، بچے، عورتیں بھی نشانہ بنتے ہیں۔

(۳) مہلوکین کی جانیں اس طرح جاتی ہیں کہ ان کے جسم کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، بعض دفعہ تو سر ایسا غائب ہوتا ہے کہ بغیر سر کے آخری رسوم انجام دی جاتی ہیں۔

(۴) یہ بنیادی طور پر آتشیں ہتھیار ہے، اسی لئے دھماکہ کا شکار ہونے والوں کے چہرے جھلس جاتے ہیں، بلکہ پورا جسم ہی، بارود وغیرہ سے بنیادی طور پر آگ پیدا ہوتی ہے اور یہی آگ دوسرے مہلک مادوں کو لے کر پوری طاقت کے ساتھ اپنے ماحول میں بکھر جاتی ہے اور جہاں تک پہنچتی ہے آفت ڈھاتی چلی جاتی ہے۔

اب آیئے ان نکات کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر سے غور کریں۔

(۱) حالتِ امن میں شریعت کا اُصول واضح ہے کہ جو شخص مجرم نہ ہو اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں، کیوں کہ ایک کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں، '' لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ '' بلکہ ممکن حد تک میدانِ جنگ میں بھی اس کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، عرب میں لوگ مزدوروں اور غلاموں کو پکڑ لیتے تھے اور زبردستی اپنے ساتھ جنگ میں لے جاتے تھے، ان کی رضامندی شامل نہیں ہوتی تھی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدوروں اور غلاموں کو بھی جنگ میں نشانہ بنانے سے منع فرمایا۔ نھانا ان نقتل العسفاء والوصفاء . (مجمع الزوائد عن ایوب: ۳۱۵/۵، بحوالہ مسند احمد)

(۲) بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو عام حالات میں تو کجا؟ حالت جنگ میں بھی نشانہ بنانے سے منع کیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بہ سند صحیح منقول ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا (مجمع الزوائد: ۳۱۶/۵)، اسی مضمون کی روایت حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سے بھی منقول ہے (حوالۂ سابق: ۳۱۵/۵)، ایک اور روایت میں بوڑھوں کا ذکر بھی ہے اور اس کے راوی بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں (حوالۂ سابق: ۳۱۷/۵)، بعض جنگوں میں آپ ﷺ نے خواتین کی لاش دیکھی تو اس پر سخت ناگواری کا اظہار فرمایا (دیکھئے: حوالۂ سابق: ۳۱۶/۵)، جب حالت جنگ میں بوڑھوں، خواتین اور بچوں کی یہ رعایت ہے تو معتدل حالات میں میں کیوں کر ایسے اقدام کا جواز ہوسکتا ہے، جس میں ان کمزوروں کی جانیں جائیں؟

(۳) حدیث میں بار بار مثلہ سے منع کیا گیا ہے، یہ ممانعت عام حالات میں تو ہے ہی، جنگ میں بھی اس کو خاص طور پر منع فرمایا گیا، کیوں کہ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب اپنے دشمنوں پر فتح پاتے تو نہ صرف ان کو قتل کرتے بلکہ نہایت ایذا رسانی سے ان کی جان لیتے اور پھر ان کو مثلہ بھی کرتے، ناک کاٹ دیتے، آنکھیں نکال لیتے، کان کاٹ دیتے، یہاں تک کہ مقتول کی کھوپڑی میں شراب پی کر اپنی بڑائی اور قوت کا اظہار کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غیر انسانی حرکت کو نہایت شدت سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر کوئی شخص قتل کا مستحق ہو، تو

اسے بہتر طریقہ پر قتل کرو، یعنی ایذا نہ پہنچاؤ اور مثلہ نہ کرو، جنگ کے موقع پر آپ ﷺ نے جو ہدایات دی ہیں، ان میں کثرت سے مثلہ کی ممانعت کا ذکر موجود ہے (دیکھئے: باب ما نہی عن قتلہ من النار وغیر ذالک، مجمع الزوائد: ۵/۱۸-۳۱۵)، بلکہ اگر کسی شخص نے کسی بے قصور کو قتل کرتے وقت ایذا رسانی اور مثلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہو، تب بھی حکم ہے کہ جب بدلہ میں اسے قتل کیا جائے، تو سیدھا تلوار سے قتل کر دیا جائے، **لا قود إلا بالسیف** (ابن ماجہ، عن نعمان بن بشیر)، دھماکہ کے ذریعہ انسانی جسم کا جو حشر ہوتا ہے، وہ یقیناً مثلہ کی بدترین صورت ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان یا حیوان کو آگ میں جلانے کی سزا دے، کیوں کہ یہ سزا دینا اللہ ہی کے شایانِ شان ہے، **فإنہ لا یعذب بالنار الا رب النار** (سنن ابوداؤد)، بلکہ آپ ﷺ نے تو کھیتیوں کو بھی جلانے سے منع فرمایا (مجمع الزوائد عن ثوبان: ۵/۳۱۷)، اور بم بنیادی طور پر آتش گیر ہتھیار ہے۔

اس لئے شرعی نقطۂ نظر سے بم دھماکہ جنگ کے علاوہ عام حالات میں کرنا کسی طرح درست نہیں، اس طرح کے دھماکوں کو ایشیاء میں دراصل یہودی دہشت گردوں نے رواج دیا، جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں بڑے پیمانے پر فلسطین میں بم دھماکے کئے، مسلمانوں اور عیسائیوں کو اس کا نشانہ بنایا اور اب یہ انتقام واحتجاج کا ایک اندھا ہتھیار ہو گیا ہے، فلسطین جیسے ملک میں تو مظلوموں کے لئے یہی واحد ہتھیار رہے، کیوں کہ وہاں یہودی غاصبین ظالمانہ طور پر قابض ہیں اور وہ بے دریغ فلسطینی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا قتل عام کر رہے ہیں، لیکن جن جمہوری ممالک میں دستوری معاہدہ کی بنیاد پر مختلف قومیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتی ہیں اور وہاں احتجاج اور حصول انصاف کے جائز راستے کھلے ہوئے ہیں وہاں ایسے دھماکوں کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس کو نقصان پہنچایا تو میں اس کی طرف سے قیامت کے دن فریق بن کر کھڑا ہوں گا۔

الا من ظلم معاهداً أو أنقض ...... فأنا حجيجه يوم القيامة .

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۲)

البتہ ہماری حکومت کے لئے دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ کسی شخص کو ثبوت وشواہد کے بغیر مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دینا کھلی ہوئی ناانصافی ہے، مسلمانوں پر ظلم روا رکھا جاتا ہے، خود حکومت کے قائم کئے ہوئے کمیشن فرقہ پرست تنظیموں اور پولیس عہدیداروں کو قصوروار ٹھہراتی ہیں، لیکن ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا اور اگر اکثریت کو کہیں کوئی نقصان پہنچے تو بلا ثبوت مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے، حالاں کہ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے فرقہ پرستوں نے ان کے خلاف سازش رچی ہے۔

دوسرے: مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان پر جو ظلم وستم ہوتا ہے اس پر ظالموں کے ہاتھ تھامے نہیں جاتے، نہ پولیس انھیں انصاف دیتی ہے، نہ عدالتیں ان کو انصاف دینے کے لئے حرکت میں آتی ہیں، بھاگلپور، مرادآباد اور گجرات کے قتل عام کو عرصہ ہو گیا، لیکن کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں کی گئی، بلکہ شقی القلب عہدیداروں کو ترقیوں سے نوازا گیا، لیکن جب مسلمانوں پر کوئی الزام آتا ہے، تو نہایت برق رفتاری کے ساتھ اس کی تحقیق کی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض بے قصور لوگوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے، جب تک یہ ناانصافی اور دو نظری ختم نہیں ہوگی ملک میں حقیقی امن وآشتی قائم نہ ہو سکے گی۔

بہر حال! مسلمان ایک داعی اُمت ہیں اور انھیں خدا نے انسانیت کے لئے رہبر بنا کر بھیجا ہے، اس لئے ان کا فریضہ ہے کہ حالات کتنے ہی دشوار، صبر آزما، حوصلہ شکن اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والے کیوں نہ ہوں، لیکن وہ اپنے آپ کو شریعت کی حدود میں رکھیں، کہ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔

۱۵؍ستمبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

رؤیتِ ہلال کا مسئلہ — کچھ مخلصانہ مشورے

سورج اور چاند اللہ کی دو بڑی نشانیاں ہیں، یہ صرف ہمیں روشنی کی سوغات ہی نہیں پہنچاتے ہیں اور شاعروں کے لئے محبوب کے رُخ روشن کی تشبیہ کا سامان ہی نہیں ہیں، بلکہ زمین اور سیاروں کے باہمی رابطہ اور گردش کے نظام ہی سے زمین پر رونما ہونے والے موسم بھی متعلق ہیں، سردی ہو، گرمی ہو یا برسات ہو، ان میں ظاہری سبب کے درجہ میں سورج سے زمین کی قربت اور بُعد کو بھی دخل ہے، اسی طرح انھیں کے ذریعہ سال، مہینہ اور دنوں کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے اور اوقات اور تاریخیں وجود میں آتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ چاند اور سورج تمہارے لئے اوقات کے حساب کا ذریعہ ہیں "**الشمس و القمر بحسبان**"۔(الرحمٰن:۵)

سورج کا نکلنا اور ڈوبنا ہر دن ایک ہی کیفیت اور حجم کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے عام لوگ اس کے ذریعہ مہینہ کی آمد و رفت اور تاریخ کی تبدیلی کو نہیں جان سکتے، چاند کے طلوع وغروب کا نظام قدرت کی جانب سے ایسا رکھا گیا ہے کہ وہ ایک باریک دائرہ کی شکل میں طلوع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ کو اپنا سفر مکمل کرتے ہوئے پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا حسنِ بے مثال، عاشق کا دل اور شاعر کی قوت خیال ہی میں نہیں، سمندر کی موجوں میں بھی تلاطم پیدا کر دیتا ہے، پھر اس کے بعد چاند کا زوال شروع ہوتا ہے، اور گھٹتے گھٹتے ۲۷، ۲۸ تاریخ تک بالکل ہی ڈوب جاتا ہے، اسی کمی بیشی اور اُتار چڑھاؤ سے تاریخیں معلوم ہوتی ہیں اور ایک عام سے عام آدمی بھی اس کے ذریعہ مہینہ کی آمد و رفت سے واقف ہوسکتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے خاص طور پر چاند کے بارے میں کہا ہے کہ اس کا بڑھنا اور گھٹنا تاریخ اور اوقات کے جاننے کا وسیلہ ہے "**قل هی مواقیت للناس و الحج**"۔(البقرہ:۱۸۹)

اسلام ایک سادہ مذہب ہے اور اس کی تمام تعلیمات اسی سادگی اور معقولیت کی عکاس

ہیں، اسی لئے اسلام نے شرعی احکام کو چاند کے کلنڈر سے متعلق کیا، روزہ ہو یا عید الفطر یا عید الاضحیٰ وغیرہ، سب قمری تاریخوں سے متعلق ہیں؛ کیوں کہ ان سے آگاہ ہونا ہر عام وخاص کے لئے آسان ہے، اس میں ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے، خوشی کی کوئی بات اگر اچانک حاصل ہو، تو خوشی دوبالا ہو جاتی ہے اور اگر پہلے سے ایک وقت مقرر ہو، تو مسرت وشادمانی کی وہ غیر معمولی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ، برسات میں بارش ایک معمول کی چیز ہے، لیکن اگر گرما میں بارش ہو جائے ، تو مسرت کا ٹھکانہ نہیں ہوتا ، لوگ بارش کے استقبال کے لئے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں، اسی طرح ۲۹ ؍ تاریخ کو تذبذب اور انتظار کی ایک پُر شوق کیفیت ہوتی ہے، اب اگر ۲۹ کا چاند نکل آئے، تو ایک ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے، جس کا پہلے سے حاصل ہونا یقینی نہیں تھا، اس سے جو نفسیاتی نشاط پیدا ہوتا ہے، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ چاند ہر وقت فضا میں موجود ہوتا ہے، زمین کے چاند اور سورج کے درمیان آ جانے کی وجہ سے دو تین دنوں کے لئے چاند نظر نہیں آتا، پھر جونہی زمین گردش کرتے کرتے اپنا قدم آگے بڑھاتی ہے، چاند کے رُخِ زیبا سے تاریکی اور سیاہی کا گھونگھٹ اُٹھنے لگتا ہے؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے ہونے پر حکم کا مدار نہیں رکھا؛ بلکہ چاند کے دیکھے جانے کو معیار قرار دیا، اور ارشاد فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزہ کا سلسلہ ختم کرو'' صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته '' ۔(بخاری : عن أبی هريرةؓ ،حدیث نمبر:۱۹۰۹، باب قول النبیؐ : إذا رأيتم الهلال فصوموا وإذا رأيتموه فأفطروا)

پھر چوں کہ چاند کے نظر آنے میں غلطی بھی ہوسکتی ہے اور اس میں انسان کی نارسا آنکھوں کے خطاء کرنے کا بھی امکان ہے؛ اس لئے مطلع کے صاف ہونے اور نہ ہونے کے لحاظ سے اور روزہ و افطار کے سلسلہ میں احتیاطی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے تین علاحدہ صورتوں کے الگ الگ احکام مقرر کئے ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ مطلع صاف ہو، ابر آلود نہ ہو اس صورت میں عید کا چاند ہو یا رمضان کا، ضروری ہے کہ اتنے لوگوں نے چاند دیکھا ہو کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں 'خبر مستفیض' کہتے ہیں، ایسی

صورت میں محض دو چار آدمی کی اطلاع کافی نہیں، کیوں کہ مخلص اور نیک نیت لوگ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، (درمختار مع الرد:۲/۹۵) دوسری صورت یہ ہے کہ مطلع ابر آلود ہو اور عید الفطر کے چاند کا مسئلہ ہو تو کم سے کم دو معتبر آدمیوں کی گواہی ضروری ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ مطلع ابر آلود ہو اور رمضان المبارک کے چاند کا معاملہ ہو، اس صورت میں ایک معتبر آدمی کی خبر بھی کافی ہے، جس نے بچشم خود چاند دیکھا ہو، (قدوری:۴۹) معتبر شخص سے مراد ایسا عاقل و بالغ مسلمان شخص ہے جس کے بارے میں قاضی شریعت یا اس کے قائم مقام رؤیت ہلال کمیٹی کو غالب گمان ہو کہ اس نے اس سلسلہ میں سچی اطلاع دی ہوگی، **وإذا غلب علی الظن صدق الفاسق قبلت شهادته وحكم بها۔** (فتاویٰ ہندیہ:۱/۱۰۱)

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی تمام عبادتوں میں اجتماعیت کا رنگ ہے، اسی لئے پنج گانہ نمازیں جماعت کے ساتھ فرض کی گئیں، جمعہ میں پورے محلّہ کی ایک جماعت کی صورت پیدا کی گئی، عیدین میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں یکجا ہو جاتی ہیں، حج مسلمانوں کا بین الاقوامی اجتماع ہے، اس لئے عیدین میں ایک حد تک وحدت مطلوب ہے، یہ بات کہ ایک ہی علاقہ میں دو دو تین تین دن عید ہو مناسب طریقہ نہیں ہے، اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت متاثر ہوتی ہے، عید کی خوشیاں بے لطف ہو جاتی ہیں اور سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور جگ ہنسائی کی نوبت آتی ہے، ذرائع ابلاغ چوں کہ ایسے واقعات کی تاک میں رہتے ہیں، اس لئے وہ اسے اور نمایاں کرتے ہیں اور ایسے واقعات سے انتشار کو ہوا دینے اور اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے ایک خیال یہ ہے کہ فلکیاتی پیشین گوئی کی بنیاد پر چاند کا فیصلہ کیا جائے، گویا پہلے ہی سے عید و بقرعید اور آغازِ رمضان کی تاریخیں مقرر رہوں، ابھی حال میں امریکہ کی ایک مسلم تنظیم ''اسنا'' نے اسی نوعیت کی تجویز منظور کی ہے، لیکن ہمارے فقہاء کا نقطۂ نظر اس کے خلاف رہا ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور تمام ہی قابل ذکر فقہاء نے چاند کی رؤیت کے سلسلہ میں فلکیاتی ماہرین کے اقوال کو نا قابل اعتبار قرار

دیا ہے، صرف بعض شوافع جیسے علامہ سبکیؒ اور قاضی عبدالجبارؒ وغیرہ نے کچھ حدود و قیود کے ساتھ انھیں قابل توجہ سمجھا ہے، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اپنے رسالہ ''الغافل والوسنان علی أحکام ھلال رمضان'' میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، ایسی فنی تحقیقات کو احکام شریعت کے لئے معیار بنانا اس سادگی کے مغائر ہے جو احکام شریعت کے بنیادی امتیازات میں سے ہے، پھر جیسے سادہ طریقہ پر رؤیت میں غلطی کا امکان ہے، فنی اندازوں میں بھی اس کا احتمال موجود ہے، اس کے علاوہ چاند کا دیکھنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک سنت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر رجب، شعبان اور رمضان کے چاند دیکھنے کی تاکید فرمائی ہے، چاند دیکھنے کے موقع پر مستقل دُعاء سکھائی گئی ہے، جس میں برکت و سلامتی اور ایمان و اسلام کو اللہ سے مانگا جاتا ہے، عبادت کا انتظار بجائے خود عبادت ہے، آنکھوں کی رؤیت کی صورت میں لوگ عید اور روزہ کے لئے سراپا انتظار رہتے ہیں، یہ تمام باتیں فنی رؤیت کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتیں، اس لئے یہ رائے قابل قبول نہیں ہے، البتہ فلکیاتی تحقیق سے اس قدر فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے کہ جس تاریخ کو طلوع ہلال کا امکان نہ ہو، اس روز رؤیت کی شہادت کافی تحقیق کے بعد ہی قبول کی جائے اور جس دن فنی اعتبار سے طلوع ہلال کا امکان زیادہ ہو، اس دن معمولی خبر کا بھی اعتبار کرلیا جائے۔

عید میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک اور رجحان یہ ہے کہ پوری دنیا میں حرمین شریفین کی رؤیت کے مطابق عمل کیا جائے، چنانچہ امریکہ اور یورپ کے بعض ملکوں میں عربوں نے اور کچھ دوسرے مسلمانوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، برطانیہ میں کچھ لوگ سعودی عرب کے مطابق اور کچھ لوگ وہاں سے قریبی مسلمان ملک مراکش کی رؤیت پر عمل کرتے ہیں، خود ہندوستان میں کیرالہ کے مسلمانوں کا عمل سعودی عرب کی رؤیت پر ہے، غور کیا جائے تو یہ نقطۂ نظر نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے ہم آہنگ ہے اور نہ قانون فطرت سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُصول مقرر کردیا کہ ہر علاقہ کے لئے وہاں کی رؤیت معتبر ہوگی، چنانچہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک علاقہ میں رمضان پہلے شروع ہوگیا اور مدینہ

منورہ میں بعد میں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، (مسلم شریف ،حدیث نمبر:۲۵۲۸،کتاب الصیام ، باب بیان أن لکل بلد رؤیتھم الخ)
یہی بات عقل وفطرت کے مطابق ہے: کیوں کہ دنیا گول ہے اور پوری دنیا میں بیک وقت صبح و شام اور رات ودن کی یکسانیت پیدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ جس وقت سعودی عرب میں عید کی نماز ہو رہی ہو کہیں مغرب کی نماز پڑھی جا رہی ہو اور کہیں تہجد کا وقت ہو، اسی لئے فقہاء تقریباً اس بات پر متفق ہیں کہ مطلع کے مختلف ہونے کا اعتبار ہوگا، اگر دو جگہوں کا مطلع الگ الگ ہو تو ایک جگہ چاند نظر آجانے کی وجہ سے رمضان یا عید کا حکم دوسری جگہ نہیں ہوگا؛ حالاں کہ امام ابوحنیفہؒ کی اصل رائے اس سے مختلف ہے، لیکن فقہاء احناف میں بھی بعد کے اہل علم نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مطلع کے اختلاف کا اعتبار ہوگا، اور ایک جگہ چاند کا نظر آنا دوسری جگہ کے لئے معتبر نہ ہوگا۔ (دیکھئے: مراقی الفلاح وطحطاوی:۴۳۶،فتاویٰ تاتارخانیہ:۳/۳۵۵،تبیین الحقائق:۱/۳۲۱)

اس لئے یہ کوشش کہ پوری دنیا میں ایک ہی عید ہو یا مختلف ملکوں کی عید ایک ہی دن ہو، نہ شرعاً مطلوب ہے نہ عقلاً قابل قبول ہے، اصل وہی حدیث ہے کہ ہر ''بلد'' کے رہنے والوں کے لئے اسی بلد کی رؤیت کا اعتبار ہوگا، اس حدیث میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'بلد' کا مفہوم متعین نہیں فرمایا کہ اس کا دائرہ کیا ہوگا؟ عربی زبان میں بلد کا اطلاق چھوٹے علاقہ پر بھی ہوتا ہے اور بڑے علاقہ پر بھی، ایک شہر پر بھی ہوتا ہے اور ایک ملک پر بھی، اس لئے سوال یہ ہے کہ اس حدیث میں بلد کے لئے معیار کیا ہوگا؟ فقہاء نے اس کو اپنے فہم سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ پورا علاقہ جہاں کا مطلع ایک ہو اس کو ایک ''بلد'' سمجھا جائے گا اور اس میں کہیں بھی چاند نظر آجائے تو دوسری جگہ اس کا اعتبار کیا جائے گا، گذشتہ ادوار میں یہ بھی متعین کرنا دشوار تھا کہ کہاں سے کہاں تک کا مطلع ایک سمجھا جائے گا؟ —— اس سلسلہ میں فقہاء متاخرین کے یہاں راجح قول جسے مانا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے علاقے —— جن میں مسافت ایک ماہ تک کی ہو —— اس کو ایک مطلع کے تحت سمجھا جائے گا اور فقہاء مسافت کا جو اندازہ لگاتے تھے، اس اندازہ سے اس زمانہ میں ایک ماہ کی مسافت تقریباً چھ سو میل تصور کی

جاتی تھی۔ (دیکھئے: مجموعۃ الفتاویٰ مع خلاصۃ الفتاویٰ: ۱/ ۲۵۵، مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ)

آج کے ترقی یافتہ دور میں فلکیاتی ماہرین کی مدد سے اس بات کا متعین کرنا چنداں دشوار نہیں کہ کہاں سے کہاں تک کا مطلع ایک ہے؟ چنانچہ اس دور کے اہل علم کی رائے میں ایسی دو جگہیں جن میں ایک دن کا فرق ہوجاتا ہو، کا مطلع الگ الگ سمجھا جائے گا، ۳، ۴ مئی ۱۹۶۷ء کو مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کا اجلاس خاص اس موضوع پر منعقد ہوا، جس میں مختلف مکاتب فکر کے ارباب افتاء اور نمائندے شریک ہوئے، اس میں جو فیصلے کئے گئے، ان کی دفعات نمبر ۳ تا ۶ یہاں نقل کی جاتی ہیں :

(۱) نفس الامر میں پوری دنیا کا مطلع ایک نہیں ہے، بلکہ اختلاف مطالع مسلّم ہے، یہ ایک واقعاتی چیز ہے، اس میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) البتہ فقہاء اس باب میں مختلف ہیں کہ صوم اور افطار صوم کے باب میں یہ اختلاف مطلع معتبر ہے یا نہیں؟ —— محققین احناف اور علماء اُمت کی تصریحات اور ان کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ رائے ہے کہ بلاد بعیدہ میں اس باب میں بھی اختلاف مطلع معتبر ہے۔

(۳) بلاد بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں اس قدر دوری واقع ہو کہ عادتاً ان کی رؤیت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہے، ایک شہر میں ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے اور دوسرے میں ایک دن کے بعد، ان بلاد بعیدہ میں اگر ایک کی رؤیت دوسرے کے لئے لازم کردی جائے تو مہینہ کسی جگہ ۲۸ دن کا رہ جائے گا اور کسی جگہ ۳۰ دن کا قرار پائے گا، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

(۴) بلاد قریبہ وہ شہر ہیں جن کی رؤیت میں عادۃً ایک دن کا فرق نہیں پڑتا، فقہاء ایک ماہ کی مسافت کی دوری کو جو تقریباً ۵۰۰ یا ۶۰۰ میل ہوتا ہے بلاد بعیدہ قرار دیتے ہیں اور اس سے کم کو بلاد قریبہ، مجلس اس سلسلہ میں ایک ایسے چارٹ کی ضرورت سمجھتی ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ مطلع کتنی مسافت پر بدلتا ہے اور کن کن ملکوں کا مطلع ایک ہے؟۔

(۵) ہندوستان و پاکستان کے بیشتر حصوں اور بعض قریبی ملکوں مثلاً نیپال وغیرہ کا مطلع ایک ہے، علماء ہند و پاک کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا ہے اور غالباً تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں کے شہروں میں اس قدر بعد مسافت نہیں ہے کہ مہینہ میں ایک دن کا فرق پڑتا ہو، اس بنیاد پر دونوں ملکوں میں جہاں بھی چاند دیکھا جائے، شرعی ثبوت کے بعد اس کا ماننا دونوں ملکوں کے تمام اہل شہر پر لازم ہوگا۔

(۶) مصر اور حجاز جیسے دور دراز ملکوں کا مطلع ہند و پاک کے مطلع سے علاحدہ ہے، یہاں کی رؤیت ان ملکوں کے لئے اور ان ملکوں کی رؤیت یہاں کے لئے ہر حالت میں لازم اور قابل قبول نہیں ہے، اس لئے کہ ان میں اور ہند و پاک میں اتنی دوری ہے کہ کہ عموماً ایک دن کا فرق ان میں واقع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ چاند کا اعلان اصل میں مسلمانوں کے امیر وسلطان کی ذمہ داری ہے اور عام مسلمانوں کو اس پر عمل کرنا چاہئے، اگر ذمہ دار نے اپنے فیصلہ میں شرعی اُصولوں کو نہیں برتا ہو تو عنداللہ وہ جوابدہ ہوں گے، ہندوستان جیسے ملک میں سلطان کے قائم

مقام مسلمانوں کی جانب سے مقرر ہونے والا قاضی یا رؤیت ہلال کمیٹی ہے، قاضی اور رؤیت ہلال کمیٹی کو چاہئے کہ شرعی اُصولوں کی رعایت کرتے ہوئے فیصلہ کرے اور عام مسلمانوں کو چاہئے کہ اختلاف وانتشار سے بچتے ہوئے اس فیصلہ پر عمل کریں۔

چاند کے سلسلہ میں اختلاف کی بنیاد فقہی مسائل سے زیادہ باہمی ذہنی فاصلوں پر ہے، یہ ایک تلخ حقیقت اور کڑوی سچائی ہے کہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے ہیں یا نہیں کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح تنظیمیں باہمی چپقلش کی وجہ سے بعض اوقات ایک دوسرے کے فیصلہ پر مطمئن نہیں ہوتیں، اس کے علاوہ مختلف علاقوں کی رؤیت ہلال کمیٹیوں کے درمیان معلومات کے تبادلہ کا مناسب انتظام نہیں ہے، اس لئے اس اختلاف کا حل بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ کم سے کم اہل سنت والجماعت کی رؤیت ہلال کمیٹیوں میں اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے نمائندے شامل ہوں، اہل سنت میں علماء دیوبند، علماء بریلی اور علماء اہل حدیث کے حلقے ملک کے سبھی علاقوں میں پائے جاتے ہیں، بعض علاقوں میں ایسے اہل علم بھی ہیں جو فقہ حنفی ہی کے متبع ہیں، لیکن ان کا نقطۂ نظر بعض مسائل کی توضیح وتشریح میں علماء دیوبند اور علماء بریلی سے کسی قدر مختلف ہے، جیسے آندھراپردیش میں جامعہ نظامیہ، بہار میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، یوپی میں فرنگی محل، ان حلقوں سے بھی اکابر اہل علم اور اصحابِ نظر پیدا ہوتے رہے ہیں اور فقہ حنفی کے مقلدین کا ایک بڑا حلقہ ان علمی وفکری مراکز سے مربوط ہے، اسی طرح بعض علاقوں میں فقہ شافعی کے متبعین بھی پائے جاتے ہیں، جیسے کیرالہ، بھٹکل اور کوکن وغیرہ، اسی طرح بعض مساجد کو پوری ریاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، جیسے دہلی میں جامع مسجد، کلکتہ میں ناخدا مسجد، حیدرآباد میں مکہ مسجد، اگر ہر علاقہ کے پس منظر میں ان تمام مکاتب فکر کی نمائندگی اور ان مساجد کے ائمہ کو شریک کرتے ہوئے ریاستوں کی رؤیت ہلال کمیٹی بنائی جائے اور اس میں ایک دو فلکیات کے ماہرین بھی شامل ہوں، نیز انھیں خطوط پر ایک مرکزی ہلال کمیٹی تشکیل پائے اور یہ سب باہمی ارتباط سے فیصلہ کریں، تو اُمید ہے کہ اختلاف وانتشار کی وہ صورت پیدا نہ ہوگی، جس سے اس وقت مسلمانانِ ہند دوچار ہیں، اور

انشاءاللہ ذرائع ابلاغ کو استہزاء اور تضحیک کے مواقع بھی ہاتھ نہ آئیں گے، اگر ضرورت محسوس کی جائے تو ان کمیٹیوں کو مزید مؤثر بنانے کے لئے ہندوستان کی بڑی دینی جامعات جیسے دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ اشرف العلوم مبارکپور، جامعہ سلفیہ بنارس اور ملک کی مختلف تنظیموں جیسے امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھاڑکھنڈ، جمیعۃ علماء ہند اور جماعت اسلامی وغیرہ کے نمائندوں کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے، چوں کہ عیدین و رمضان کے سلسلہ میں اہل سنت و اہل تشیع کے درمیان کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے، اس لئے فقہ جعفری کے علماء کو بھی شامل کر کے رمضان اور عیدین کا ایسا اعلان کیا جاسکتا ہے جو تمام اہل قبلہ کے درمیان وحدت کا مظہر ہو۔

یہ بات بھی ضروری ہے کہ ان کمیٹیوں کا نٹ ورک اضلاع اور تعلقہ جات تک وسیع ہو، اور ان جگہوں میں کمیٹی کی طرف سے دو تین علماء کو مجاز قرار دیا جائے کہ ان کے پاس چاند دیکھنے کی شہادت دی جائے، یہ حضرات گواہی لیں اور فون وغیرہ کے ذریعہ اپنے اوپر کی کمیٹیوں کو خبر دیں، فون پر گواہی دینا تو معتبر نہیں ہے؛ لیکن جو بات گواہوں کے بیانات سے ثابت ہو چکی ہو، فون پر اس کی اطلاع دی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ یہ خبر ہے نہ کہ شہادت۔

البتہ فقہی اور فنی اعتبار سے ایک مسئلہ قابل توجہ ہے کہ ایسے دو علاقے جن کا مطلع ایک ہو اور مطلع صاف بھی ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ ''چاند'' کے اُفق پر دیر سے پیدا ہونے اور غروب آفتاب کے بعد کم وقت تک باقی رہنے کی وجہ سے ایسی جگہ جہاں پہلے آفتاب غروب ہوتا ہو چاند نظر آجائے اور جہاں دیر سے سورج ڈوبتا ہو وہاں چاند نظر نہیں آئے؟ نیز ایسی صورت میں کیا ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہ کے لئے معتبر ہوگی؟ جیسا کہ اس بار میسور میں چاند کی عمومی رؤیت ہوئی، کرناٹک، بہار، گجرات اور ہریانہ کے بعض علاقوں سے چاند دیکھے جانے کی خبر آئی، لیکن مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور اُڑیسہ کی اتنی لمبی پٹی میں کہیں سے مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند دیکھنے کی اطلاع نہیں ملی۔

بہر حال رؤیت کے مسئلہ میں آئے دن دین اور علماء دین کی جو بے آبروئی ہوتی ہے

اور پورے ملک میں مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف و انتشار رونما ہوتا ہے، واقعہ ہے کہ وہ حساس اور دردمند لوگوں کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے، معلوم نہیں کتنی کانفرنسیں اور نشستیں اور کتنے جلسے اور سیمینار ہیں کہ اس موضوع پر ہو چکے ہیں، مگر عملاً ہنوز روز اول ہے! حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں، مکاتب فکر، ادارے اور مسلمانوں میں بااثر شخصیتیں فروعی اختلافات سے پرے اُٹھ کر جمع ہوں، وہ مرکزی سطح پر ایک کمیٹی کی تشکیل کریں جو رؤیتِ ہلال کا فیصلہ کرے اور ریڈیو سے اس کا اعلان ہو جائے، اس طرح اُمت ایک بڑے اختلاف سے بچ سکے گی، اور خدا کی شریعت علماء کے باہمی تنافس سے ہونے والی بے آبروئی اور اس کی بناء پر خدا بیزار اور دین سے بے گانہ لوگوں کے طعنہ و تشنیع سے محفوظ رہ سکے گی۔

مسلمانوں کی وحدت، انتشار سے حفاظت، دین و شریعت کی حرمت اور ہر طبقہ کے علماء اور اربابِ حل وعقد کے وقار و اعتبار کی برقراری کے لئے کیا علماء دین اور خادمین شریعت اتنی سی فراخ چشمی اور کشادہ قلبی کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

۱۰–۱۷ نومبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

تحفظات اور اسلامی تعلیمات

تحفظات کے مسئلہ پر موافق ومخالف احتجاج کا جو طوفان اٹھا ہے، اس نے پورے ملک پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اس پر دانشوارانہ بحثوں کا بھی سلسلہ جاری ہے، مسلمان بھی عرصہ سے اپنے لئے تحفظات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، مگر ان کی آواز ہمیشہ صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی ہے اور بہت کم ان کے حقوق پر توجہ دی گئی ہے، ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کریں۔

''تحفظ'' کے معنی محفوظ کرنے کے ہیں، یعنی کسی گروہ کے لئے کسی ذمہ داری، عہدہ، تعلیم یا ملازمت کو محفوظ کر دینا، بعض صورتوں میں تحفظ فطری چیز ہے، مریض کا علاج کرنے کی اجازت اسی کو دی جاسکتی ہے جس نے میڈیکل تعلیم حاصل کی ہو، کسی مشنری کو بنانے، اس کو استعمال کرنے اور اس کی مرمت کرنے کے لئے وہی شخص مجاز ہوسکتا ہے جس نے اس شعبہ کی انجینئرنگ پڑھی ہو، مزدوری کے پیشہ کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، لیکن غور کیجئے تو اس میں بھی تحفظات ہیں، گھر کی تعمیر کے مزدور الگ ہیں، چونا گرداری کے مزدور الگ، بڑھئی کے کام کے لئے مستقل لوگ ہیں اور لوہے کا کام کرنے کے لئے الگ الگ لوگ، جو شخص ڈرائیونگ کرنا نہیں جانتا اسے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دی جاسکتی، جس نے طریقۂ تعلیم کی واقفیت حاصل نہ کی ہو اسے تعلیم وتدریس کے میدان میں قبول نہیں کیا جاتا، یہ سب تحفظات ہی کی صورتیں ہیں۔

یہ تحفظات ''کام بشرطِ صلاحیت'' پر مبنی ہیں، یعنی جس شخص میں جو کام کرنے کی اہلیت ہوگی وہی اس کام کو کرسکتا ہے اور جس شخص میں جس کام کی اہلیت نہیں ہو اس کو وہ کام سپرد نہیں کیا جاسکتا، یہ وہ اُصول ہیں جس کی قرآن وحدیث میں بار بار تاکید کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان خير من استاجرت القوی الامين (قصص:۲۶)، یعنی بہترین شخص جس کو آپ

ملازم رکھیں اور کوئی کام سونپیں، وہ ہے جس میں دو باتیں ہوں، ایک تو اس کام کو انجام دینے کی قوت وصلاحیت اور اہلیت اور دوسرے امانت و دیانت، زندگی کے تمام گوشوں میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کی بنیاد دو باتیں ہیں: یا تو وہ کام نااہلوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے یا اس میں دیانت اور فرض شناسی کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص فن طب سے واقف نہ ہو وہ لوگوں کا علاج نہ کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ: جو لاعلمی کے ساتھ علاج و معالجہ شروع کر دے اور اس سے مریض کو نقصان پہنچ جائے، تو وہ اس نقصان کا ضامن ہوگا، اسی لئے فقہاء نے ایسے طبیب پر پابندی لگانے کی بات کہی ہے، جو علاج کے فن سے ناواقف ہو اور دوا کے مثبت اور منفی اثرات کو نہیں جانتا ہو، اسی طرح فقہاء ان لوگوں پر بھی پابندی لگانے کو کہتے ہیں، جو لاعلمی اور فکری بے سمتی کے ساتھ فتویٰ دیا کرتے ہوں، فقہ کی کتابوں میں اس کے لئے ''مفتی ماجن'' کا لفظ آیا ہے، جس کا ترجمہ ''آوارہ خیال مفتی'' سے کیا جا سکتا ہے، دوسرے کاموں میں بھی صلاحیت اور اہلیت کے اعتبار سے تحفظ شریعت کا عین منشاء ہے، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مؤذنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے آرزومند تھے، لیکن اس کے لئے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا، کہ ان کی آواز بلند تھی فانه أندى صوتاً۔

امامت مسلم معاشرے میں نہایت ہی اہم ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی بات سے استدلال کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وفات میں نماز کی امامت کے لئے آپ رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا ہے، تو امامتِ کبریٰ یعنی خلافت کے لئے بھی یہ آپ رضی اللہ عنہ ہی کے انتخاب کا اشارہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کے لئے علم و عمل کو معیار قرار دیا اور اس ذمہ داری کو ان لوگوں کے حق میں محفوظ فرمایا، جو صاحبِ علم اور صاحبِ تقویٰ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیادی طور پر نسلی اور خاندانی شناخت کو وجہِ ترجیح نہیں بنایا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں پیدا ہوئے وہاں قبائلی نظام اور نسلی تعصّبات

کا بڑا غلبہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حالات میں ایک طرف تو نسلی تعصّبات کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش فرمائی اور دوسری طرف اس زمانے کے حالات اور لوگوں کے مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور بعض خاندانی خصوصیات اور اسلام کے لئے مختلف قبائل کی خدمات اور قربانیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عبوری طور پر تحفظات بھی عطا فرمائے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ عرب قریش کے علاوہ کسی اور کی قیادت کو تسلیم نہیں کریں گے، اگر عرب کے کسی اور قبیلہ نے قیادت اپنے ہاتھ میں لی تو طوائف الملو کی اور افراتفری پیدا ہو جائے گی، اسی پس منظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: 'ائمہ' یعنی 'سربراہ' قریش میں سے ہونے چاہئیں''الائمة من قریش ''(مجمع البحرین:۳۰۵/۴،حدیث نمبر:۲۵۰۸)، چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ عربوں میں بنواُمیہ، بنوعباس اور فاطمیوں ہی کی حکومت قائم ہوسکی اور ان کا اقتدار مستحکم ہوا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکومت کی صلاحیت قریش میں ہے، قضاء کی انصار میں ہے، اذان دینے کی اہل حبش میں ہے اور امانت بنواز دیعنی اہل یمن میں ہے، **الملک فی قریش والقضاء فی الأنصار والأذان فی الحبشة والأمانة فی الازد۔** (ترمذی، حدیث نمبر ۳۹۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ امیر ان میں کا ہوتا، پھر جوں ہی انھوں نے قریش کی امارت کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنی، سر تسلیم خم کر دیا، نہ اس سے پہلے وہ کسی عہدہ کے خواہش مند ہوئے اور نہ اس کے بعد انھوں نے اپنے اقتدار کے لئے مہم جوئی کی، اس لئے ان کا رویہ ہمیشہ مسلمانوں کے تمام گروہوں کے بارے میں منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور تعصّبات سے پاک رہا اور قضاء کے کام کے لئے یقیناً ایسے ہی لوگ موزوں ہو سکتے تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضاء کی ذمہ داریوں کے لئے انھیں زیادہ موزوں قرار دیا اور کئی انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس فریضہ کو نہایت خوش اُسلوبی اور مثالی دیانت وامانت کے ساتھ انجام دیا۔

اہل حبش کی آواز تیز اور کرخت ہوتی تھی، اس خصوصیت کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موذن کے عہدہ کے لئے ان کو زیادہ سزاوار قرار دیا، واضح ہو کہ اس زمانہ میں اسے نہایت ہی معزز اور مؤقر کام سمجھا جاتا تھا، اہل یمن کی نرم خوئی خوش اخلاقی اور امانت و دیانت عربوں میں شروع سے مشہور تھی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر ان کی تعریف کی، اہل یمن کی حقیقت پسندی کا حال یہ تھا کہ اچھی خاصی طاقت رکھنے کے باوجود بغیر کسی جنگ و جدال کے انھوں نے اسلام قبول کیا، حکومت میں بہت سے عہدے وہ ہیں —— خاص کر جن کا تعلق مالیات سے ہے —— کہ ان کے لئے انتہائی امانت داری کی ضرورت ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ایسی ذمہ داریوں میں اہل یمن کے ساتھ ترجیحی سلوک رکھا جائے، غرض کہ بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں نسلی اور خاندانی بنیاد پر ترجیحی سلوک نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ بھی صلاحیت اور اہلیت ہی کی بنا پر ترجیحات تھیں۔

تحفظات کا ایک پہلو رعایتوں کا ہے، یعنی کسی کمزور طبقے کی مدد کے لئے انھیں رعایت دی جائے، یہ شریعت اسلامی کا خاص مزاج ہے، بیماروں، مسافروں، مقروضوں، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے لئے قدم قدم پر رعایتیں رکھی گئی ہیں، یہ رعایتیں جہاں جسمانی افعال میں ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج اور جہاد میں، وہیں مالی معاملات میں بھی ہیں، معاشی اعتبار سے پس ماندہ لوگوں کے لئے زکوٰۃ وصدقات کی حد رکھی گئی، اسلامی بیت المال میں ان کے لئے تعاون کے خصوصی شعبے رکھے گئے، بہت سی مالی ذمہ داریوں سے ان کو مستثنیٰ قرار دیا گیا، یہ بھی تحفظ ہی کی ایک نوعیت ہے۔

اس لئے تحفظات کے سلسلہ میں دو دائرے مقرر کئے جانے چاہئیں، ایک ایسی تعلیم اور ملازمتوں کا، جس سے قوم و ملک کا عمومی مفاد وابستہ ہے، اس میں ضروری ہے کہ اہلیت کی بنا پر لوگوں کو موقع دیا گیا ہو اور اگر کسی مظلوم اور دبے ہوئے طبقہ کو اونچا اُٹھانا ہے اور ان کے لئے کچھ تحفظ دینا ہے، تب بھی اقل ترین صلاحیت کی شرط ہونی چاہئے، میڈیکل تعلیم، ملازمت،

دفاعی اُمور سے متعلق تعلیم اور عہدے اور اس طرح کے حساس اور وسیع الاثر ذمہ داریاں اسی دائرہ میں آتی ہیں، اگر نام نہاد، جاہل ڈاکٹر علاج کرنے لگیں اور ناکام طلبہ کو میڈیکل تعلیم گاہوں میں داخلہ ملنے لگے، بے صلاحیت لوگ ہوائی جہاز اڑانے پر مامور ہوں وغیرہ، تو یہ تحفظ چند افراد کو مالی فائدہ پہنچائے گا اور نہ جانے کتنے لوگوں کی جانیں جوکھم میں پڑ جائیں گی۔

کچھ کام وہ ہیں جن کے لئے بہت ذہانت اور قابلیت مطلوب نہیں ہے، کم صلاحیت لوگ بھی ایسے کاموں کو انجام دے سکتے ہیں، اسی طرح تعلیم کے بعض ایسے شعبے ہیں جن سے سنگین اجتماعی نقصان کا خطرہ نہیں، بہت سی ملازمتیں بھی اسی نوعیت کی ہیں، ان شعبوں میں کسی خاص طبقہ کے لئے معاشی پسماندگی کی شرط کے ساتھ اس حد تک تحفظات دیئے جاسکتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

غرض کہ اسلام میں تحفظات کی بنیاد نسلی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کی اساس صلاحیت و اہلیت اور معاشی پسماندگی ہے، تعلیم اور ملازمتوں کے حساس اور اہم شعبوں میں صلاحیت کو بنیاد بنایا جانا چاہئے اور اگر تحفظات دیئے جائیں، تب بھی اقل ترین مطلوبہ صلاحیت کی شرط ہونی چاہئے، دوسرے شعبوں میں ملکی وقومی مصالح کے تحت تحفظات دیئے جاسکتے ہیں، لیکن اس میں بھی معاشی پسماندگی کو بنیاد بنانا چاہئے اور تمام طبقات کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے، مسلمانوں کو جو اس وقت بدترین پسماندگی سے گزر رہے ہیں نظرانداز کر دینا اور ان کی تحفظات کے فائدے سے محروم رکھنا یقیناً عدل کے خلاف اور ملک کی مجموعی ترقی میں رکاوٹ ہے۔

۲۳/جون ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ہندوستان اور اسلامی سزائیں

ہندوستان میں مغل بادشاہ اکبر ''دین الٰہی'' کی ایجاد اور اپنے خود ساختہ و نا آسودہ مذہب کی آرزو کے لئے بھی جانا جاتا ہے، ''دین الٰہی'' کیا تھا؟ ایمان کے ساتھ کفر کی آمیزش! روشنی کے ساتھ تاریکی کی پیوندکاری اور خدا کے گھر میں اپنے نفس اور خواہش کے بتکدہ کی تعمیر! حقیقت یہ ہے کہ ''دین الٰہی'' ایک کردار ہے اور ہر دور میں اکبر کا کردار ادا کرنے والے کچھ محروم و نامقبول لوگ رہا کئے ہیں، امتِ اسلامیہ ہند نے ایسے کئی خود ساختہ رہنماؤں اور رہبروں کو دیکھا ہے، عبد الکریم بھائی چھاگلہ اور جناب ہدایت اللہ کے نام ابھی بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہیں، اگر ایم، جے، اکبر صاحب اکبر کی صدائے بازگشت بن کر ابھریں اور مسلمانوں کو ایک ایسے قانون پر رضا مند ہونے کی دعوت دیں، جس میں اللہ کے دیے ہوئے احکام کو فرسودہ خیال کیا جاتا ہو اور مغربی نظریات کو معیار بنایا جاتا ہو، تو یقیناً یہ کوئی باعثِ تعجب امر نہیں، انسان جس ماحول میں پرورش پاتا ہے، جن کو پڑھتا ہے اور جن سے پڑھتا ہے، ان سے آزاد ہو کر سوچے، یہ صلاحیت کم لوگوں میں ہوتا ہے، زیادہ لوگ ماحول کے اسیر ہوتے ہیں، ایم جے اکبر صاحب کی فکری نشو ونما جس ماحول میں ہوئی ہے، اگر وہ اس کے حصار سے باہر نہ آسکیں اور حقائق کا آزادانہ مطالعہ نہ کر پائیں، تو انھیں معذور سمجھنا چاہئے۔

لیکن افسوس اس بات پر ہوا کہ ایک دانشور کی حیثیت سے ان کے بارے میں جو رائے پائی جاتی تھی، اسے ٹھیس پہنچی ہے اور اعتماد کا آبگینہ چور چور ہوا ہے، اندازہ یہ ہوا کہ کم سے کم مذہب کے معاملہ میں وہ لکھتے زیادہ ہیں، پڑھتے کم ہیں اور سوچتے اس سے بھی کم ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''وہ دو صفحہ پڑھنے کے لائق ہوتا ہے، جس کو لکھنے کے لئے کم سے کم دو سو صفحہ پڑھا گیا ہو۔'' لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ایک صفحہ پڑھ کر دو سو صفحہ لکھنا چاہتے ہیں اور سوچنے کے لئے ان کے پاس کوئی لمحۂ فرصت ہی نہیں ہے، ایسی تحریروں سے اکثر سچائی کو

شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

علامہ اقبال کی طرف قانونِ شریعت کے بارے میں انھوں نے جونسبت کی ہے، اگر ہاتفِ غیبی نے اس مردِ مؤمن تک یہ خبر پہنچائی ہوگی، تو یقیناً اس کی روح تڑپ گئی ہوگی، اقبالؒ نے اپنے ایسے ہی بہی خواہوں کے مزاج و مذاق کا اندازہ کرکے کہا تھا :

اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالم کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

فکری انحطاط کے زمانہ میں اجتہاد قوم کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دے گا، کم نظر لوگوں کے اجتہاد سے زیادہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ گذرے ہوئے لوگوں کی اقتداء کی جائے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی کمالِ ناواقفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بورڈ کی تشکیل کب ہوئی ؟ سیاست سے اس نے کس طرح اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا ہے؟ ان کا خیال ہے کہ بابری مسجد کے سلسلہ میں بورڈ کا جو موقف ہے، وہ مسلمانوں کے حقیقی جذبات سے مختلف ہے، یہ ایسی باتیں ہیں کہ ہندوستان میں مسلم تحریکات اور مسلم مسائل سے تعلق رکھنے والا عامی سے عامی بھی ان کی ان کھلی ہوئی غلطیوں اور خلافِ واقعہ باتوں کو نشان زد کرسکتا ہے، ۱۰ راگست کے ''نقوش'' (روز نامہ ''منصف'') میں اس سلسلہ میں ایک حقیقت پسندانہ تحریر آچکی ہے، لیکن دو باتوں کی وضاحت مناسب محسوس ہوتی ہے، جن کا تعلق صرف مسلم پرسنل لا بورڈ سے نہیں، بلکہ قانونِ شریعت اور مسلم پرسنل لاء سے ہے، ایک چوری کی سزا کا مسئلہ اور دوسرے مسلم پرسنل لاء میں مردوں کی طرفداری اور عورتوں کے ساتھ ناانصافی کا اعتراض۔

جہاں تک چوری کی سزا کی بات ہے، تو ایم جے اکبر صاحب اسے موجودہ مہذب دَور

کے منافی خیال کرتے ہیں، ان کی سوچ یہ ہے کہ مجرم کو ایذا پہنچانا مقصود نہیں، بلکہ صرف اصلاح مقصود ہے، اس لئے ایسی سزائیں اس دور کے مناسب نہیں ہیں، مسلمانوں سے اور بورڈ سے ان کا مطالبہ ہے کہ اگر وہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے روادار نہیں ہیں تو پھر چوری کی سزا کے جاری کرنے کا بھی مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ یہ بات اس لئے بھی قابل وضاحت ہے کہ ایم جے اکبر صاحب نے پہلی بار یہ بات کہی ہے، ایسا نہیں ہے، مسلم پرسنل لا کے مخالفین اور سنگھ پریوار کے لوگ بھی بار بار اس طرح کی بات کہتے رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ قوانین وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی شخصی زندگی سے ہے، جیسے عبادات، نکاح وطلاق، تقسیم میراث، سود سے بچنا وغیرہ، ان میں مسلمان دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں، قانونِ شریعت پر عمل کرنے کے پابند ہیں، کچھ قوانین وہ ہیں جو عدالت کے ذریعہ ہی نافذ ہوسکتے ہیں، اور ان قوانین کے لئے مناسب ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جہاں قانون کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو، اور عدلیہ کا نظام اسلام کے منشاء کے مطابق قائم نہیں کی جاسکتا ہو، وہاں ایسے قوانین قابل نفاذ نہیں ہوتے، کیوں کہ اس کا تعلق شخصی عمل اور انفرادی برتاؤ سے نہیں ہے، حدود وقصاص ایسے ہی قوانین میں داخل ہیں، لہٰذا جہاں یہ امور مسلمانوں کے قابو میں نہ ہوں، وہاں وہ اس کے مکلّف بھی نہیں ہیں۔

دوسرے شریعتِ اسلامی میں جہاں سخت سزائیں رکھی گئی ہیں، وہاں لوگوں کو اس جرم سے بچانے کے لئے مناسب ماحول بھی فراہم کیا گیا ہے، مثلاً شراب نوشی کی سزا ۸۰ کوڑے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت میں شراب کے کارخانے نہیں ہوسکتے اور شراب کی خرید وفروخت نہیں ہوسکتی، ظاہر ہے ایسے ماحول میں خود بخود شراب نوشی کے امکان کم ہو جائیں گے اور کوئی رندِ توبہ شکن بادۂ پیمانہ تک پہنچ ہی نہ سکے گا، ایسے ماحول میں اگر شرابی کو کوڑے لگائے جائیں، تو یہ نا منصفانہ عمل نہیں ہوسکتا، لیکن جہاں شراب بنانے کے کارخانے قائم ہوں، بازار مئے خانوں سے آباد ہوں اور چائے کی طرح شراب فراہم ہوسکتی ہو، وہاں شراب نوشی پر ایسی سزا دینا یقیناً ظلم کی بات ہوگی، اسی لئے فقہاء نے ہر جگہ اسلامی سزاؤں

(حدود) کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ اس کا نفاذ ''دارالاسلام'' میں ہوگا۔

اب چوری ہی کے معاملہ کو لیجئے، چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جو یقیناً ایک سخت سزا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے نفقہ و کفالت کا ایک وسیع تر نظام مقرر کیا ہے، جس میں بچے سے بوڑھے اور صحت مند سے معذور تک کوئی شخص نہیں، جس کی کفالت کا انتظام نہ کیا گیا ہو اور جن رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری رکھی گئی ہے، وہ محض اخلاقی نوعیت کی نہیں، بلکہ قانونی نوعیت کی ہے اور اگر کوئی رشتہ دار موجود نہ ہو، یا ہو لیکن اس کی کفالت کی صلاحیت نہ ہو، تو حکومت اس کی کفالت و پرورش کی مکلّف ہے، جسے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنی ہے، اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص چوری کرتا ہے تو یہ اس کے لئے معاشی مجبوری نہیں، بلکہ حرص وطمع کی تکمیل ہے اور وہ یقیناً سخت سزا کا مستحق ہے؛ اسی لئے اگر حکومت عوام کی کفالت سے قاصر ہو، اور غیر معمولی قحط کے حالات پیدا ہو جائیں، تو ان حالات میں چوری کی سزا نافذ نہیں کی جائے گی۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں شدید قحط کے دَور میں چوری کی سزا موقوف کردی تھی، لیکن جہاں مالدار پر نانِ شبینہ کے محتاج رشتہ داروں کی کفالت کو قانونی طور پر لازم نہیں کیا جاتا اور حکومت اپنی فاقہ مست عوام سے بے نیاز اپنی عیش کوشیوں اور بزم آرائیوں میں مست رہتی ہو، وہاں چوری پر ایسی سخت سزا کا نافذ کیا جانا یقیناً موزوں نہیں ہوگا، اس لئے اسلامی قانون میں شخصی قوانین اور اجتماعی قوانین کے نفاذ میں فرق کیا گیا ہے۔

سزا کا مقصد مجرم کی اصلاح بھی ہے اور مجرم طبع لوگوں کے لئے عبرت بھی، جو لوگ جرم کے عادی ہو گئے ہوں، یا مجرمانہ ذہن کے حامل ہوں، معمولی سزا انھیں جرم سے باز نہیں رکھ پاتی، اسی لئے اس دور میں بھی جن ملکوں میں اسلامی حدود کے نفاذ کی کوشش کی گئی ہے، وہاں جرم کا تناسب غیر معمولی حد تک کم ہو گیا ہے، اگر سزا کا مقصد محض مجرم کی اصلاح ہوتی، تو مجرم کو جیل کے بجائے 'گیسٹ ہاؤس' میں بھی رکھا جا سکتا تھا اور اسے کسی درس گاہ میں بھی قید کیا جا سکتا تھا، پھر کسی مجرم کو قیدِ بامشقت کی سزا دینے کی ضرورت نہ پڑتی اور حبس دوام اور پھانسی کی نوبت بھی نہ آتی، لیکن کیا بہت سے ممالک سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اس سزا کو

جاری کرنے پر مجبور نہیں ہوئے؟ افسوس کہ مغربی تہذیب نے مجرم کی زیادتی کو کم تر بنا کر پیش کیا ہے، اور آج دنیا میں اخلاقی مجرمین کے ساتھ ہمدردی اور نرمی کا ایک عام رجحان پیدا ہو گیا ہے، لیکن وہ اسے نہیں سمجھتے کہ ظالم کے ساتھ نرمی اور درگذر مظلوم کے ساتھ ناانصافی اور اس کی مظلومیت میں اضافہ ہے، اس سے مجرمانہ اذہان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اور ظلم شعار طبیعتوں کو شہ ملتی ہے۔

ویسے جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں اور علماء کا معاملہ ہے، تو اگر اس ملک میں بھی چوری کی شرعی سزا نافذ کی جائے، تو شاید وہ اسے قبول کر لیں گے اور یہ بھی یقین ہے کہ ایسی سزاؤں کا نفاذ مجرمانہ واقعات کو کم کرنے اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت میں مؤثر کردار ادا کرے گا، بلکہ اگر ایم، جے، اکبر صاحب مالی خیانت کے ساتھ ساتھ علمی خیانت کی بھی کوئی سزا مقرر کریں، تو علماء کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، کہ مالی خیانت سے ایک شخص متاثر ہوتا ہے اور علمی خیانت سے پورا سماج گمراہ ہوتا ہے، اور لوگ سراب کو آب اور پیتل کو سونا سمجھنے لگتے ہیں!

۱۶/ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ ۱۵/ اگست ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

مسلم پرسنل لا اور خواتین

شریعتِ اسلامی کا سب بڑا امتیاز عدل اور اعتدال ہے، اردو زبان میں عدل کے معنی ''انصاف'' کے کئے جاتے ہیں، لیکن یہ اس لفظ کی مکمل ترجمانی نہیں ہے، عدل کے معنی ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے لحاظ سے ذمہ داری سونپنے اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے اس کے حقوق متعین کرنے کے ہیں، ایک شخص پانچ کیلو وزن اٹھا سکتا ہو اور ایک شخص دس کیلو، تو عدل یہ ہے کہ دونوں کو اس کی طاقت کے لحاظ سے بوجھ اٹھانے کا مکلّف کیا جائے، ایک شخص کی خوراک چار روٹی ہو اور دوسرے کی دو روٹی، تو عدل یہ ہے کہ دونوں کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے روٹیاں تقسیم کی جائیں، جو چیز عدل سے ہٹ جاتی ہے، اس میں کہیں افراط پایا جاتا ہے اور کہیں تفریط، اس لئے جو بات عدل کی ہو، وہی راہِ اعتدال بھی ہوتی ہے۔

اسلام نے انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان فرائض اور حقوق کی تقسیم میں عدل کا طریقہ اختیار کیا ہے، سماجی اور خاندانی زندگی میں بھی مردوں اور عورتوں سے متعلق جو فرائض اور حقوق مقرر ہیں، وہ بھی نہایت عادلانہ اصولوں پر مبنی ہیں اور پوری طرح انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں، خدا نے اس کائنات کو مساوات اور برابری کے اصول پر نہ بنایا ہے اور نہ بسایا ہے، بلکہ فطرت نے صلاحیتوں اور ضرورتوں کے اعتبار سے اکثر مواقع پر تفاوت کو قائم رکھا ہے، انسان اگر اسے مٹانا چاہے تو یہ فطرت سے بغاوت ہوگی اور فطرت سے بغاوت ہمیشہ نقصان ہی پہنچاتی ہے۔

ایم، جے، اکبر صاحب کا خیال ہے کہ 'مسلم پرسنل لا بورڈ' مردوں کا طرف دار ہے، اور اس کی ساری لڑائی مردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے، یہ بالواسطہ طریقہ پر خود مسلم پرسنل لا اور قانونِ شریعت پر حملہ ہے، لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے، اگر کچھ نہیں تو بورڈ کے مرتب کئے ہوئے 'مجموعہ قوانین اسلامی' ہی کو وہ گہری نظر سے دیکھتے، تو ان کو ہرگز یہ غلط فہمی

نہیں ہوتی، مجموعہ کی دفعہ:۲ میں نکاح کو مرد وعورت کے درمیان شرعی اصولوں پر طے پانے والا معاہدہ قرار دیا گیا ہے، اس طرح مرد وعورت کو اس معاہدہ کا دو فریق تسلیم کیا گیا ہے، نہ کہ مردوں کو مالک اور عورتوں کو ان کی ملکیت، نکاح میں عورت کے اختیار اور اس کی رضا کو اہمیت دیتے ہوئے، نیز اس کے مفادات کی حفاظت کرتے ہوئے دفعہ:۸۴ میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں باپ، دادا کی خود غرضی، لالچ، ذاتی مفاد کی رعایت وغیرہ ثابت ہو، تو اس نے نابالغ لڑکی کا جو نکاح کیا ہو، وہ لازم نہیں ہوگا، دفعہ:۹۱ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ لڑکی کا ولی بلا عذرِ معقول نکاح سے گریز کرے، تو قاضی یا نسبتاً دور کے ولی کو بھی نکاح کر دینے کا حق حاصل ہوگا، دفعہ:۱۰۴ میں یہ بات لازم قرار دی گئی ہے کہ عاقلہ، بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت ہی سے کیا جائے، ورنہ نکاح درست نہیں ہوگا، دفعہ:۱۲۲ میں عورت کو اختیار دیا گیا ہے کہ شوہر اس کا ہم پلہ نہ ہو تو وہ اپنا نکاح فسخ کر سکتی ہے۔

اس مجموعہ میں مہر کے احکام بہت تفصیل وتاکید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ دفعہ:۱۲۸ میں کہا گیا ہے کہ اگر عورت سے نکاح کے وقت مہر نہ ہونے کی شرط کر لی جائے، تب بھی مہر واجب ہوگا، اگر نکاح کے وقت مہر متعین نہ ہو، تو مہر مثل یعنی خاندان کی دوسری عورتوں کی مہر کے مقدار میں مہر واجب ہوتا ہے، دفعہ:۱۴۸ میں اس کے لئے عورت کے آبائی خاندان کو معیار بنایا گیا ہے، دفعہ:۱۵۰ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر مہر معجّل ہو، تو عورت اس کی ادائیگی تک اپنے آپ کو روک سکتی ہے۔

اسی طرح اس مجموعہ میں نفقہ سے متعلق احکام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اس کا بنیادی مقصد عورت کے حقوق کا تحفظ ہے، دفعہ:۱۶۳ میں کہا گیا ہے کہ بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ، امیر ہو یا غریب، تندرست ہو یا بیمار، اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا، نکاح کے بعد عورت میکہ ہی میں ہو؛ لیکن اسے اپنے شوہر کے یہاں جانے سے انکار نہ ہو تو دفعہ:۱۶۶ میں اس کا نفقہ بھی شوہر کے ذمہ واجب قرار دیا گیا ہے، دفعہ:۱۷۲، ۱۷۳ میں شوہر کی اجازت سے میکہ میں مقیم عورت نیز وہاں رہتے ہوئے اس کا علاج اور ولادت کے موقع پر آنے والے اخراجات شوہر

کے ذمہ واجب قرار دیئے گئے ہیں، دفعہ:۱۸۲ میں عورت کو اس کا حقدار قرار دیا گیا ہے کہ شوہر کے چھوڑے ہوئے مال سے وہ اپنا نفقہ حاصل کرلے، اور اگر کوئی مال نہ ہو تو دفعہ:۱۸۳ کے تحت قرض لے سکتی ہے، دفعہ:۱۸۴ میں کہا گیا ہے کہ اگر بیوی نفقہ معاف کردے، تب بھی اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اور اس کو دوبارہ نفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، دفعہ:۱۸۸ میں عورت کی پوشاک کے معاملہ میں موسم اور عرف کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے، اور دفعہ:۱۸۹ میں کہا گیا ہے کہ شوہر پر بیوی کی رہائش کے لئے مناسب حال رہن سہن کی بنیادی ضرورتوں پر مشتمل علاحدہ جگہ دینا ضروری ہے۔

دفعہ:۲۰۵ میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور ایذا رسانی سے بچنے، دفعہ:۲۰۶ میں اعتدال کے ساتھ ایک دوسرے کی جنسی خواہش پورا کرنے کے واجب ہونے اور دفعہ:۲۰۸ میں جنسی تعلق میں فطری طریقہ کی پابندی کے احکام ہیں، دفعہ:۲۰۹ میں عورت کی اجازت کے بغیر مرد کو نرودھ استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، دفعہ:۲۱۰ میں لکھا ہے کہ بیوی کو اسقاطِ حمل یا مانع حمل اشیاء کے استعمال پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، دفعہ:۲۰۷ میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر بیوی کو شوہر سے خطرہ ہو، تو شوہر اسے سفر میں ساتھ لے جانے پر مجبور نہیں کرسکتا، اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو خوراک، رہائش، لباس اور شب باشی میں ان کے درمیان برابری کا سلوک ضروری ہے، دفعہ:۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶ میں طلاق سے پہلے اصلاحِ حال کی تدابیر بتلائی گئی ہیں، دفعہ: ۲۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ شوہر کے لئے کسی بھی حال میں بیوی کو اپنے گھر سے نکال دینا جائز نہیں۔

دفعہ: ۲۲۰ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ لڑکی یا اس کے والدین یا اس کے اقارب سے مطالبہ کرکے نقد یا سامان لینا رشوت اور حرام ہے اور اس کو واپس کرنا واجب ہے، اسی طرح اگر مطالبہ نہ ہو لیکن عرف ورواج میں لڑکے کو کچھ دینے کی رسم نے شرطِ نکاح کا درجہ حاصل کرلیا ہو، تو دفعہ:۲۲۱ میں اسے بھی رشوت اور ناجائز قرار دیا گیا ہے، دفعہ:۲۲۲ میں کہا گیا ہے کہ شوہر و بیوی کے اولیاء یا اقارب جو تحفہ دلہن کو دیں، وہ اسی کی ملکیت ہوگی اور عورت ہی کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہوگا، اگر لڑکی کے باپ نے لڑکی کے لئے سامانِ جہیز فراہم کیا اور نکاح

سے پہلے اس کی موت ہوگئی، تو وہ سامان اسی لڑکی کی ملکیت ہوگی، دوسرے ورثہ کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہو: دفعہ: ۲۲۶)

حق پرورش میں ماں اور اس کے قرابت داروں کو ترجیح دی گئی ہے، (دفعہ: ۲۳۱) یہاں تک کہ اگر خلع میں عورت کے حق پرورش سے دستبرداری کی شرط لگادی گئی ہو، تب بھی یہ شرط باطل ہوگی، (دفعہ: ۲۴۵) اگر عورت مطلقہ ہو اور بچہ اس کے زیر پرورش ہو، تو وہ بچہ کے باپ سے اجرتِ پرورش، اور دودھ پلا رہی ہو، تو اس کے ساتھ دودھ پلائی کی اجرت کی بھی حقدار ہوگی (دفعہ: ۲۴۷) قانونِ طلاق کے باب ششم میں تفویض طلاق سے متعلق دفعات ہیں، جس کے ذریعہ عورت کو اپنے آپ پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

خلع کا ایک مستقل باب چار دفعات پر مشتمل ہے، جس میں عورت کے لئے کوئی وجہ بتائے بغیر شوہر سے علاحدگی کی راہ بتائی گئی ہے، فسخ وتفریق کا باب دفعہ: ۳۲۲ تا ۳۴۴ پر مشتمل ہے، ان دفعات میں ان عورتوں کی دشواری کا حل پیش کیا گیا ہے، جو شوہر کی طرف سے ظلم یا حق تلفی کا شکار ہیں، خواہ یہ حق تلفی قصداً ہو یا عجز ومجبوری کے تحت اور ان صورتوں میں فسخ نکاح کی گنجائش رکھی گئی ہے، دفعہ: ۳۷۳ شق: ''د'' میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر بیوی کو کوئی چیز ہبہ کی گئی ہو، تو اس سے رجوع نہیں کیا جاسکتا، گو زوجین کے درمیان علاحدگی ہوگئی ہو، قانون میراث میں بیوی، بیٹی، بہن، ماں، نانی، دادی وغیرہ کے حقوق تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اسی طرح بعض لوگ جو بیٹی بہن وغیرہ کو حق میراث سے محروم کردیتے ہیں، ان کو خواتین کے حق کے سلسلہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

یہ عائلی زندگی سے متعلق آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مرتب کئے ہوئے 'مجموعہ قوانین اسلامی' کا سرسری جائزہ ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قانونِ شریعت میں خواتین کی کتنی زیادہ رعایت ہے اور بورڈ نے اس کو دفعہ وار مجموعہ کی شکل دے کر خواتین کے حقوق کا تحفظ کرنے کی کتنی بہتر اور مؤثر کوشش کی ہے؟ اس کے علاوہ بورڈ نے ایک نکاح نامہ بھی مرتب کیا ہے جو ابھی زیر غور ہے، اس نکاح نامے کا بھی اصل مقصد مظلوم خواتین کے لئے

انصاف کو آسان کرنا اور عدالتوں کی سرگرانی سے بچانا ہے۔

آج جس مغربی تہذیب کو عورت کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، اگر گہرائی کے ساتھ سوچا جائے تو اس نے عورت کی تذلیل میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے اور آزادی کے نام پر اس کو اِس بات پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ فرائض مادری کو بھی ادا کرے اور فریضۂ پدری کا بھی کچھ حصہ اپنے ذمہ لے لے، اسے بچے بھی پیدا کرنا ہے، اپنے بچوں کو دودھ پلانا اور ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی انجام دینا ہے، امورِ خانہ داری سے بھی نمٹنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملازمت بھی کرنی ہے اور کسبِ معاش میں بھی ہاتھ بٹانا ہے، پھر اس کی رسوائی کا سروسامان اس طرح کیا گیا کہ ماچس کی ڈبیہ سے لے کر زیورات، کپڑوں اور فلموں کے اشتہار تک ہر جگہ اس کے حسن کو بے حجاب اور غیرت وحیاء کو بے لباس کیا جاتا ہے، کیا کوئی شریف انسان اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو بے لباسی کی حالت میں دیکھنا گوارہ کرے گا، پھر کیسا ظلم ہے ان جوان اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جن سے ان کی غیرت سستے داموں خرید کی جاتی ہے اور ان کی غربت واحتیاج کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے، افسوس کہ ہمارے نام نہاد دانشوروں کو عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا یہ ستم نظر نہیں آتا، پھر بے حیائی کے عام ہونے اور مردانہ فرائض کا بوجھ عورتوں پر رکھ دینے کی وجہ سے خاندانی نظام بکھر رہا ہے، رشتے کھوکھلے ہوتے جارہے ہیں اور عورت جب اپنی جسمانی کشش کھو دیتی ہے تو سماج میں ایک پرانے اور فرسودہ سامان کی طرح بے قیمت ہو جاتی ہے، اس پہلو کو یہ حضرات پیشِ نظر نہیں رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی تمام انسانی طبقات کے لئے سایۂ رحمت ہے؛ کیوں کہ وہ قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے اور انسان کے لئے وہی قانون اور نظامِ زندگی مفید اور نافع ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت سے مطابقت رکھتی ہو، اس سے منہ موڑنا، اپنے لئے انجام کار بربادی کو دعوت دینا ہے!

❑ ❑ ❑ ❑

گاؤکشی — اسلامی اور انسانی نقطۂ نظر

گاؤکشی کا مسئلہ بی جے پی کے ایجنڈے میں شامل ہے، جس کا مقصد اپنے ووٹ بینک کو مضبوط کرنا اور اسے طاقت پہنچانا ہے، اس کے لئے کبھی رام جی کا نام فروخت کیا جاتا ہے، اور کبھی کھونٹے سے بندھی بے زبان گائے کو کھولا جاتا ہے اور اس کے نام پر ووٹ کا چارہ حاصل کیا جاتا ہے، بی جے پی کی دبی ہوئی کوشش یہ تھی کہ مسلمان اس مسئلہ پر اٹھ کھڑے ہوں، اس طرح فرقہ وارانہ جذبات ابھارے جائیں اور ہندوؤں کا سیاسی استحصال کیا جائے، لیکن بحمد اللہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں سمجھداری اور دانش مندی سے کام لیا، اپنے ردِّ عمل کو اشتعال اور جذباتیت کے دائرہ میں داخل نہیں ہونے دیا اور اس طرح بی جے پی کی خواہش ناتمام و نامراد رہ گئی۔

شمال مشرقی ریاستوں کی بی جے پی یونٹوں، این ڈی اے کی متعدد حلیف جماعتوں اور کانگریس کو چھوڑ کر اکثر اپوزیشن جماعتوں نے اس کی جم کر اور کھل کر مخالفت کی، کانگریس نے گو خاموشی اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی، لیکن خود این ڈی اے کی خیمہ سے ہونے والی مخالفت نے بی جے پی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ فی الحال اس بل کو ملتوی رکھے۔

گاؤکشی کے مسئلہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں نوع بنوع مخلوقات کو وجود بخشا ہے اور ان سب کی رزق کی ضمانت لی ہے، لیکن مختلف ذی روح کے لئے ان کی جسمانی صلاحیت اور ضرورت کے اعتبار سے الگ الگ خوراک متعین فرمائی ہے، بعض ایسے حشرات الارض بھی ہیں جو ریت اور مٹی سے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، خنزیر غلاظتوں اور فضلات کو بصد شوق اپنی غذا بناتا ہے، گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ گھاس پھوس، درخت کے پتوں اور چھالوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں، ہاتھی جیسا خشکی کا سب سے بڑا جانور بھی نباتاتی غذا پر اکتفا کرتا ہے، شیر، بھیڑیئے اور بہت سے درندے اپنے سے کمزور جانوروں کے گوشت کو خوارک بناتے ہیں، انسان اپنی جسمانی

ضرورت کے اعتبار سے نباتی غذا کا بھی محتاج ہے اور لحمی غذا کا بھی، انسانی جسم میں جو قوتیں، صلاحیتیں اور اجزاء مطلوب ہیں، ان میں بعض سبزی، ترکاری اور پھلوں سے حاصل ہوتی ہیں اور بعض مختلف جانوروں کے گوشت سے، اس لئے اس کی صحت کے لئے دونوں طرح کی غذائیں ضروری ہیں، پھر جیسے مختلف نباتات میں الگ الگ تاثیر ہے، اسی طرح اگر کوئی قوت و صلاحیت ایک جانور کے گوشت سے حاصل ہوتی ہے، تو کوئی دوسرے جانور سے۔

چوں کہ خالق کائنات اپنی مخلوق کی فطرت اور ضرورت سے بخوبی واقف ہے، اس لئے اس نے حلال وحرام کا قانون نازل کیا، جو چیزیں انسان کے لئے نافع تھیں، ان کو حلال رکھا اور جو چیزیں انسان کے لئے مضرت رساں اور نقصان دہ ہیں، ان کو حرام قرار دیا، چنانچہ نباتات میں مہلک یعنی ہلاک کر دینے والی اشیاء اور مسکر یعنی نشہ میں مبتلا کرنے والی اشیاء کو حرام قرار دیا، باقی تمام نباتات کو حلال قرار دیا گیا، کیوں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ انسان کے لئے مفید ہیں نہ کہ نقصاندہ۔

حیوانات میں جن کا کھانا صحتِ انسانی کے لئے نقصاندہ ہو، یا جن کی وجہ سے انسانی اخلاق پر اثر پڑسکتا تھا، ان کو منع کیا گیا؛ کیوں کہ جیسے جسم انسانی پر غذاؤں کا اثر ہوتا ہے، کوئی غذا زہر بن جاتی ہے اور کوئی اکسیر، اسی طرح انسانی اخلاق پر بھی غذا کا اثر ہوتا ہے، مغرب میں اس وقت جو حیا سوزی کا طوفان آیا ہوا ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا اصل سبب شراب اور خنزیر کا بکثرت استعمال ہے، باقی دوسرے جانوروں کو حلال قرار دیا گیا، کہ وہ بنیادی طور انسان کے لئے مفید اور نفع بخش ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق ہے اور وہی ان کے نفع ونقصان اور منفعتوں اور مضرتوں سے پوری طرح آگاہ ہے، اس لئے کسی شئے کو حلال یا حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ، (آل عمران:۱۵۴) ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (یوسف:۴۰) یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کا حق نہیں دیا گیا کہ آپ ﷺ اپنے طور پر

کسی حلال کوحرام یا کسی حرام کو حلال کردیں ، (التحریم:۱) ؛ اس لئے گائے یا کسی جانور کو (جسے شریعت میں حلال کیا گیا ہو) مسلمان اپنے طور پر حرام کا درجہ نہیں دے سکتے ، جب کہ قرآن نے صراحتاً گائے کے حلال ہونے کا ذکر کیا ہے۔(انعام:۱۴۴)

اگر کوئی شخص یا کوئی قوم حرام کو حلال یا حلال کوحرام کرنے کا مرتکب ہو،تو دراصل وہ خدا کے حقوق و اختیارات میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے،اسی لئے جیسے انسان کے لئے کسی حلال کو حرام کرنا جائز نہیں، ویسے ہی کسی حرام کو حلال کرنا بھی درست نہیں،حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے، یہودیوں میں یہ غلط فہمی تھی کہ اونٹ کا گوشت حرام ہے،اس لئے انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ ہم اسلام کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بھی بچیں اور شریعتِ موسیٰ میں حرام کی گئی چیزوں سے بھی،اسی موقع پر ارشادِ ربانی: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَّ لاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ (البقرہ:۲۰۸) ''اے مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو'' نازل ہوئی،یعنی اسلام میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شریعتِ اسلامی کی پوری پوری اتباع ہو نہ یہ کہ کسی مسئلہ میں اس شریعت پر عمل کیا جائے اور کسی مسئلہ میں سابقہ شریعت پر، لہٰذا مسلمانوں کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اسلام میں حرام کی ہوئی چیزوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب میں حرام تصور کی جانے والی اشیاء کو بھی حرام کا درجہ دے دیں ؛ کیوں کہ اس کا رشتہ عقیدۂ ایمان سے جڑا ہوا ہے۔

گائے کا تقدس بعض دوسری قوموں میں بھی رہا ہے،حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اہل مصر گائے کے پرستار تھے،ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے قوم بنی اسرائیل میں بھی اس کا طرح کا تصور پیدا ہو گیا تھا،اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 'سامری' نامی ایک شخص نے بنی اسرائیل کے مصر سے ہجرت کرنے اور بحر قلزم عبور کر کے وادیٔ سینا میں قیام کے دوران سونے کی ایک گائے یا بچھڑا بنا دیا اور اسے اس زاویہ سے ہوا کے رخ پر رکھا کہ اس میں سے آواز پیدا ہونے لگتی ، بنی اسرائیل عین اس وقت اس کی پرستش کرنے لگے، جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم

سے تورات لانے کوہِ طور پر گئے ہوئے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے اوسامری اور اس کے متبعین کو قرار واقعی سزا دی گئی، لیکن گائے کے غلو آمیز احترام کا جو بت دلوں میں بیٹھ چکا تھا وہ ابھی پوری طرح نکل نہیں پایا تھا۔

قدرت کی جانب سے اس کے علاج کا نظم یوں ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے دوسرے شخص کو قتل کر دیا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس قاتل کے بارے میں جاننا چاہا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ ایک مخصوص سنہری گائے کو ذبح کریں، اور اس کے گوشت کو اس مقتول سے مس کریں تو وہ زندہ ہو جائے گا اور وہ خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا، چنانچہ اس گائے کی تلاش شروع ہوئی، جو بالآخر ایک یتیم لڑکے کے پاس ملی، اسے مہنگے داموں خرید کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق گائے ذبح کی گئی اور مردہ نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتایا اور پھر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گیا، قرآن مجید نے سورہ بقرہ میں تفصیل سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

اہل علم نے لکھا ہے کہ گائے اور پھر سنہری گائے ذبح کرانے کا مقصد بنی اسرائیل کے ذہن سے اسی تقدس کو نکالنا اور اس وہم کو دور کرنا تھا؛ کیوں کہ گائے ذبح کی گئی تو نہ جانے کیا آفت اور مصیبت آ جائے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نہ صرف کسی جانور کی پرستش، بلکہ اس کے بارے میں مبالغہ آمیز احترام واعتقاد کو بھی گوارا نہیں کرتا۔

اگر انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ بہت سی قوموں کی خوراک ہے، یہودی، عیسائی، مسلمان، بدھسٹ، سکھ قبائلی گروہ اور لا مذہب اقوام، یہ سبھی گائے کا گوشت استعمال کرتی ہیں، ہندوستان کی شمالی مشرقی ریاستیں، ناگالینڈ، میگھالیہ، میزورم، آسام کے اکثر علاقے، بلکہ بنگال میں بھی، نیز ہندوستان کی جنوبی ریاستوں، خاص کر کیرالہ وغیرہ میں ہندو بھی گائے کا گوشت کھایا کرتے ہیں، بعض وہ برادریاں جن کو ہندوؤں کی نیچی ذاتیں کہا جاتا ہے، جیسے چماڑ، بھنگی، یہ پورے ملک میں گائے کھاتے ہیں، کیا یہ بات قرین انصاف ہے کہ کچھ لوگوں کی خواہش کے احترام میں اتنے سارے لوگوں کو ان کی ایک غذا سے محروم کر دیا جائے، اور غریبوں کے لئے گوشت کھانے کو گراں سے گراں تر بنا دیا جائے؟

لیدر ایکسپورٹ کاؤنسل کے صدرنشیں ایس ایس کمار کے بیان کے مطابق اگر گاؤکشی پر امتناع عاید کردیا جائے تو اس سے لیدر مصنوعات کی برآمدات کو زبردست نقصان پہنچے گا اور تیس فیصد کی کمی واقع ہوجائے گی ، اس سے جہاں ہندوستان جیسے غریب ملک کو سات ملین ڈالر کا نقصان پہنچے گا ، وہاں پندرہ لاکھ افراد کا روزگار متاثر ہوگا ، (روزنامہ منصف : ۲۱ / اگست ۲۰۰۳ء) جب کہ ہندوستان کی برآمدات میں تقریباً پچیس فیصد لیدر اور اس کی مصنوعات ہیں ، کیوں کہ ساری دنیا میں موجود مویشیوں کا تقریباً ساٹھ فیصد حصہ ہندوستان میں ہے ، اس طرح گاؤکشی کا عالمی سطح پر اثر ہوگا اور ہندوستان تو خاص طور پر متاثر ہوگا ۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک اندازہ کے مطابق روزانہ ایک لاکھ گائیں ذبح کی جاتی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیادہ تر گائیں اس وقت فروخت کی جاتی ہیں جب وہ دودھ دینے کے لائق نہیں رہتیں ، اس طرح اگر سال بھر گائیں ذبح نہیں کی گئیں تو ان کی تعداد ساڑھے تین کروڑ یا اس سے زیادہ ہوسکتی ہیں ، اگر ان میں سے نصف کو ہی ناکارہ مان لیا جائے ، تو یہ مویشی کی پرورش کرنے والوں کے لئے کتنا بڑا بوجھ ہوجائے گا اور اگلے دس پندرہ سال میں ان کی تعداد کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور یقیناً یہ گائیں سماج کے لئے رحمت کے بجائے زحمت بن جائیں گے ۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ کیا واقعی ہندو مذہب میں گائے کو مقدس ماں کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کو ذبح کرنے کی ممانعت کی گئی ہے ، ہندو مذہبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’ ویدک عہد ‘‘ جو ہندو مذہبی تاریخ میں ’’ خیر القرون ‘‘ کا درجہ رکھتا ہے ، میں نہ صرف گوشت خوری کا عمل عام تھا ، بلکہ گائے کی قربانی بھی ہوتی تھی اور اس کے گوشت بھی کھائے جاتے تھے ، یجروید میں گھوڑے ، سانڈ بیل ، بانجھ گائیوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے ، (یجروید : ۲۰ : ۸۷) اس لئے حقیقت یہ ہے کہ گاؤکشی پر پابندی کا مطالبہ نہ عقل کے مطابق ہے ، نہ فطرتِ انسانی کے اور نہ ہندو مذہبی کتابوں اور روایات کے مطابق ۔

۲۹ / اگست ۲۰۰۳ء

❑ ❑ ❑ ❑

ذبیحہ — اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا عین تقاضا ہے کہ وہ کائنات میں بسنے والی تمام مخلوقات کے لئے (جو غذا کی محتاج ہوں) مناسبِ حال غذا کا انتظام کرے، اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے رزّاق ہونے کا بار بار ذکر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے بہت ہی تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے کہ زمین میں جتنے بھی ذی روح ہیں، کیڑے سے لے کر ہاتھی تک، ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

غور کیا جائے تو اس کائنات میں اکثر مخلوقات کی غذا تین طرح کی ہے، جمادات، یعنی وہ ٹھوس چیزیں جس میں عام طور پر نمو کی کیفیت نہیں پائی جاتی، نباتات، یعنی زمین سے اگنے والی چیزیں، حیوانات، یعنی جاندار اشیاء، بعض ذی روح مٹی اور پتھر کو اپنی غذا بناتے ہیں، عام طور پر چرند و پرند کی غذا نباتات ہیں اور بہت سے حیوانات کی غذا دوسرے جاندار ہیں، انسان اور جنوں کے علاوہ دنیا میں جو مخلوقات ہیں وہ مکلّف نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظم کے دائرہ میں رہ کر کام کرتے ہیں، ان پر تشریعی احکام کی پابندی نہیں ہے، انسان کو قانونِ الٰہی کا پابند بنایا گیا ہے، غذا کا تعلق چوں کہ جسمانی صحت وارتقاء سے بھی ہوتا ہے اور اخلاقی کیفیات سے بھی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی غذا سے متعلق حلال وحرام کا تفصیلی قانون بھی عنایت فرمایا۔

جمادات، یعنی مٹی پتھر، لوہا وغیرہ، چوں کہ انسان کی قوتِ ہضم کے لحاظ سے موزوں غذا نہیں ہے اور اس سے اس کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لئے ان اشیاء کے کھانے کو ناپسند کیا گیا ہے اور فقہاء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، البتہ ازراہِ علاج کھانے میں کچھ حرج نہیں ہے، جیسا کہ یونانی دواؤں میں سونے چاندی کے اوراق اور ایلوپیتھک ادویہ میں آئرن، کیلشیم وغیرہ کے اجزاء ڈالے جاتے ہیں؛ کیوں کہ انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، اس لئے مٹی سے نکلنے والے اجزاء اس کے جسم کا حصہ ہیں اور ان کی مقدار میں توازن کو باقی رکھنے کے لئے ان

جماداتی اشیاء کی بھی اس کو ضرورت ہوتی ہے، جو نباتات وغیرہ کے واسطہ سے اسے حاصل ہوتی رہتی ہے، لہٰذا بہ طور علاج جمادات کا استعمال بھی درست ہے۔

نباتات، یعنی زمین سے اگنے والی اشیاء میں سے تین طرح کی چیزوں کو منع کیا گیا ہے: اوّل مہلک نباتات، یعنی وہ پودے جو فوری طور پر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں، جیسے زہر، دوسرے نشہ آور اشیاء، کیوں کہ اس سے انسان کی عقل اور قوتِ فکر یہ بھی متاثر ہوتی ہے اور اس کے اخلاق پر بھی خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، ''کل مسکر حرام'' نشہ آور اشیاء خواہ سیال ہوں یا جامد، شراب کے نام سے پائی جاتی ہو یا کسی اور نام سے، بہر صورت حرام ہیں؛ کیوں کہ مفاسد کے اعتبار سے دونوں ہی برابر ہیں، بلکہ بعض جامد منشیات، سیال منشیات سے بھی زیادہ مضرت رساں ہیں۔

تیسرے وہ اشیاء جو بہ تدریج صحت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور انسان کے لئے موذی امراض میں مبتلا ہونے کا سبب بنتی ہیں، ایسی چیزوں کو حدیث میں ''مفتر'' یعنی جسم کے لئے 'باعث فتور' قرار دیا گیا ہے، اس کی مثال تمبا کو اور اس کے استعمال کی مختلف صورتیں —— سگریٹ، بیڑی، گٹکا وغیرہ —— ہیں؛ کیوں کہ انسان اپنے جسم اور وجود کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ اس کا امین ہے اور اس پر یہ بات واجب ہے کہ اس کی حفاظت وصیانت کا اہتمام کرے اور احکام شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے جسم کو استعمال کرے۔

حیوانات بھی غذا کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، جانور سے حاصل ہونے والا دودھ نوع بہ نوع طریقوں پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت بھی نہایت لذت بخش اور انسانی جسم پر تیزی سے اثر انداز ہونے والی غذا ہے، پھر قدرت نے انسانی جسم کو کچھ اس طرح بنایا ہے کہ اس کو نباتی غذا کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور لحمی غذا کی بھی، اور ہضم کے اعتبار سے بھی اس میں ان دونوں طرح کی غذاؤں کو ہضم کرنے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے دونوں طرح کی غذاؤں کی گنجائش رکھی ہے، البتہ انسان کی جسمانی صحت اور اخلاقی مصالح ومفاسد کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ جانور حلال کئے گئے ہیں اور کچھ جانور حرام،

بنیادی طور پر کیڑے مکوڑے حرام ہیں ، درندہ ، چرند و پرند بھی حرام قرار دیئے گئے ہیں ؛ کہ انسان کہیں درندہ صفت نہ بن جائے ،بعض جانور اس لئے حرام کئے گئے ہیں کہ ان کے کھانے سے اخلاقی طور پر بے اعتدالی پیدا ہوجاتی ہے، جیسے خنزیر، ان کو چھوڑ کر بہت سے جانور، اونٹ، گائے، بکرے، مرغیاں وغیرہ کو حلال قرار دیا گیا۔

لیکن ان حلال جانورں کے کھانے کے لئے بھی کچھ مہذب اصول مقرر کئے گئے ، ان میں تین باتیں بنیادی ہیں، جن میں سے دو کا تعلق عقیدہ و مذہب سے ہے اور ایک کا تعلق انسانی صحت اور اس کی جسمانی مصلحت سے ہے، پہلا حکم یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنے والا مسلمان، یہودی یا عیسائی ہو، یعنی وہ فی الجملہ عقیدۂ توحید کا قائل ہو، دوسرے ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا اور صرف اللہ کا نام لیا گیا ہو، نہ غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور نہ قصداً اللہ کا نام لینے سے گریز کیا گیا ہو، یہ شرطیں اس لئے رکھی گئی ہیں کہ اکثر اقوام میں اپنے معبودوں کی تقدیس کے لئے یا ان کے نام پر جانور قربان کرنے کا تصور رہا ہے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جن مواقع کو لوگ مشرکانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا کرتے تھے، اسلام ان کا رخ موڑتے ہوئے ان ہی مواقع کو عقیدۂ توحید کو راسخ اور مضبوط کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے اور عمل کو باقی رکھتے ہوئے اس کے رخ اور جہت کو تبدیل کرتا ہے ؛ کیوں کہ عقیدۂ توحید صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں ، بلکہ کائنات کی واضح ترین سچائی ہے اور اس سچائی کا تقاضا ہے کہ خدا کی ایک مخلوق کو اور وہ بھی ایک جاندار استعمال کرتے ہوئے اس کی معبودیت اور کبریائی کا اعتراف کیا جائے۔

تیسری شرط —— جس کا تعلق انسانی صحت کے تقاضوں سے ہے —— یہ ہے کہ جانور کو ایسے طریقہ پر ذبح کیا جائے کہ رگوں کا بہتا ہوا خون اچھی طرح نکل جائے اور جانور کو کم سے کم تکلیف پہنچے، چنانچہ جانور کے قابو میں ہونے کی حالت میں ذبح کا یہ طریقہ متعین کیا گیا کہ سانس اور غذا کی نالیاں اور دونوں شہ رگ کٹ جائیں، اگر جانور طبعی طور پر یا گلا گھونٹ کر یا کسی اور وجہ سے ذبح کئے بغیر مر جائے تو وہ حلال نہیں، اس میں حفظانِ صحت کی رعایت بھی ہے ؛ کیوں کہ اس طرح مر جانے کی صورت میں خون جسم کے اندر منجمد ہوجاتا ہے اور صحتِ

انسانی کے لئے سخت مضرت رساں ہوتا ہے، دوسرا پہلو اس میں جانوروں کے ساتھ رحم کا بھی ہے؛ کہ اگر ذبح کا ایک طریقہ متعین نہیں ہوتا تو لوگ مختلف بے رحمانہ طریقوں سے جانور کو نشانہ بناتے، اسلام سے پہلے بعض مقامات پر لوگ جانور کا ایک حصہ کاٹ کر اسے اپنی غذا بنا لیتے تھے، عرب اونٹ کے کوہان کاٹ لیتے اور اسے تل کر کھاتے تھے، بعض قومیں بھیڑ کی دُم کے حصہ کو کاٹ کر اور تل کر کھایا کرتی تھیں، اسلام نے ان طریقوں کو منع کیا اور اسے مردار قرار دے کر نا قابل استعمال ٹھہرایا، تا کہ جانوروں کے ساتھ ظالمانہ طرزِ عمل کا سدِّ باب ہو سکے۔

اس وقت ہمارے شہر میں ذبیحہ کا مسئلہ ایک تشویش ناک مسئلہ بنا ہوا ہے، شہر سے دور مسلخ کی منتقلی نے لوگوں کو تنگی و دشواری سے تو دوچار کیا ہی ہے؛ لیکن طریقۂ ذبح کے سلسلہ میں بھی لوگ تشویش واضطراب میں مبتلا ہیں، ایک بات تو اطمینان کی ہے کہ مشین کا استعمال جانور کے ذبح کے لئے نہیں ہو رہا ہے؛ بلکہ ذبح کے بعد کے مراحل میں مشین استعمال کی جاتی ہے، یہ مراحل —— جیسے گوشت کی کٹائی، چمڑوں کی چھلائی وغیرہ —— مشین کے ذریعہ انجام دئے جا سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ ذبح کرنے سے پہلے جانور کو ایسے انجکشن یا شاک لگائے جاتے ہیں جو اسے بیہوش کر دیں، اس کی مصلحت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے جانور کو کم تکلیف پہنچے گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں جانور کی بھلائی سے زیادہ اپنی ''معاشی بھلائی'' مقصود ہے، جو جانور ہوش و شعور سے محروم ہو گیا ہو، اس کو قابو میں رکھنا آسان ہوتا ہے اور کم افراد اس کے لئے کفایت کر جاتے ہیں اور جو جانور مکمل ہوش اور شعور کی حالت میں ہو، اس میں قوتِ مدافعت زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے ان کو ذبح کرنے میں دشواری ہو سکتی ہے، اور قابو میں لانے کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت پڑتی ہے، سوال یہ ہے کہ بے ہوش کرنے کا یہ طریقہ بہتر ہے یا غیر بہتر؟ غور کیجئے تو یہ طریقہ غیر بہتر ہے، اوّل تو اس لئے کہ اگر دَوا کی مقدار کسی قدر بڑھ جائے، یا خود جانور عام جانوروں کے مقابلہ کمزور ہو، تو یہ اس کے لئے موت کا باعث بھی بن سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ جب جانور ذبح کیا جا رہا ہو، اس وقت جانور مردار ہو چکا ہو، دوسری عمومی بات یہ ہے کہ بے

ہوشی کی کیفیت بلڈ پریشر کو عموماً کمزور کردیتی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس عمل سے دورانِ خون بھی متاثر ہوتا ہے اور جب دورانِ خون کم ہوگا، تو خون بہتر طریقہ پر خارج نہیں ہو سکے گا اور دورانِ خون زیادہ ہو، تو خون بہتر طور پر خارج ہو جائے گا، خون کے اچھی طرح نکل جانے کو محض مذہبی حکم کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ حفظانِ صحت کے پہلو سے بھی اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، واقعہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے جب تک جانور کے ذبح سے پہلے جانور کی موت کا یقین نہ ہوا سے حرام قرار نہیں دیا جاسکتا؛ لیکن یہ صورت کراہت سے بھی خالی نہیں۔

یہ انسانی فکر کی بے اعتدالی ہے کہ یا تو مطلقاً جانور کو حرام قرار دے دیا جائے، اور ذبح حیوان ہی کو جور وظلم ٹھہرایا جائے، یا پھر زندہ ومردار کے فرق کو بھی نظر انداز کر دیا جائے، اللہ کا بھیجا ہوا دین انسان کو اس بے اعتدالی سے بچاتا ہے، کیوں کہ یہ اس خالق و مالک کا بھیجا ہوا قانون ہے جو انسانی فطرت اور مصالح ومفاسد سے بھی پوری طرح آگاہ ہے ''فطرة الله التي فطر الناس عليها ''اس قانونِ فطرت سے جب بھی بغاوت کی جائے گی انسان نفع کے بجائے نقصان سے دوچار ہوگا، اور دنیا وآخرت ہر دو پہلو سے ناکامی ونامرادی ہی اس کے حصہ میں آئے گی!

۲۳/ ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ ۱۶/ جنوری ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

مغرب کی انسانیت نوازی کی تازہ مثال!

اس وقت یورپ پوری دنیا میں اپنی ایجادی اور اختراعی صلاحیت کے لئے معروف ہے، بہت سی ایجادات جس نے انسان کے لئے زندگی کی مشکلات کو آسان کر دیا ہے، مغربی سائنس دانوں کی کاوشوں کا ثمرہ ہے، اس کے پہلو بہ پہلو دنیا میں جو ہلاکت خیز ہتھیار آج موجود ہیں اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسان کو ہلاک کرنے اور اس کے املاک کو تباہ وتاراج کر دینے کے جو ذرائع اور آلات ہیں، وہ بھی مغرب ہی کی دین ہے، یہ عجب تضاد ہے کہ ایک طرف مغرب امن وآشتی کا علمبردار اور انسانی حقوق کا محتسب اور ٹھیکیدار بھی ہے اور دوسری طرف وہی ہلاکت خیزیوں اور تباہیوں کا سوداگر بھی، اس نے اپنے اس ایجادی اور اختراعی ذہن کو جیسے اسبابِ راحت کی فراہمی اور وسائل تعیش کی حصولیابی کے لئے خرچ کیا ہے، اسی طرح اپنے مخالفین کی تعذیب وتوہین، ان کی اذیت رسانی اور طرح طرح سے تحقیر اور تکلیف دہی کے سلسلہ میں بھی نت نئے طریقوں کے ایجاد کا انھیں ملکہ حاصل ہے۔

بوسنیا میں مظلوم مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے جو رویہ روا رکھا ہے، انھیں دیکھ کر شیطان بھی شرمسار ہوا ہوگا، پھر امریکہ نے افغانستان کے قیدیوں کو کیوبا میں، اپنے فوجی اڈہ گوانتا ناموں میں جس غیر انسانی حالت میں رکھا ہے، کیا مجال کہ درندے بھی انسانوں کی ایذا رسانی میں ایسی مہارت حاصل کر پائیں اور اب برطانوی افواج نے عراق میں قیدیوں کے ساتھ جو تکلیف دہ رویہ اختیار کیا ہے، جس کی ایک جھلک ٹی وی پر آچکی ہے اور اس نے پوری دنیا کے با ضمیر انسانوں کو تڑپا کر رکھ دیا ہے، وہ اس کی تازہ مثال ہے، یہ انسانی حقوق اور انصاف کے ان پاسداروں کا کارنامہ ہے جو ایشائی، مشرقی اور اسلامی ممالک کا دن رات احتساب کرنے سے بھی نہیں چوکتے، اگر مغربی ممالک اپنے مخالفین اور قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتے ہوں تو تعجب کی بات نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ یہ ان کے آباء واجداد کی میراث ہے، یہ یورپ ہی

ہے جہاں سیافی کے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے، اس کھیل میں غلاموں کو (جو زیادہ تر قیدی ہوا کرتے تھے) جنگلی جانوروں، درندوں اور خود انھیں باہم ایک دوسرے سے لڑایا جاتا تھا اور ان کی بے دردانہ ہلاکت کے تماشے دیکھے جاتے تھے اور اس پر تالیاں پیٹی جاتی تھیں، پروفیسر لیکی نے تاریخ اخلاق یورپ میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے، ماضی قریب میں بھی جنگِ عظیم اور اس سے پہلے مغرب نے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، وہ انسانیت پر بدنما دھبہ سے کم نہیں، یہاں تک کہ بعض امریکی عدالت نے اپنے فیصلہ میں غلاموں کو (جو عام طور پر قیدی ہوا کرتے تھے) مویشیوں کے حکم میں رکھا تھا، جنگِ عظیم کو کتنا عرصہ گذرا ہے؟ اس موقع پر نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے تہ تیغ کرادیا کہ اس کے نزدیک ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ایک بوجھ تھا، اس لئے آج اگر امریکی و یورپی افواج نے قیدیوں کے ساتھ ایسے مظالم اور اہانت آمیز برتاؤ کو روا رکھا ہے تو کیا تعجب ہے؟

اب ذرا اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کو ملاحظہ کیجئے: اسلام نے ہمیں میدانِ جنگ میں جتنی بہادری اور جرأت و ہمت کی تعلیم دی ہے، شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ اسی قدر فراخ دلی اور عالی ظرفی کا سبق بھی پڑھایا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو عملی طور پر برت کر دکھایا ہے اور بعد کے ادوار میں بھی مسلمان بادشاہوں نے اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود اس پہلو سے مثالی نمونہ پیش کیا ہے، صلیبی جنگوں کی تاریخ میں مسلمانوں کے عفو و درگذر، دشمنوں کے ساتھ فراخ دلی اور مفتوحین کے ساتھ وسیع القلبی کے کتنے ہی واقعات ملتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس سلسلہ میں اصولی ہدایت دی ہے، کہ جو لوگ قید کر لئے جائیں، یا تو ان کو بطورِ احسان کے یوں ہی چھوڑ دیا جائے، یا ان سے فدیہ وصول کیا جائے فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ إِمَّا فِدَاءً (محمد:۴) فدیہ کی دونوں شکلیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ ان سے معاوضہ وصول کیا جائے، دوسرے یہ کہ قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے جہاں قیدیوں کا تبادلہ ممکن تھا، وہاں تبادلہ کو ترجیح دی، چنانچہ حضرت سعد بن نعمان رضی اللہ عنہ کے بدلہ آپ ﷺ نے سردارِ

قریش ابوسفیان کے بیٹے کو رہا فرمایا، جو لوگ فدیہ ادا کر سکتے تھے، ان سے ان کی حیثیت اور گنجائش کے لحاظ سے فدیہ حاصل کیا گیا، اور جو لوگ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے، بہت سی دفعہ آپ ﷺ نے انھیں یوں ہی آزاد فرمادیا، غزوۂ بدر میں ستر لوگ قید کئے گئے، آپ ﷺ نے حسب حیثیت فدیہ کی مقدار مقرر فرمائی، جو لوگ فدیہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، لیکن لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان سے فرمایا گیا کہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں اور انھیں رہا کر دیا جائے گا، مطلب بن منطب اور صیفی بن ابی رفاعہ بہت نادار تھے اور پڑھے لکھے بھی نہیں تھے، انھیں آپ ﷺ نے یوں ہی معاف کر دیا۔

قیدیوں میں ایک ابوعزہ بن عبداللہ بن عثمان نامی شاعر بھی تھے، انھوں نے عرض کیا کہ میری پانچ پانچ لڑکیاں ہیں، میرے ساتھ رحم کا معاملہ کیجئے، آپ ﷺ نے ان سے بھی درگذر کا معاملہ فرمایا، البتہ ان سے وعدہ لیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو اکسائیں گے نہیں اور نہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں گے، لیکن وہ اس وعدہ کو وفا نہیں کر سکا، اور جنگِ احد میں پھر مسلمانوں کے خلاف مقابلہ پر آ گیا، ان ہی قیدیوں میں ایک سہیل بن عمرو بھی تھے، یہ بڑے اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے، حضور ﷺ نے ان کو درگذر کرنا چاہا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض پناہ ہوئے کہ کم سے کم ان کے آگے کے دو دانت نکلوا دیے جائیں، تا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف زہرافشانی نہ کر سکیں، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، اگر میں اس کے اعضاء کو بگاڑ دوں گا، تو یہی معاملہ اللہ میرے ساتھ فرمائے گا، اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں۔

پھر آپ ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ کس قدر حسن سلوک کا معاملہ فرمایا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس حال میں گرفتار کر کے لائے گئے کہ جسم پر کرتا نہیں تھا، ان کے لئے کرتا تلاش کیا گیا، چوں کہ دراز قد تھے اس لئے کوئی کرتا فٹ نہ آتا تھا، عبداللہ بن ابی رأس المنافقین بھی طویل قد وقامت کے تھے، انھوں نے اپنا کرتا پیش کیا، یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پہنایا گیا، اس زمانہ میں کوئی جیل موجود نہیں تھی، اس لئے قیدیوں کے مشکیں کس کر مسجدِ نبوی ﷺ میں باندھ دیا گیا تھا،

بعضوں کی مشکیں کچھ زیادہ ہی کس گئی تھیں، جب رات میں ان کے کراہنے کی آواز آئی تو آپ ﷺ بے چین ہو گئے، پھر ان کی بندشیں ڈھیلی کر دی گئیں، ان قیدیوں کو آپ ﷺ نے مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم پر تقسیم فرما دیا اور تاکید کی گئی کہ انھیں آرام اور راحت کے ساتھ رکھا جائے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس ہدایت کا اتنا خیال رکھا کہ خود کھجور کھاتے اور قیدیوں کو روٹیاں کھلاتے، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی ابوعزیز بھی قیدیوں میں تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جن انصاریوں نے مجھے اپنے گھر میں قید رکھا تھا، ان کا حال یہ تھا کہ مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور میرے سامنے روٹیاں رکھ دیتے اور خود کھجور کھاتے، مجھے ان کے اس حسنِ سلوک پر شرمندگی ہوتی، میں اصرار کرتا کہ وہ بھی روٹی کھائیں، لیکن وہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا تھا، اس لئے ان کا یہ رویہ تھا، پھر جب آپ ﷺ نے قیدیوں کو واپس فرمایا تو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ، رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے حسنِ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدر کے بعض قیدی مکہ پہنچ کر اپنی خواہش اور رضامندی سے مسلمان ہو گئے۔

غزوۂ حنین کے موقع سے آپ ﷺ نے چھ ہزار قیدیوں کو کچھ لئے بغیر باعزت طریقہ پر رہا فرما دیا، خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عالی ظرفی کا حال یہ تھا کہ جب ابن ملجم خارجی نے آپ رضی اللہ عنہ پر زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے حملہ کیا، اور یہ بدبخت پکڑ کر آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے لایا گیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: اس کو گرفتار رکھو اور قید میں اس کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اگر میں زندہ بچ گیا، تو غور کروں گا کہ معاف کر دوں یا قصاص لوں اور اگر مر جاؤں تو ایک جان کا بدلہ ایک ہی جان سے لیا جائے، جوشِ انتقام میں کسی اور کو نہ مارا جائے اور اس کا مثلہ نہ بنایا جائے، یعنی ناک، کان اور اعضاء کاٹے نہیں جائیں۔

قیدیوں کے بارے میں حسنِ سلوک کی تعلیم نہ صرف یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے دی، بلکہ خود قرآن مجید نے بھی قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب دی، قرآن نے نیکوکاروں (ابرار) کے اجر و ثواب اور ان کے اوصاف و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک وصف یہ بھی

ذکر فرمایا ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلىٰ حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ أَسِيْرًا (دہر:۸) ’’جو اپنی چاہت پر ترجیح دیتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں‘‘۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت مسلمانوں کے یہاں جو قیدی تھے، وہ مشرکین ہی تھے، ’’کان أسرائهم يومئذ مشركين‘‘ (تفسیر ابن کثیر:۴/۴۵۵) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے یکساں حکم ہے —— کہاں یہ بلند اخلاق جو چھٹی صدی عیسوی کی ہے اور کہاں مغرب کا یہ حال کہ ۱۷۱۲ء اور ۱۷۴۱ء میں جب نیویارک میں غلاموں نے تنگ آ کر بغاوت کی تو یہ صورت اختیار کی جاتی کہ جو غلام گرفتا ہو کر آتے انھیں گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے دبوا دیا جاتا، یا زندہ نذرِ آتش کر دیا جاتا۔

مسلمانوں اور عالم اسلام کے لئے کیسی عبرت کی جا ہے اور کس درجہ غیرت کا مقام ہے کہ انھوں نے آپسی اختلاف اور بکھراؤ، اقتدار کی محبت، خدا سے بے خوفی اور اپنے اقتدار کے پائے چوبیں کو بچائے رکھنے کے لئے خود ہی یہود و نصاریٰ کو اس بات کا موقع دیا، کہ وہ عالم اسلام کے قلب میں اتر کرامتِ اسلامیہ کی غیرت و ہمت سے کھیلیں، انھیں ذلیل ورسوا کریں اور ان کی تذلیل وتحقیر اور تعذیب وانسانیت سوزی کی نا قابل دید تصویریں پوری دنیا میں دیکھی جائیں۔

الٰہا! ظلم کی تیرگی نے عدل وانصاف کو سیاہ رو بنا دیا ہے اور تیری اس کائنات میں سچائی اور انسانیت مسلسل شرمسار ہو رہی ہے، تیرے نام لیوا بندے تیری نسبت اور تعلق کی وجہ سے ستم خیزیوں اور جفا انگیزیوں کا ہدف بنائے گئے ہیں، تو ہی اپنی قدرت سے ظالم کے جفا کیش ہاتھوں کو روک لے اور اس مظلوم و مقہور امت کی دستگیری فرما، آمین یا ربّ العالمین!

۱۶/ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ، ۷/ مئی ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

موت میں زندگی

انسان کو قدرت سے جو نعمتیں دی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی نعمت ’ زندگی‘ ہے، ساری لذتیں زندگی ہی سے متعلق ہیں، جو زندگی سے محروم ہیں، اس کے لئے زہر اور امرت، سونا اور پیتل اور ہیرے اور پتھر کے درمیان کوئی فرق نہیں، اس زندگی کے حاصل کرنے میں نہ اس کے ارادہ کو دخل ہے، نہ اختیار کو، یہ دولت اس نے کمائی نہیں ہے، بلکہ خدا کی طرف سے مفت اور بے قیمت اسے فراہم کی گئی ہے، اسی لئے زندگی کا احترام ضروری ہے، خواہ زندگی اپنی ہو یا دوسرے کی۔

اسلام نے نہ اپنی زندگی سے کھیلنے کی اجازت دی، اسی لئے خودکشی کو حرام کیا گیا، جان بچانے کے بقدر کھانے کو واجب قرار دیا گیا، اور علاج کی ترغیب دی گئی اور نہ اس بات کی اجازت دی گئی کہ کوئی شخص دوسروں کی جان سے کھیلنے کی کوشش کرے اور کسی اور کی زندگی کے درپے ہو، اسی لئے قرآن مجید نے قاتل کے تئیں فرمایا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بنے گا، (نساء: ۹۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن جب تک خونِ حرام کا مرتکب نہیں ہوتا، اپنے دین کی وجہ سے وسعت میں رہتا ہے۔ (بخاری: حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

دنیا کی ساری نعمتیں وہ ہیں کہ اگر ضائع کر دی جائیں تو ان کی تلافی ممکن ہے، اگر کسی کے پیسے لے لئے یا زمین غصب کر لی، تو غصب کی ہوئی چیز واپس کر کے یا اس کی قیمت ادا کر کے اس کی تلافی ہو سکتی ہے، کسی کی شان میں گستاخی کی گئی، تو اپنی غلطی کا اعتراف اور معذرت خواہی کے ذریعہ کچھ نہ کچھ اس مصیبت زدہ کا غم غلط ہو جاتا ہے، جسم میں کہیں زخم آیا تو علاج ہو سکتا ہے، لیکن جان جا کر واپس نہیں آتی، اگر اثر ورسوخ کے ذریعہ زندگی واپس لائی جا سکتی تو دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ، جن کی قبروں کے نشان بھی باقی نہیں ہیں، آج بھی

موجود ہوتے ، اگر سیم وزر کی زنجیروں سے موت کے فرشتوں کے ہاتھ باندھے جاسکتے تو دولت مندوں کے گھر کسی کی موت واقع نہ ہوتی ، اگر علم وآگہی کی طاقت سے موت کو روکا جاسکتا تو بڑے بڑے فلاسفہ اور سائنس داں ، جن کے نام ہم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں ، انھیں آج ہم اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ بھی لیتے ، لیکن کیا کیجئے کہ موت بھی ایک عجب سخت جان حقیقت ہے ، نہ بادشاہ کو دیکھتی ہے ، نہ فقیروں کو ، نہ طاقتور کو دیکھتی ہے ، نہ کمزوروں کی آہ سے پسیجتی ہے ، نہ جوانوں پر ترس کھاتی ہے ، نہ بچوں پر رحم کرتی ہے ، اور پروانۂ خداوندی پاتے ہی اپنے شکار کو آدبوچتی ہے ، اس لئے کسی انسان کی جان لے لینا ایک ناقابل تلافی جرم ہے۔

لوہا لوہے کو کاٹتا ہے ، اسی طرح جرم کی مناسبت سے سزادی جائے گی ، تبھی سزا جرم کو روکنے میں کامیاب ہوسکتی ہے ، اگر کسی ظالم نے ایک محتاج و بے کس شخص کے ایک لاکھ روپے زبردستی لے لئے اور آپ نے اس کی سزا میں کہا کہ صرف پچیس ہزار روپئے ادا کردو ، کیوں کہ اس سے زیادہ لینا غصب کرنے والے شخص کے ساتھ ظلم وزیادتی ہوگی ، تو کیا یہ انصاف کی بات ہوگی یا انصاف کا قتل ہوگا؟ ظالم کے ساتھ درگذر دراصل مظلوم کی مظلومیت میں اضافہ کرنا ہے ، اسی طرح ایک شخص نے کسی بے قصور انسان کو اپنے ارادہ واختیار سے مجرمانہ جذبہ کے تحت قتل کردیا ، تو انصاف کا تقاضہ اسی وقت پورا ہوگا ، جب اس قاتل کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے ، اگر اسے چند سال قید کی سزا دے دی گئی ، یا عمر قید کے نام پر کچھ زیادہ عرصہ جیل میں رکھا گیا ، تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک لاکھ روپئے ادا کرنے کا مکلّف بنایا جائے ، اس سے جرم کی حوصلہ افزائی ہوگی اور مجرم کے لئے سزا باعث عبرت بننے کے بجائے اس کے مجرمانہ طرزِ عمل کے لئے مہمیز کا کام کرے گی۔

اسی لئے اسلام نے بنیادی طور پر قتل کی سزا قتل رکھی ہے النفس بالنفس (المائدہ:۴۵) اللہ تعالیٰ نے ایک موقعہ پر قانون قصاص کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ قصاص بظاہر ایک قتل کے بعد دوسرے قتل کا واقعہ ہے ، لیکن حقیقت میں یہ قتل کو روکنے کا ذریعہ اور انسانی زندگی کے

تحفظ کا سامان ہے، ولكم في القصاص حياة يا أولي الألباب (البقرہ:۱۷۹) چنانچہ مختلف ملکوں میں تجربہ کیا گیا ہے کہ سزائے موت ختم کرنے کے بعد جرم کی مقدار بڑھ گئی اور اس سے مجرمین کو حوصلہ ملا، کیوں کہ کسی انسان کو موت کا خوف جس قدر متاثر کرتا ہے، کوئی اور چیز اس درجہ متاثر نہیں کرتی، اور جرائم سے باز رکھنے میں مؤثر نہیں ہوتی۔ یہ تو دن رات کا تجربہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو بچانے کے لئے کتنی احتیاطی تدبیریں روبہ عمل لاتا ہے، اور جہاں دور کا بھی خطرہ ہو، وہاں قدم رکھنے سے گریز کرتا ہے، ممکن نہیں کہ چند ماہ کی قید وبند کا خوف یا کچھ جرمانے کا اندیشہ اسے کسی غلط کام سے باز رکھنے میں اس درجہ مؤثر ثابت ہو۔

ابھی ۱۴/ اگست ۲۰۰۴ء کو دھن جئے چٹر جی پر سزائے موت کی تعمیل کی گئی، وہ کولکتہ کے قریب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا، ۵/ مارچ ۱۹۹۹ء کو اس نے آنند اپارٹمنٹ کولکتہ میں مقیم ایک چودہ سالہ طالبہ ہیتل پاریکھ کی عصمت دری کے بعد اسے بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا تھا، یہ مقدمہ مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے چودہ سال کے بعد اپنے نتیجہ کو پہنچا اور ۱۴/ اگست کو علی پور جیل، کلکتہ میں صبح ساڑھے چار بجے اسے پھانسی دے دی گئی، اس کو پھانسی دینے والے جلاد ناٹا ملک کی عمر ۸۳ سال ہے، وہ اس سے پہلے اپنی زندگی میں ۲۴/ مجرمین کو پھانسی دے چکا تھا۔

ہندوستان میں آزادی سے پہلے بھی سزائے موت کا قانون تھا، لیکن انگریزوں کے ہاتھوں اس قانون کا ناروا استعمال ہوتا تھا، اور جنگِ آزادی کے مجاہدین کو جرم بے گناہی میں پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی سزائے موت برقرار رکھی گئی، اور ۱۵/ نومبر ۱۹۴۹ء کو ناتھورام گوڈ سے کو مہاتما گاندھی کے قتل کے جرم میں پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا، اندرا گاندھی کے قاتلوں کو بھی ۱۹۸۹ء میں سزائے موت دی گئی، ہندوستان میں حقوق انسانی کی بعض تنظیمیں سزائے موت کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں، ابھی چٹر جی کو پھانسی دیئے جانے کے موقعہ پر بھی انسانی حقوق کی تنظیموں نے مظاہرے منظم کئے اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن مقامی عدالت، پھر ہائی کورٹ، اس کے بعد ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے

فیصلے اور صدر جمہوریہ کی جانب سے رحم کی درخواست کو مسترد کر دینے کے بعد، مجرم کو سزا دینے کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی۔

سوال یہ ہے کہ سزائے موت کی تنسیخ کا مطالبہ کیا درست سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا یہ انسانی سماج کے لئے مفید ہے؟ یہ ظالم کی مدد کرنا تو نہیں؟ کیا اس بات کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ ظالم کی جان کے بارے میں تو ہمیں ہمدردی اور اس کے حق کا پاس ولحاظ ہو اور مظلوم کی جان کے سلسلہ میں رحم دلی اور انسانیت دوستی کا کوئی جذبہ نہ اُبھرے، اور اس کے انسانی حق کا پاس ولحاظ نہ کیا جائے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو حقوق انسانی کے نام پر سزائے موت کی تنسیخ کا مطالبہ کرنے والے لوگوں کے لئے قابل توجہ ہیں۔

دنیا کے متعدد ممالک میں سزائے موت کے خاتمہ کا تجربہ کیا گیا ہے اور تجربات نے ہمیشہ یہی ثابت کیا ہے کہ'' موت کی سزا موت'' میں ہی انسانی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے، ہمارے پڑوسی ملک سری لنکا میں ۱۹۵۶ء میں ایک قانون بنا اور اس کے تحت سزائے موت کو ختم کر دیا گیا، لیکن ہوا یہ کہ اس کے بعد جرائم میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا، یہاں تک کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ایک شخص وزیر اعظم بندرا نائیکے کے گھر میں گھس آیا اور انھیں نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا، چنانچہ وزیر اعظم کی آخری رسومات انجام دینے کے بعد پارلیمینٹ کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا اور چار گھنٹے کے بحث ومباحثہ کے بعد دوبارہ سزائے موت کا قانون بحال کیا گیا۔

یہ عجب بات ہے کہ مغربی ممالک میں خاص طور پر سزائے موت کے غیر انسانی ہونے کی بات کہی جاتی ہے، بوسنیا میں لاکھوں انسان قتل کر دئے گئے، فلسطین میں ہر دن کتنے ہی بے قصور قتل کر دئے جاتے ہیں، افغانستان اور عراق میں آئے دن انسانیت سوز بمباری کی جاتی ہے، کیوبا میں قیدیوں کو درندہ جانوروں سے بھی بدتر حالت میں رکھا گیا ہے، لیکن انسانی حقوق کے علم برداروں، بلکہ چوکیداروں کو ان واقعات پر کوئی شرم نہیں آتی، لیکن اگر کہیں ایک ثابت شدہ مجرم پر سزائے موت جاری کی جائے، تو رگِ انسانیت پھڑک اٹھتی ہے، مغرب کے رویے

میں زندگی کے ہر شعبے میں ایسا تضاد پایا جاتا ہے کہ جس سے انصاف کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے اور سچائی کو منھ چھپانا پڑتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ موت کی سزا کا تصور تمام مذاہب میں موجود ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی ہے، بائبل میں بھی ہے اور قرآن مجید میں بھی اور یہی فطرتِ انسانی کا تقاضہ اور اس کی حفاظت اور سلامتی کا ذریعہ ہے!

۳/رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

❑ ❑ ❑ ❑

رائی کا پہاڑ

شریعت میں تمام احکام کی بنیاد عدل اور انسانی ضرورت و مصلحت کی تکمیل پر ہے، اس لئے اسلام کا کوئی حکم اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے مصلحت کے مغائر اور عدل کے خلاف نہیں ہوسکتا، قرآن مجید نے صاف طور پر کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی باتوں کا حکم دیتا ہے جو عدل اور خوش اطواری پر مبنی ہوں إِنَّ اللّٰـهَ يَـأْمُـرُ بِالْعَدْلِ وَ الإِحْسَانِ (سورۃ النحل) اسلام نے اپنی اسی مزاج کی بناء پر دنیا سے ترکِ تعلق کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ تعلق کی حدیں قائم کی ہیں اور ان حدود میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے، مال کو خیر (البقرۃ:۱۸) اور فضل (البقرۃ :۱۹۸) جیسے معزز الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا، لیکن حرام اور ناروا طریقہ پر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی اسی درجہ مذمت کی گئی، زنا کو حرام قرار دیا گیا اور سب سے سخت سزا زانی مرد و عورت کی ہی مقرر ہوئی، لیکن نکاح کی ترغیب دی گئی اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اسے اپنی سنت قرار دیا، یہی حال دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں بھی اسلام کے توازن واعتدال اور انسانی فطرت و مصلحت سے اس کی مطابقت اور ہم آہنگی کا ہے۔

دنیا کے بعض ایسے مذاہب جن کے ماننے والے بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، نکاح کو اٹوٹ رشتہ قرار دیتے ہیں، یہاں تک کہ یورپ میں عیسائی تصور کے تحت بعض ترقی یافتہ اور متمدن ممالک میں بھی بیسویں صدی کے ربع اول تک عیسائی تصور کے زیر اثر یہ نقطۂ نظر پایا جاتا تھا کہ جسمانی زنا اور روحانی زنا (عیسائیت سے ارتداد) کے علاوہ کسی اور سبب کے تحت میاں بیوی میں تفریق نہیں ہوسکتی تھی اور ان صورتوں میں بھی تفریق کی نوعیت یہ ہوگی کہ زوجین ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں گے، لیکن وہ دوسرا نکاح نہیں کرسکیں گے، ہندو مذہب میں بھی طلاق اور علاحدگی کا تصور نہیں تھا، کیوں کہ عورت کی حیثیت مرد کی جائداد کی ہے نہ کہ ایک ایسے فریق کی جو اپنی ذات کے بارے میں اختیارات کا حامل ہو۔

شریعتِ اسلامی میں نکاح کو معاہدہ قرار دیا گیا اور شوہر و بیوی اس معاہدہ کے دو فریق قرار پائے، پھر مرد کو سر براہِ خاندان کی حیثیت دی گئی اور اس کے اختیارات عورت کے مقابلہ کسی قدر زائد رکھے گئے، چنانچہ نکاح کو قبول کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دونوں کو مساویانہ طور پر حاصل ہے، گو دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں ان کی صلاحیت اور لیاقت کے اعتبار سے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے تئیں حقوق و واجبات کی ادائیگی کا لزوم مساوی طور پر ہے، وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرۃ:۲۲۸) البتہ سر براہِ خاندان ہونے کی حیثیت سے شوہر کو علاحدگی کے سلسلہ میں زیادہ اختیار دیا گیا ہے، وہ ایک طرفہ طور پر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، مگر اس اختیار کے ساتھ بھی اخلاقی پابندیاں رکھی گئی ہیں کہ وہ کسی مناسب سبب کے بغیر طلاق کا اقدام نہیں کرے۔

دوسری طرف بیوی کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر اس پر مرد کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو رہی ہو یا کسی وجہ سے زوجین کے درمیان ایسی شدید نفرت پیدا ہو گئی کہ وہ ایک دوسرے کی نسبت سے عائد ہونے والے حقوق کو ادا نہیں کر سکتے، تو عدالت کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہے، شرعی عدالت اس کے استغاثہ کی مناسب تحقیق کرے گی اور اگر اس کے نزدیک عورت کا دعویٰ ثابت ہو جائے اور وہ محسوس کرلے کہ عورت اپنے شوہر کی طرف سے ظلم اور ضرر میں مبتلا ہے، تو چوں کہ ظلم کا دروازہ بند کرنا اور ضرر کو دور کرنا شریعت کے مقاصد میں سے اہم مقصد ہے، اس لئے قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا۔

ابھی گذشتہ دنوں ایک خاص واقعہ میڈیا کا موضوع بنا رہا، واقعہ یہ ہے کہ عارف نامی ایک شخص فوج میں ملازم ہے، جسے بعض فوجی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے، چند سال پہلے پاکستان نے اسے قید کر لیا، شاید ہندوستانی فوج کو اس کا پتہ نہیں چل سکا، تین سال تک کوئی اتا پتا نہ ملنے کے بعد فوجی محکمہ نے اسے مردہ ڈکلیر کر دیا، اسی بنیاد پر اس کی بیوی (جس کا نام گڑیا ہے) نے توفیق نامی شخص سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد قریب ایک سال کا عرصہ گذرا ہے کہ ہند و پاک کے ایک معاہدہ کے تحت عارف رہا ہو گیا، جب کہ گڑیا دوسرے شوہر سے حاملہ ہے، اب سوال پیدا ہوگا کہ اسے کس کی بیوی سمجھا جائے؟ اور جو بچہ زیرِ حمل ہے، وہ کس کی

طرف منسوب ہوگا؟

اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر مرد لا پتہ ہو جائے، تو تین صورتیں ہو سکتی ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی اتنی جائداد اور ذریعۂ آمدنی چھوڑ کر نہیں گیا ہو کہ اس سے بیوی کے نفقہ کا سروسامان ہو سکے، خود عورت بھی اپنا نفقہ خود پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور فسخ نکاح کی طلب گار ہو، تو عدالت اس کا نکاح فسخ کر دے گی، اس کے لئے کوئی خاص مدت مقرر نہیں ہے، بلکہ قاضی جتنے عرصہ کے بارے میں سمجھے کہ عورت بغیر نفقہ کے زندگی نہیں گزار سکتی، اتنی مدت پر قاضی نکاح فسخ کر دے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر نے کوئی ایسی جائداد چھوڑی ہو جس سے بیوی کا نفقہ ادا ہو سکتا ہو، لیکن عورت محسوس کرتی ہو کہ شوہر کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ فتنہ اور مصیبت میں مبتلا ہو سکتی ہے تو گو نفقہ موجود ہو پھر بھی قاضی نکاح فسخ کر دے گا، کیوں کہ نکاح کا اصل مقصد ہی عفت وعصمت کی حفاظت اور جائز طریقہ پر صنفی ضرورت کی تکمیل ہے، اس میں بھی مدت کی کوئی تحدید نہیں ہے، البتہ ایلاء کی مدت چار ماہ ہے، یعنی اگر کسی مرد نے اپنی بیوی سے چار ماہ قربت نہ کرنے کی قسم کھائی تو اس مدت کے گزرنے کے ساتھ ہی عورت پر طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی، گویا عورت اس بات کا مطالبہ کرے کہ شوہر کی اس سے دوری چار ماہ سے زیادہ عرصہ کی ہے اور اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے تو اس کا یہ مطالبہ حق بجانب ہوگا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ شوہر نفقہ کے اسباب چھوڑ کر گیا ہو اور عورت اپنے لئے بظاہر کوئی بڑا فتنہ اور معصیت کا اندیشہ محسوس نہیں کرتی ہو، اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور بعض فقہاء کا خیال ہے کہ جب تک اس کے شوہر کے ہم عمر لوگوں کی موت واقع نہ ہو جائے اس کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں، اور یہی فیصلہ صحابہ میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے، امام مالکؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلہ کو بنیاد بناتے ہوئے یہ رائے اختیار کی ہے کہ عورت کی طرف سے عدالت میں استغاثہ کرنے کے بعد عدالت چار سال تک انتظار کا حکم دے گی اور اس درمیان اس کی گم شدگی کی تشہیر کرتی رہے گی، پھر چار سال کے بعد نکاح فسخ کر دے گی، اور اس

کی عدت چار مہینہ دس دن ہوگی جو عدت وفات ہے، اگر عدت کے درمیان ہی شوہر واپس آجائے تو اسے عورت کو لوٹانے کا حق ہوگا اور اگر عدت گزرنے کے بعد آیا تو وہ اس کی بیوی باقی نہیں رہی، اسی طرح پہلی دو صورتیں یعنی نفقہ نہ ہونے یا معصیت کا خطرہ ہونے کی وجہ سے جو عدالت نکاح فسخ کرے گی وہ طلاقِ بائن کے حکم میں ہوگی، یعنی اگر عدت کے درمیان بھی شوہر واپس آگیا تب بھی عورت کے اختیار پر ہوگا، اگر وہ راضی ہو تو از سر نو دوبارہ نکاح ہوگا۔

شوہر کے لا پتہ ہونے کی ان تینوں صورتوں کے متعلق جو تفصیل ذکر کی گئی، یہ فقہ مالکی پر مبنی ہے اور موجودہ دور میں خاص کر ہندوستان کے حالات میں ان مسائل کی بابت علماء نے اسی پر فتوی دیا ہے، بلکہ عالم اسلام میں پرسنل لاء سے متعلق قوانین میں ان مسائل پر فقہ مالکی کو ہی زیادہ قابل عمل سمجھا گیا ہے، غور کیا جائے تو گم شدہ شوہر کی بیوی کے مسئلہ پر یہ نہایت ہی متوازن اور معتدل نقطۂ نظر ہے، جس میں دونوں فریق کی رعایت اور معاشرتی مصالح کا پورا پورا لحاظ ہے۔

ایک سوال اور بھی ہے، اگر کسی عورت کو یہ خبر دی جائے کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے، تو کیا وہ اس خبر پر اعتماد کر کے دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، یعنی اگر کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جو اس خبر کو غلط ٹھہراتا ہو، تو اس خبر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ ایسے معاملات میں ایک شخص کی خبر بھی معتبر ہے، البتہ اگر یہ خبر غلط ہو، تو اس خبر کی بنیاد پر انجام دئے جانے والے افعال بھی نامعتبر اور بے اثر قرار پائیں گے، لہٰذا اگر ایسی خبر کی بنیاد پر عورت نے دوسرا نکاح کر لیا، اور بعد کو شوہر اول واپس آگیا تو وہی اس کا شوہر سمجھا جائے گا، غور کیجئے تو اس میں بڑی مصلحت ہے، کیوں کہ اگر پہلے شوہر کے حق ازدواجی کی حفاظت کا اہتمام نہ کیا جاتا اور کسی بھی خبر پر عورت کو دوسرے نکاح کی اجازت دی جاتی اور اسی نکاح کو معتبر اور باقی مانا جاتا تو اس سے بے راہ روی کا راستہ کھل سکتا تھا، ہوس پرست قسم کے لوگ اگر کسی منکوحہ عورت کو اپنے تصرف میں لینا چاہتے، تو اس کے شوہر کی موت کی غلط اطلاع فراہم کرتے، ہمیشہ کے لئے اس کو اپنے نکاح میں لے آتے، اور ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے شوہر اول کو چند دنوں

اغواء کر کے خود نکاح کر لیتے اور وہ شخص بلاقصور اپنی بیوی سے محروم ہو جاتا۔

پس گمشدہ شوہر کی بیوی سے متعلق اسلامی احکام میں عورت کی واجبی ضرورت کی رعایت بھی ہے اور شوہر کے حقوق کی حفاظت بھی، اب جو واقعہ پیش آیا ہے، اس میں صورت حال یہ ہے کہ عورت نے قاضیٔ شریعت کے پاس فسخ نکاح کا دعوی دائر نہیں کیا، اور نکاح کے سلسلہ میں جو عدالت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے، اس کی طرف سے فسخ نکاح کا فیصلہ بھی نہیں ہوا، فوجی محکمہ کا مذکورہ شخص کو مردہ قرار دینا ایک خبر کے درجہ میں ہے، عورت کو اس خبر پر اعتماد کرتے ہوئے نکاح کرنے کی گنجائش تو ضرور تھی، لیکن شرعی اور قانونی طور پر اس کا نکاح شوہر اول سے فسخ نہیں ہوا ، لہٰذا یہ بات پوری طرح قرینۂ عقل ہے کہ اگر یہ خبر غلط ثابت ہو جائے اور اس کا شوہر واپس آجائے تو وہ شوہر اول ہی کی بیوی سمجھی جائے ، اور اس کا دوسرا نکاح غلط اطلاع پر مبنی ہونے کی وجہ سے کالعدم قرار پائے ، سوائے اس کے کہ شوہر اول طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے اور عدت گزرنے بعد دوبارہ دوسرے شخص سے اس کا نکاح ہو، یہ نہ صرف شرعی حکم ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ قانونی نقطۂ نظر سے بھی یہی درست رائے ہو سکتی ہے، جہاں تک حمل کی بات ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ چوں کہ ایک غلط فہمی ہی کی بناء پر سہی عورت اور دوسرے مرد کے درمیان ایجاب وقبول ہوا ہے اور ان دونوں نے قانونی طور پر نکاح سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذاری ہے، اس لئے اس کا آپس میں جنسی تعلق ''وطی بالشبہ'' قرار پائے گا، یعنی مرد نے اس عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر اس سے صحبت کی ہے، اور ایسے تعلق کی بنا پر جو حمل قرار پاتا ہے، وہ ہم بستر ہونے والے مرد سے منسوب ہوتا ہے اور اس کو ثابت النسب مانا جاتا ہے، لہٰذا شرعاً وہی دوسرا مرد اس بچہ کا باپ قرار پائے گا، اور تمام حقوق اس کے ذمہ واجب ہوں گے، اس میں بھی اسلام نے انسانی کرامت وشرافت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، نسب انسان کی شناخت کا ذریعہ اور تمام حیوانات میں اس کا امتیاز ہے، اور کسی شخص کو اس نسبت سے محروم کر دینا اس کے لئے ننگ وعار کا باعث ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو، فقہاء نے نسب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ کسی زندہ شخص کے بارے میں مردہ ہونے کی غلط فہمی پیدا ہو جانا اور موت کی اطلاع کا غلط مشہور ہو جانا اور اس کی بنیاد پر عورت کا دوسرا نکاح کر لینا ایک ایسی بات ہے جو تمام ہی طبقات میں پیش آسکتی ہے، بلکہ پیش آتی رہتی ہے، یہ بات بھی تمام لوگوں کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ غلط اطلاع کی بنیاد پر جو عمل کیا جاتا ہے، وہ معتبر اور قابل قبول نہیں ہوتا، اور یہ بات بھی سبھوں کو تسلیم ہے کہ نکاح اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لئے مطلوبہ طریقۂ کار اختیار نہ کیا جائے، علماء نے جو فتاویٰ دیے ہیں وہ ان ہی مسلمہ اصولوں پر مبنی ہیں، لیکن ذرائع ابلاغ کے اندر اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا جو رجحان پیدا ہو چکا ہے، اس کے تحت اس اتفاقی اور غیر معروف واقعہ کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ گویا صرف مسلمانوں ہی میں اس طرح کی بات پیش آئی ہو یا پیش آتی ہو، اور اس میں اسلامی شریعت کی کوتاہی اور اس کے ماننے والوں کا قصور ہے!

۱۵/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ یکم اکتوبر ۲۰۰۴ء

❑ ❑ ❑ ❑

صلیبی یلغار

اسلام —— دینِ محمدی ﷺ —— سے قریب ترین زمانہ جس مذہب کا ہے، وہ ہے عیسائیت؛ کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ۵۷۰ سال بعد رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی حال میں ہمارے عقیدہ کے مطابق آسمان پر اٹھائے گئے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے خیال کے مطابق تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے، جب آپ کے ماننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے، اور ان چند ایمان لانے والوں میں بھی کچھ مخلصین تھے اور کچھ منافقین، ایسے کہ دشمنوں سے مخبری کرنے میں بھی انھیں کوئی تأمل نہیں تھا، یہودیوں کے مزاج میں قساوت، سخت دلی اور انبیاء کے ساتھ بدسلوکی داخل رہی ہے، یہ بدسلوکی اور ایذا رسانی انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی کی جنھیں وہ خود نبی اور رسول تسلیم کرتے تھے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام —— جن کی طرف قومِ یہود اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے —— بھی ان کی تیشہ زنی سے محفوظ نہیں رہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو وہ پیغمبر تسلیم ہی نہ کرتے تھے، بلکہ ان کی معجزانہ پیدائش کے واقعہ کو بدکاری کا عنوان دیتے تھے، اس لئے ان کے ساتھ یہودیوں کا جو سلوک رہا ہوگا، وہ محتاجِ اظہار نہیں، آج بھی بائبل کے عہد جدید میں اس کے متعلق کچھ احوال پڑھے جاسکتے ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودی علماء اور مذہبی قیادت سے خطاب فرماتے ہوئے جو باتیں فرمائی ہیں اور جو تشبیہات ان کے لئے استعمال کی ہیں، ان سے بخوبی یہودیوں کی عداوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہودیوں نے اوّلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین پر جور و ستم ڈھائے، انھیں ظلم کا نشانہ بنایا اور بالجبر انھیں مرتد کرنے کی کوشش کی، لیکن جب انھیں اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تو اب انھوں نے ہتھیار بدل دیا، نفرت کے بجائے محبت اور دشمنی کے بجائے دوستی کا اسلوب اختیار کیا، اور بظاہر ان میں سے کچھ لوگوں نے عیسائیت کو قبول کر کے عیسائیت کو مسخ کرنا اور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات وفرمودات میں تحریف کرنا شروع کردیا، ان ''عیسائی نما یہودیوں'' میں سب سے اہم شخصیت ''پولس'' کی ہے، جس نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی ذہانت ولیاقت سے ایسا غلبہ حاصل کرلیا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض رفقائے عالی مقام ——جو دینِ حق اور حقیقی عیسائیت کے حامل تھے——کو بھی کنارہ لگا دیا اور پولس کے خلاف ان کی صدائے احتجاج نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔

اس طرح ایک خود ساختہ، تحریف شدہ اور خلافِ واقعہ عیسائیت کی تشکیل کا آغاز ہوا، جس میں دو عقیدے بنیادی اہمیت کے حامل قرار پائے، ایک یہ کہ تین ہستیوں کا مجموعہ خدا ہے: باپ، بیٹا، اور روح القدس، پھر اس عقیدہ کی تشریح میں کتنے ہی عیسائی فرقے وجود میں آئے اور انھوں نے آپس میں ایسے قتل وقتال کئے کہ مذہب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، یہ ''ایک میں تین'' اور ''تین میں ایک'' کا عقیدہ لال بوجھکڑ سے کم نہیں، لیکن کیا کہیے کہ تعلیم یافتہ عیسائی دنیا کی غالب اکثریت اسی پہیلی پر یقین رکھتی ہے۔

دوسرا بنیادی عقیدہ ''عقیدۂ کفارہ'' ہے، یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء نے جس ممنوعہ درخت کے کھانے کا ارتکاب کیا تھا، وہ ''گناہ'' (بقول عیسائیوں کے) نسل در نسل چلا آرہا تھا، اس لئے ان سب کو جہنم رسید ہونا تھا، اس لئے خدا کی صفتِ رحم کا تقاضہ ہوا کہ ان کو دوزخ سے بچانے کی تدبیر کی جائے اور ان کی غلطیوں کا کفارہ ادا کیا جائے، اس کفارہ کے لئے خدا نے نعوذ باللہ اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا کہ وہ قربان ہوکر اس نسلی گناہ کا کفارہ بن جائے، چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام تختۂ دار پر چڑھ کر کفارہ بن گئے، غور کیجئے کہ غلطی کسی اور نے کی ہے اور سزا کسی اور کو دی جارہی ہے، گناہ باپ نے کیا اور وہ پشتہا پشت اس کی نسلوں میں منتقل ہورہا ہے، اور پھر خدا اتنا عاجز ہے اور اس کے ہاتھ اس قدر بندھے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے بندے کو معاف بھی نہیں کرسکتا، تا آنکہ خود اپنے بیٹے کو بھینٹ نہ چڑھا دے؟؟

ان ہی دونوں عقیدوں پر عیسائیت کی بنیاد ہے، اور حیرت اس بات پر ہے کہ یہ باتیں عقل وخرد کے خلاف تو ہیں ہی؛ بلکہ ایسی خرافات ہیں کہ ایک عام آدمی بھی بہ خوبی اسے سمجھ سکتا ہے،

لیکن اس کے علاوہ انجیلوں کی موجودہ تحریف شدہ صورت میں بھی اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور کوئی صریح ارشاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا ان کے حواریوں کا اس کی تائید نہیں کرتا؛ بلکہ کتنی ہی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی عبدیت اور بندگی کا اعلان فرماتے ہیں، افسوس کہ اس کے باوجود عیسائی دنیا یہودیوں کے بنے ہوئے اس دامِ فریب سے اب تک باہر نکل نہیں سکی :

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اس بگاڑ کی وجہ سے مصنوعی عیسائیت یونانیوں کے لئے قابل قبول ہوگئی، دنیا کے مختلف مذاہب میں ''تثلیث''، یعنی تین خداؤں کا تصور رہا ہے، خود ہندوؤں کے یہاں بھی دیوتاؤں کی کثیر التعداد فوج میں اعلیٰ ترین درجہ کے تین خداؤں کا تصور موجود ہے، یونانیوں کے یہاں بھی تین خدا مانے جاتے تھے: باپ، بیٹا اور بیوی، اس لئے عیسائیت کی یہ بدلی ہوئی شکل یونانیوں کے لئے قابل قبول ہوگئی، یونانی بادشاہت نے اس مذہب کو اپنے قدیم تصورات سے ہم آہنگ ہونے کی بناء پر قبول کرلیا اور یہی سرکاری مذہب قرار پایا، نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی عیسائیت تو ناپید ہوتی چلی گئی، لیکن اس تحریف شدہ عیسائیت کو ایسا غلبہ واقتدار اور شوکت وشکوہ حاصل ہوا کہ خود یہودیت کے لئے جائے پناہ باقی نہیں رہی، اور انھیں دور دراز صحراؤں اور ریگستانوں کی پناہ لینی پڑی، ان ہی پناہ گزینوں میں ایک ٹکری وہ تھی، جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مدینہ منورہ میں آباد تھی۔

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اس قدر واضح تھی اور تورات وانجیل میں اس کے لئے اتنی واضح برہان موجود ہے کہ اہل کتاب کے لئے اس سے انکار کا کوئی معقول سبب موجود نہیں تھا، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ آپ کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو، ''یعرفونه کما یعرفون أبنائهم '' (البقرۃ:۱۴۶) اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے پس منظر میں فرمایا کہ حضور ﷺ کی نبوت بمقابلہ اپنی اولاد کی پہچان کے بھی زیادہ واضح ہے، کیوں کہ اولاد کے سلسہ میں کسی درجہ بیوی کی خیانت کا شبہ ہوسکتا ہے، لیکن

آپ ﷺ کی نبوت کے نشانات اس قدر واضح ہیں کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، چنانچہ جب ہرقل بادشاہِ روم کو آپ ﷺ کا مکتوبِ گرامی پہنچا تو اسے یہ یقین کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ آپ ہی وہ آخری رسول ہیں، جس کا آسمانی صحائف میں وعدہ کیا گیا ہے، حالانکہ اس نے صرف مکہ کے کچھ لوگوں سے — جو آپ ﷺ پر ایمان نہیں لائے تھے — آپ ﷺ کے احوال سنے تھے، دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن عیسائیوں اور یہودیوں کے ایمان لانے میں جو چیز رکاوٹ بن گئی، وہ یہ تھی کہ ان قوموں کا نسلی تعلق حضرت اسحاق علیہ السلام سے تھا اور رسول اللہ ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے، اور آج تک یہ تعصب حق کو قبول کرنے میں سدِ راہ بنا ہوا ہے۔

مسلمانوں سے عیسائیوں کا بغض اس وقت اور بڑھ گیا جب صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، ۴۹۴ھ مطابق ۱۰۹۶ء میں ان جنگوں کا آغاز ہوا اور تقریباً دوسو سال کے بعد ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء پر مسلمانوں کی کامیابی کے ساتھ یہ جنگ اختتام کو پہنچی، اس نے صلیبی دنیا کو پست اور حوصلہ شکستہ بنا کر رکھ دیا، اور بعض علاقوں میں عیسائیوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا، یہاں تک کہ ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ مطابق ۲۹/ مئی ۱۴۵۳ء کو عالم عیسائیت کا پایۂ تخت قسطنطنیہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگیا اور تکبیر و تہلیل کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

صلیبی جنگوں کی فیصلہ کن شکست کے بعد بجائے اس کے کہ عیسائی اسلام کی حقیقت کو سمجھتے، اس کی حقانیت کو ٹھنڈے دل سے پرکھتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے، انھوں نے مسلسل تصادم اور عناد کا راستہ اختیار کیا، بالآخر دوسری جنگِ عظیم کے بعد انھوں نے عالم اسلام کے ٹکرے ٹکرے کر دیے، اور یورپ کے مختلف ملکوں نے مختلف اسلامی علاقوں کو بہ جبر اپنے کنٹرول میں لے لیا، جس میں برطانیہ، فرانس اور ڈچوں و پرتگالیوں کا اہم کردار رہا ہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، چنانچہ افغانستان اور عراق کی صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔

دوسرا محاذ فکری یلغار کا اختیار کیا گیا ہے، یہ یلغار دو طریقوں پر ہوئی، مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں کے ذریعہ، اور اسلام پر بے جا اعتراضات و شبہات کا اظہار کر کے، تا کہ

مسلمانوں کی نئی نسل اپنے دین کے بارے میں مشکوک ہو جائے اور دین حق پر اس کا یقین متزلزل ہوکر رہ جائے، تبلیغ عیسائیت کی کوششوں کے بارے میں تو آگے گفتگو ہوگی، لیکن عیسائی دنیا کا تشکیکی فتنہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہے، اسی مقصد کے لئے یہودیوں اور عیسائیوں نے مل کر ایک مستقل فن ''استشراق'' (Oraintalism) کو وجود بخشا، استشراق کے معنی بیان کئے گئے ہیں: مشرقی علوم، مذاہب اور تہذیبوں کا مطالعہ، لیکن عملاً استشراق کا نشانہ مسلمان اور اسلام رہے ہیں، تمام مذہب، افکار اور فلسفوں کی جائے پیدائش مشرق ہی رہا ہے، لیکن اسلام، مسلمان اور عرب کے علاوہ دورے مذاہب اور قوموں پر مستشرقین نے بہت کم قلم اٹھایا ہے، اسلام کے بارے میں ان کی کاوشوں کا حال یہ ہے کہ اس وقت یورپ میں بیسوں ادارے خاص اس مقصد کے لئے قائم ہیں، یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے شب و روز اسی کام میں مصروف ہیں اور سال اور مہینہ نہیں؛ بلکہ قریب قریب ہر دن عیسائی دنیا سے کوئی نہ کوئی کتاب اسلام کے خلاف ضرور ہی لکھی جاتی یا طبع کی جاتی ہے، یہ مسخ شدہ، خلافِ واقعہ اور معاندانہ لٹریچر ہی عیسائی دنیا میں اسلام کے تعارف کا ذریعہ ہیں، اور اس میں بڑا حصہ عیسائیوں سے زیادہ یہودیوں کا ہے، یا ان غیر یہودی مصنّفین کا جنھوں نے یہودی اساتذہ کے زیر اثر علم و تحقیق کا سفر طے کیا ہے۔

صلیبی یلغار کا تیسرا محاذ مسلمانوں میں تبدیلیٔ مذہب کی کوششیں ہیں، عیسائی مشنریز کے لئے یہ بات حیرت کا باعث رہی ہے کہ انھوں نے دنیا کی مختلف اقوام میں کامیابی کے ساتھ عیسائیت کی تحریک چلائی ہے، بودھ مذہب اور ویدک دھرم پر یقین رکھنے والے کتنے ہی لوگوں نے بہ سہولت عیسائیت قبول کر لی ہے، لیکن مسلمانوں میں غربت اور تعلیمی پسماندگی کے باوجود ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہے، انھیں اس بات پر بھی حیرت ہے کہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے وابستگی بڑھتی جا رہی ہے اور عیسائیوں کی نئی نسل اسی قدر اپنے مذہب سے بیزار اور بے تعلق ہے، یورپ میں کتنے ہی گرجا گھر ویران ہو چکے ہیں اور ایک اچھی خاصی تعداد ان گرجوں کی ہے جو آج مسجد بن چکی ہیں اور وہاں سے ندائے توحید بلند ہوتی ہے، برطانیہ میں

۱۹۹۵ء کے اعداد وشمار کے مطابق چرچ جانے والے عیسائیوں کی تعداد ۸/ لاکھ ۵۴/ ہزار تھی، جب کہ پابندی سے مسجد میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد ۵/ لاکھ ۳۶/ ہزار، کرسچن ایسوسی ایشن کے سروے مطابق چرچ سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کی تعداد سالانہ ۱۴/ ہزار کم ہورہی ہے، جب کہ مسجد جانے والے مسلمانوں کی تعداد میں سالانہ ۳۲/ ہزار کا اضافہ ہورہا ہے۔

اس حقیر کو چند سال پہلے افریقہ میں ایک فرانسیسی نوآبادی ''ری یونین'' جانے کا موقع ملا، وہاں کے مرکزی شہر سینٹ پیر کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن اس نوآبادی کے سب سے بڑے پادری اپنے گروپ کے ساتھ نمازِ جمعہ کا مشاہدہ کرنے آئے تھے، اور اس کا مقصد اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ مسلمان نوجوان کیوں بڑی تعداد میں مسجدوں کا رخ کررہے ہیں اور عیسائی نوجوان کیوں چرچ سے بے رغبت اور بے زار ہیں؟ معلوم ہوا کہ وہاں چرچوں نے نوجوانوں کو راغب کرنے کے لئے مختلف کلچرل پروگرام بھی رکھے، لیکن یہ کوشش بھی ان کے مقصد میں سودمند ثابت نہیں ہوسکیں، اس کے برخلاف اس حیاباختہ ماحول میں بھی میں نے کتنے ہی مسلمان نوجوان لڑکوں کے چہروں پر داڑھی دیکھی اور طالبات کو دیکھا کہ وہ اسکول سے آنے کے بعد دینی مکاتب میں برقعہ پہن کر آتی ہیں، ایسے بازار جہاں سے گذرتے ہوئے بھی ایک شریف انسان کی جبینِ حیا خم ہوجاتی ہے، اس کے قلب میں مسجد ہے اور وہ نمازیوں سے معمور ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب میں اسلام کے خلاف جتنا شدید پروپگنڈہ کیا جاتا ہے، اسی قدر قبولِ اسلام کی رفتار بھی روز افزوں ہے، مختلف یورپی ملکوں میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے، امریکہ میں مسلم آبادی یہودیوں سے بڑھ گئی ہے اور وہاں بھی عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے، جرمن خواتین میں اسلام کو مقبولیت حاصل ہے، بعض حضرات نے اعداد وشمار کی روشنی میں لکھا ہے کہ دنیا میں ہر روز چار لاکھ بتیس ہزار افراد قبولِ اسلام سے مشرف ہورہے ہیں، ۳۵۰۰ عیسائی اسلام قبول کرتے ہیں، اور مغرب میں بعض مشہور شخصیتوں محمد علی کلے، مائیک ٹائسن اور یوسف اسلام وغیرہ کا دامنِ اسلام میں آنا ایسے واقعات ہیں،

جس نے عیسائی مشنریز کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس لئے خاص طور پر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے منصوبہ بندی کی جارہی ہے اور منصوبہ بند طریقہ پر عالم اسلام میں ایسی کوششیں جاری ہیں، پاکستان میں عیسائی مشنریز کا احساس ہے کہ انھیں تبلیغ عیسائیت میں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ہے، صرف کراچی میں تبلیغ عیسائیت کے ڈیڑھ سو مراکز کام کررہے ہیں، سب سے بڑے مسلم ملک انڈونیشیا پر مدتوں سے عیسائی مشنریز کی یلغار جاری ہے، بلکہ ان کا تو دعویٰ تھا کہ ۲۰۰۰ء تک انڈونیشیا عیسائی اکثریت ملک بن جائے گا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن مرتدین کی تعداد وہاں سب سے زیادہ ہے، ۱۹۶۵ء کی رپورٹ کے مطابق انڈونیشیا کے جزائر میں اکیس ہزار تین سو انیس چرچ اور مشنری ادارے تھے اور بیس ہزار سے زیادہ ہمہ وقتی عیسائی مبلغین کام کررہے تھے، سب سے غریب مسلم ملک 'بنگلہ دیش' اس وقت عیسائیت کا خصوصی ہدف بنا ہوا ہے، ۱۹۹۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق آرچ بشپ آف ڈھاکہ کے زیر نگرانی ۲۰۷ مقامی اور غیر ملکی پادری مقرر ہیں، اسی طرح سوڈان، آزاد روسی جمہوریائیں، یہاں تک کہ بعض خلیجی ممالک میں بھی عیسائیت پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ہندوستان میں بھی عیسائی مشنریز کی تاریخ بہت پرانی ہے، ۱۸۱۳ء میں برطانیہ نے بل پاس کیا کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے اس ملک میں پادری جاسکتے ہیں، چنانچہ ۱۹۰۰ء سے پہلے ہی ۴۲ مشن ہندوستان آچکے تھے، اور مختلف عیسائی فرقوں نے غیر منقسم ہندوستان کے مختلف علاقوں کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا، یہاں تک کہ 'سر چارلس ٹریویلین آئی سی ایس' جو کہ کونسل کے ممبر تھے نے کہا تھا :

> میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلا واسطہ پادریوں کے ذریعہ سے اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینوں

سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ سے نفوذ کرے گی، حتیٰ کہ عیسوی علوم
تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی
ہوا کریں گے۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ:۴۱)

آزاد ہندوستان میں بھی عیسائی مشنریز کی کوششیں پوری قوت اور تسلسل سے جاری ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ شمال مشرق علاقہ کی کئی ریاستیں عیسائی اکثریت میں تبدیل ہو چکی ہیں، نوخیز ریاست جھارکھنڈ میں عیسائیوں کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے، ہندوستان میں بھی عام طور پر مسلمانوں پر اس ارتدادی تحریک کا اثر کم ہوا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں مشنری تحریک کے آغاز پر ہی حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نیز دوسرے علماء نے پوری قوت کے ساتھ اس کی مزاحمت فرمائی ہے، لیکن مسلمانوں کے اس فتنہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے ، جہالت و ناخواندگی اور غربت و پسماندگی کی وجہ سے عیسائی مشنریز شہر سے دور دراز دیہاتوں اور خاص کر ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے اور مرتد کرنے کی کوشش میں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔

گذشتہ دنوں اس بات کا انکشاف ہوا کہ نہ صرف آندھراپردیش کے ساحلی اضلاع میں بلکہ حیدرآباد کے قریبی شہروں بھونگیر، محبوب نگر وغیرہ میں بھی مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تحریک پوری قوت کے ساتھ چل رہی ہے، اور اس کے لئے خاص طور پر عورتوں کو آلۂ کار بنایا جاتا ہے، مختلف طریقوں پر خواتین کے اجتماعات رکھے جاتے ہیں، ان کو غیر سودی قرض اور امداد فراہم کی جاتی ہے، وظائف دیئے جاتے ہیں، علاج اور تعلیم کی سہولت فراہم کی جاتی ہے اور اس طرح انھیں اپنے دام میں پھنسایا جاتا ہے، اڑیسہ، بنگال اور کرناٹک کے علاقہ میں بھی عیسائی مشنریز مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

اُردو زبان میں جو عیسائی لٹریچر شائع ہو رہے ہیں ، اس میں اسلامی اصطلاحات و تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ، حضرت، علیہ السلام، رضی اللہ عنہ، نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ، انبیاء اور ملائکہ کے نام بھی بائبل کے عبرانی الفاظ کے بجائے قرآنی الفاظ میں لکھے

جاتے ہیں، جیسے جبرئیل، موسیٰ، عیسیٰ، داؤد، آدم وغیرہ، کتابوں اور رسالوں کے نام عام ناموں کی طرح ہوتے ہیں، صرف پاکستان میں عیسائیوں کے ۱۱۳ اردو جرائد و رسائل نکلتے ہیں، جن کے ناموں سے کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا کہ یہ عیسائیوں کے رسائل ہیں، جیسے شاداب، طلوعِ فکر، اخوت وغیرہ، یہی حال لائبریریوں اور کتب خانوں کا ہے۔

عیسائی مشنریز کی یہ نا مسعود کاوشیں عیسائی ملکوں کے غیر معمولی تعاون پر مبنی ہیں، ۱۹۹۲ء میں عیسائی مشنریز کو تبلیغی مشن کے لئے ۱۴ کروڑ کے قریب امریکی ڈالر حاصل ہوئے، جس میں ۵۶ فیصد سے زیادہ افریقہ میں اور ۳۰ فیصد سے زیادہ ایشیاء میں خرچ کیا گیا، ہر سال کئی بلین بائبل دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کی جاتی ہیں، عیسائیت کی تبلیغ میں بالواسطہ مدد کے لئے ہمارے ملک میں ہزاہا ہزار ہاسپٹل اور اسکول کام کر رہے ہے، اور یہ مسلمانوں کو اپنے دین کی طرف سے شکوک میں مبتلا کرنے اور عیسائیت پھیلانے کی مہم میں بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں، افسوس کہ مسلمان اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں سے بے خبر بھی ہیں اور بے پرواہ بھی۔

اس فتنہ کے تدارک کے لئے اسی درجہ کی مہم اور کوشش مطلوب ہے، ہماری سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ خود ہم نے غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنا چھوڑ دیا اور جب کوئی قوم داعی باقی نہیں رہتی تو وہ مدعو بن جاتی ہے، مسلمان اس وقت اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس کے لئے اول تو مسلمانوں میں داعیانہ کردار و مزاج پیدا ہونا چاہئے، اس کے علاوہ جو وسائل مسلمانوں کو راہِ حق سے منحرف کرنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں، ہمیں اسی طرح ان کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش کرنی ہوگی، ہمیں چاہئے کہ:

☆ مقامی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ آسان لٹریچر شائع کیا جائے اور اسے گھر گھر پہنچایا جائے، اس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ عیسائیت، قادیانیت اور آریہ سماجی افکار کی سنجیدہ تردید بھی شامل ہو۔

☆ ہر مسلم آبادی میں 'غیر سودی قرض کمیٹیاں' قائم کی جائیں، جو غیر معمولی حالات جیسی بیماری، شادی، موت وغیرہ میں قرض دیا کریں۔

☆ مسلمان زیادہ سے زیادہ ہائی اسکول تک تعلیم کی درس گاہیں قائم کریں، اور اسے اس طریق پر چلائیں کہ غیر مسلم بچے بھی اس میں داخلہ لیں، خوشحال لوگوں سے تعلیمی فیس لی جائے اور اسی میں دس فیصد امدادی مد تصور کیا جائے اور یہ رقم غریب طلبہ کو مفت تعلیم دینے پر خرچ کی جائے۔

☆ دیہاتوں میں بک بینک قائم کئے جائیں اور اس سے سال بھر کے لئے مفت نصابی کتابیں عاریت پر دی جائیں، اس بینک کے لئے ان مسلمان بچوں اور ان کے سرپرستوں سے کتابی چندہ بھی لیا جا سکتا ہے، جو ان کتابوں کو پڑھ چکے ہیں۔

☆ دیہاتوں میں ابتدائی اور عام امراض کے علاج کے لئے ''ہیلتھ سنٹر'' قائم کئے جائیں، جس میں نزلہ، زکام، کھانسی، بخار، دست، قئے، دردِ شکم وغیرہ کی دوائیں ہوں، اگر ہر آبادی کی جامع مسجد کی انتظامیہ یا وہاں کا مرکزی مدرسہ اپنی نگرانی میں ایسا سنٹر قائم کرے، اس کے لئے اعزازی طور پر یا کم معاوضہ پر مسلمان یا انسانیت دوست غیر مسلم معالج کا نظم کرے اور اس کے لئے شہر کے مسلمانوں کے زیر انتظام ہسپتالوں اور ان کی مملوکہ میڈیکل اسٹورس سے دواؤں کا چندہ حاصل کرے، تو خدمتِ خلق کا غیر معمولی کام ہو سکتا ہے۔

☆ دینی مدارس اور دینی تنظیمیں مدرّسین اور کارکنوں کے ساتھ ساتھ اپنے یہاں کم سے کم ایک مبلغ کا بھی تقرر کریں، اس مبلغ کو عیسائیت اور قادیانیت سے متعلق ضروری لٹریچر پڑھا دیا جائے اور انھیں اسی کام پر مامور رکھا جائے کہ وہ مختلف علاقوں میں جا کر مسلمانوں میں دعوتی اور اصلاحی کام کریں۔

☆ مسلمان سرمایہ داروں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو صرف زکاۃ ادا کرنے تک محدود نہیں سمجھیں، بلکہ اپنی دولت کا ایک حصہ خاص طور پر اسلام کی حفاظت واشاعت کے مشن کے لئے محفوظ کریں، شادی بیاہ اور خوشی کے دوسرے مواقع پر اوّل تو فضول خرچی سے بچیں، دوسرے اپنے مجوزہ اخراجات کو کم کر کے اس کا کچھ فیصد اس مد میں تعاون کے لئے مخصوص کر دیں، اس طرح جن لوگوں کی بڑی بڑی رقمیں ڈپازٹ ہیں، وہ اپنی رقم کا ایک حصہ ایسی غیر

سودی سوسائٹی کو چند سالوں کے لئے بطورِ قرض دیں، تا کہ اس سے غریب مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

☆ مسلمان خواتین کے لئے گھریلو کاموں کے ذریعہ کسبِ معاش کی تربیت کا اہتمام کیا جائے، جیسے سلائی، کڑھائی، موم بتی اور اگر بتی سازی وغیرہ، اس طرح دیہاتوں کی جز معاش زندگی میں محرومی کا احساس کم ہو سکے گا اور تحریص کے ذریعہ ارتداد کی کوشش نا کام و نا مراد ہو جائے گی۔

افسوس کہ عیسائی ممالک سرکاری سطح پر عیسائی مشنریز کا تعاون کرتے ہیں اور مسلم ممالک کھیل کود کے لئے تو بڑی بڑی رقمیں مختلف ملکوں کو فراہم کرتے ہیں، لیکن اس کی رگِ حمیت پھڑکتی نہیں، اور اسلام کی دعوت اور اس کی حفاظت کے لئے ان کے پاس کوئی مد نہیں ہے، بہر حال موجودہ صورتِ حال میں کم سے کم ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنے طور پر ہی اس فتنہ سے نمٹنا ہوگا، اور اگر حکمت، تدبیر اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلمان خود اس مرض کا علاج کر سکتے ہیں۔

۱۵ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ ۲۵ رفروری ۲۰۰۵ء

۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ ۴ رمارچ ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

خواتین کی امامت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام تقسیم کار پر رکھا ہے، اسی لئے نباتات ہوں یا جمادات اور حیوانات، ان کو الگ الگ خصوصیات سے نوازا گیا، اور ہر مخلوق اپنی خصوصیت کے پہلو سے انسانیت کے لئے فائدہ مند ہے، آم کی مٹھاس جس قدر لذت بخش ہے، کریلے کی کڑواہت اور نیم کی تلخی بھی انسان کو صحت کے لئے اسی قدر مطلوب ہے، خود انسان کا اپنا وجود بھی سر سے پاؤں تک تقسیم کار کی واضح مثال ہے، آنکھیں دیکھتی ہیں، ہاتھ کے ذریعہ چیزوں کی سختی اور نرمی جانی جاسکتی ہے، اور ہاتھوں ہی سے سارے اہم کام انجام دیئے جاتے ہیں، پاؤں ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے، زبان مدعا بیان کرتی ہے، قلب پورے جسم میں خون کی رَو دوڑاتا ہے، جس پر زندگی موقوف ہے، اور دماغ پورے نظام کو کنٹرول کرتا ہے، گویا وہ جسم کا بادشاہ ہے، یہ تو جسم کے ظاہری اعضاء ہیں، جسم کے اندر خدا نے جو امانتیں رکھی ہیں، ان میں بھی یہی تقسیم کار کا نظام کارفرما ہے، جگر ہو یا گردہ، اور معدہ ہو یا پھیپھڑے، شب و روز بلا وقفہ اپنا کام کئے جارہے ہیں، اگر جسم انسانی کا کوئی حصہ کہنے لگے کہ میں اپنا مفوضہ کام انجام نہیں دوں گا، میں فلاں دوسرا کام کروں گا؛ کیوں کہ اس کو اس کام سے محروم رکھنا میرے لئے باعث اہانت ہے، تو غور کیجئے کہ کیا زندگی کا نظام چل سکے گا؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں بھی صلاحیتوں کا تفاوت رکھا ہے، یہی تنوع ہے جس سے انسان کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، اگر تمام ہی لوگ ڈاکٹر ہوجائیں، یا سب کے سب انجینئرنگ کے فن کو اختیار کرنے لگیں، تو سماج میں ضروریات اور اس کی تکمیل کے درمیان توازن باقی نہیں رہے گا، ایک پیشہ میں تو زائد از ضرورت لوگ پیدا ہوجائیں گے، اور لوگوں کی دوسری ضرورتیں تشنۂ تکمیل رہ جائیں گی، قدرت نے اسی طرح انسانیت کی دو اہم صنفوں مردوں اور عورتوں میں بھی صلاحیتوں کا فرق رکھا ہے، مرد کا کام محنت مزدوری کرنا، اپنی اور

اپنے خاندان کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرنا ، اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں انجام دینا ہے ، فرائض کو ادا کرنے کے لئے قوت و طاقت ، جرأت و ہمت اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہے ، عورت کو اندرون خانہ کی ذمہ داریاں انجام دینی ہیں ، بچوں کو پیار دینا ، ان کی پرورش کرنا اور اپنے شوہر کے لئے وجہ سکون بننا اس کے فرائض ہیں ، اس لئے ان میں ماں کی ممتا ، بہن کی محبت ، بیوی کا جذبۂ جاں نثاری ، لطافت ونزاکت اور حسن و جمال کے پہلو کو غالب رکھا گیا ہے ، اور خاندانی نظام کے بقاء کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیں ، اس میں زندگی کا سکون ہے ، عفت وعصمت کی حفاظت ہے ، اور خاندانی نظام کا بقاء اور استحکام ہے ۔

صلاحیتوں کے فرق کے لحاظ سے ذمہ داریوں میں تفاوت کی بنا پر شریعتِ اسلامی نے عورتوں کو بہت سی سہولتیں دی ہیں ، مردوں پر جہاد فرض ہے ، عورتوں پر جہاد فرض نہیں ، مردوں پر کسب معاش فرض ہے ، عورتوں پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں ، مردوں پر اپنے بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری ہے ، عورتوں پر شوہر اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری نہیں ، مرد تنہا ہو تب بھی اس پر حج کرنا ضروری ہے ، عورت کے ساتھ شوہر یا محرم نہ ہو تو اس پر حج فرض نہیں ، مردوں پر جمعہ وعیدین ، اور جماعت واجب ہے ، عورتوں کو ان واجبات سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے ، یہ عورتوں کی تحقیر نہیں ، بلکہ ان کے ساتھ رعایت ہے ، اور یہ عورت کے ساتھ ظلم ونا انصافی نہیں ، بلکہ عین عدل وانصاف ہے ، عورت حفاظت کی محتاج ہوتی ہے ، مرد عام حالات میں اس کا محتاج نہیں ہوتا ، اگر کوئی لڑکی گھر سے باہر نکلی اور وقت پر نہیں پہنچ پائی تو ہر شریف آدمی بے قرار ہو جاتا ہے ، لیکن لڑکے رات گئے نہ پہنچیں تو انسان اس درجہ بے چین نہیں ہوتا ، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ عورت حفاظت کی محتاج ہوتی ہے ، بیٹی ہو تو باپ اس کی حفاظت کرتا ہے ، بیوی ہو تو شوہر کی حفاظت میں رہتی ہے ، ماں ہو تو اولاد اس کی حفاظت کرتی ہے ، یہی حفاظت پردہ اور ستر کی متقاضی ہے ، عورت کو بمقابلہ مرد کے زیادہ پردہ مطلوب ہوتا ہے ، اس پہلو سے شریعت نے عورت پر جماعت کو واجب نہیں رکھا ، اور اذان واقامت اور امامت کی ذمہ داری بھی

بنیادی طور پر مردوں سے متعلق فرمائی، رسول اللہ ﷺ نے خود امامت فرمائی، بعض دفعہ آپ ﷺ کی جگہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امامت کی، مدینہ کی بعض مسجدوں میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کا امامت کرنا ثابت ہے، قباء میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ امامت فرمایا کرتے تھے، اس زمانہ میں متعدد اہل علم و فضل خواتین موجود تھیں، خود آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ام المومنین حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن جیسی باکمال خواتین موجود تھیں، لیکن آپ ﷺ نے انھیں امامت پر مامور نہیں فرمایا، اور عہد نبوی ﷺ سے آج تک یہی توارث چلا آ رہا ہے کہ ہمیشہ مردوں نے امامت کی ہے۔

کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کریں، اور غیر اہم مسائل میں ان کو الجھا کر رکھ دیں، اس کے لئے ہمیشہ کسی غیر اہم واقعہ کو ذرائع ابلاغ میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے عالمی سطح پر گفتگو اور بحث کا موضوع بنادیا جاتا ہے، چنانچہ آج کل خواتین کی امامت کا مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے، جب سے امریکہ میں امینہ ودود نے جمعہ کا خطبہ دیا ہے اور امامت کی ہے اور پھر سستی شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کناڈا میں اسلیمہ علاء الدین مجید نے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز ادا کی، یہ مسئلہ شاہ سرخیوں میں آ گیا ہے، اور اس کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے، کہ گویا علماء عورتوں پر ظلم کر رہے ہیں، اور انھیں ایک جائز شرعی حق سے محروم کرنے پر آمادہ ہیں۔

عورتوں کی امامت کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ عورت خود عورتوں کی امامت کرے، دوسرے یہ کہ عورت مردوں اور عورتوں کی مشترکہ جماعت کی امام ہو...... پہلی صورت حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک جائز ہے؛ کیوں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ نے خواتین کی امامت فرمائی ہے، اس موقع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آگے کھڑی ہونے کے بجائے صف کے درمیان میں کھڑی ہوئیں، علامہ زیلعیؒ نے اس حدیث کو مستدرک حاکم، مصنف عبد الرزاق، دارقطنی، بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، اور کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، (نصب الرایہ:۲/۳۰)...... اسی طرح ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بھی عورتوں کی

امامت کرنا منقول ہے، یہ روایت مصنف عبد الرزاق، دار قطنی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے، اور امام نوویؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، (حوالہ سابق) البتہ خواتین کی مستقل جماعت بھی بہتر نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خواتین کی جماعت میں خیر نہیں، سوائے اس کے کہ مسجد میں ہو''لا خیر في جماعة النساء إلا في مسجد جماعة''۔(اعلاء السنن:۴/۲۴۳، حدیث نمبر:۱۲۱۹)

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عورت صرف مردوں کی، یا مردوں اور عورتوں کی امامت کرے، یہ صورت بالاتفاق جائز نہیں، کویت سے شائع ہونے والی فقہی انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

يشترط لإمامة الرجال أن يكون الإمام ذكراً فلا تصح إمامة المرأة للرجال و هذا متفق عليه بين الفقهاء .

(الموسوعة الفقهية :۶/۲۰۴)

مردوں کی امامت کے لئے ضروری ہے کہ امام بھی مرد ہو، لہذا یہ بات درست نہیں کہ عورت مردوں کی امامت کرے، اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

......اور یہ بات —— کہ عورتیں مردوں کی امام نہیں ہوسکتیں —— شرعی دلیلوں سے ثابت ہے :

☆ پہلی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اور صحابہ ﷺ کے عہد میں یا بعد کے ادوار میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ خواتین کو امام مسجد مقرر کیا گیا ہو، اور انھوں نے مردوں کی امامت کی ہو۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بدترین صف آخری صف، اور عورتوں کی بہترین صف آخری صف ہے اور بدترین صف پہلی صف ''خير صفوف النساء آخرها و شرها أولها''(مسلم،۴۴۰، باب تسوية الصفوف)......اور امامت تو ظاہر ہے کہ پہلی سے بھی آگے صف ہوتی ہے، یہ عورت کے لئے کیسے جائز ہوسکتی ہے؟

☆ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عورت امامت نہیں کرسکتی، ''لا تؤم المرأة'' مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس روایت کو مدونہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، اور بتایا ہے کہ سند کے اعتبار سے یہ صحیح ہے۔ (اعلاء السنن: ۴/۲۵۰، حدیث نمبر: ۱۲۳۳)

☆ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مرد ہلاک ہوجائیں گے، جب وہ عورتوں کی اطاعت کرنے لگیں گے، اور ایک روایت میں ہے کہ جو قوم اپنے معاملہ کو عورت کے حوالہ کردے، وہ فلاح نہیں پاسکتی ''لن یفلح قوم ولّوا أمرهم إلى امرأة'' ان میں پہلی روایت مسند احمد اور مستدرک حاکم میں اور دوسری روایت خود بخاری میں نقل کی گئی ہے، (دیکھئے: اعلاء السنن: ۴/۲۵۱، حدیث نمبر: ۱۲۳۴)...... نماز میں مقتدی امام کی کامل اطاعت کرتا ہے اور اپنی تمام نقل و حرکت کو امام کے حوالہ کردیتا ہے، تو پھر مرد کے لئے عورت کی اقتداء کیوں کر درست ہوسکتی ہے؟

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز ہی کے سیاق میں خواتین کے بارے میں فرمایا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کا مقام پیچھے رکھا ہے، اسی طرح انھیں پیچھے رکھو ''أخروهن من حيث أخرهن الله'' (مصنف عبدالرزاق: ۳/۱۴۹) اگر عورتیں امامت کرنے لگیں تو ان کی جگہ پیچھے کے بجائے آگے قرار پائے گی۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت مرد کی امامت نہ کرے: ''لا تؤمن إمرأة رجلا''۔ (ابن ماجہ: ۱۰۸۱، باب في فرض الجمعة)

☆ عورت کے آگے کھڑے ہونے، امامت کرنے اور نقل و حرکت کرنے میں فتنہ اور دل و نگاہ کی بے عفتی کا بھی اندیشہ ہے؛ کیوں کہ نماز کی بعض ہیئتیں ایسی ہیں جن میں اعضاء کی ساخت نمایاں ہوتی ہے، اور نماز کے اکثر افعال کو انجام دینے میں کولھے کی ہڈیاں متحرک ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ اسلام ہی پر موقوف نہیں، دوسرے مذاہب میں بھی مذہبی قیادت خواتین کے حصہ میں نہیں رکھی گئی، یہودیوں کے یہاں کوئی خاتون ''ربی'' نہیں ہوتی، عیسائیوں کے یہاں خاتون پادری یا پوپ پال کا تصور نہیں، ہندوؤں کے یہاں کوئی شنکراچاریہ

یہ یا پروہت خاتون نہیں دیکھی گئی، گویا تمام مذہبی اقدار و روایات اس بات پر متفق ہیں کہ مذہبی قیادت و امامت عورتوں کے لئے مناسب حال نہیں، اور جہاں کہیں عورتوں کو مذہبی اداروں میں داخل کیا گیا ہے، جیسے عیسائیوں کے یہاں راہبات اور ہندوؤں کے یہاں دیوداسیاں، وہاں عورتوں کا استحصال ہوا ہے، اور اس کی وجہ سے اخلاقی برائیوں نے جنم لیا ہے، اسی لئے ان ذمہ داریوں سے عورتوں کو سبکدوش رکھ کر اسلام نے ان کے لئے سہولت پیدا کی ہے، اور ان کو مردوں کے استحصال سے بچایا ہے۔

بعض حضرات حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے اہل خانہ کی امامت کی اجازت دی تھی ''و أمرها أن تؤم أهل دارها'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۹۱، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۳۲۴) سنن بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرض نمازوں میں امامت کی اجازت دی تھی ''و تؤم أهل دارها في الفرائض'' (سنن بیہقی، حدیث نمبر: ۱۵۳۷) لیکن اس روایت کے عموم سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا ان لوگوں میں تھیں، جنھوں نے قرآن مجید کو جمع کیا تھا، عبادت اور ریاضت کا بڑا ذوق رکھتی تھیں، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظۂ قرآن بھی تھیں، اس لئے آپ ﷺ نے ان کے خصوصی مقام کی رعایت کرتے ہوئے انھیں امامت کی اجازت دی تھی، لیکن یہ اجازت صرف گھر کی خواتین کے لئے تھی، چنانچہ دار قطنی کی روایت میں صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے انھیں صرف خواتین کی امامت کی اجازت مرحمت فرمائی تھی ''أذن لها تؤم نسائها'' (دار قطنی: ۱/۲۷۹، باب في ذكر الجماعة و أهلها و صفة الإمام) اس لئے جن حدیثوں میں ''اہل دار'' کا لفظ آیا ہے، وہاں بھی ''اہل'' سے عورتیں ہی مراد ہیں، اور بعض دوسری روایات میں بھی ''اہل'' کا لفظ خاتون خانہ کے لئے استعمال ہوا ہے، اس لئے اس لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

جو نام نہاد روشن خیال حضرات عورتوں کی امامت کے مسئلہ کو ایک بڑی فتح اور اہم موضوع کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، انھیں سوچنا چاہئے کہ اگر بالفرض عورتیں امامت کرنے لگیں،

تو اس سے خواتین کو کیا فوائد حاصل ہوں گے، اور ان کے کیا مسائل حل ہوں گے؟ خواتین کے لئے اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ مغرب میں عورتوں کا استحصال ہورہا ہے، نکاح کی شرح کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، مرد ایک عورت سے اس وقت تک تعلق رکھتا ہے، جب تک اس کے لئے اس کے وجود میں کشش ہو، جوں ہی یہ کشش ختم ہوجاتی ہے، وہ اپنے لئے ایک نیا لباس تلاش کرلیتا ہے، اور جس عورت نے اپنی زندگی کا بہترین اور قیمتی وقت اس کے لئے قربان کیا، اسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا، اور جب بوڑھاپا شروع ہوتا ہے، تو مظلوم عورتیں تنہا اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں، اور خاندانی نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے کس مپرسی کی حالت میں اپنا وقت کاٹنے پر مجبور ہوتی ہیں، اصل میں اس مرض کے علاج کی ضرورت ہے، اور عورت کی بھلائی اس میں ہے کہ نکاح کے قانونی تعلق پر اکتفاء کرنے کا ماحول بنایا جائے، سماج کو غیر قانونی رشتوں سے بچایا جائے، خاندانی نظام کو مستحکم کیا جائے، اور عورتوں پر جو بیک وقت ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ رکھ دیا گیا ہے کہ وہ امور خانہ داری کو بھی انجام دیں، اور گھر سے باہر مردانہ فرائض کو بھی پورا کریں، اس استحصال سے صنف نازک کو بچایا جائے، یہی عورتوں کے حقیقی مسائل ہیں، کاش! لوگ حقیقت پسندانہ جذبہ کے ساتھ مسئلہ پر غور کریں!!

۲۱/صفر المظفر ۱۴۲۶ھ یکم اپریل ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

’قرآن‘ کے مقابلہ ’فرقان‘ — ایک صہیونی سازش

یہ وسیع وعریض کائنات جس میں ہم قیام پذیر ہیں، ایک مربوط اور مستحکم نظام کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رَواں دَواں ہے، فضاء میں سینکڑوں سیارے تیر رہے ہیں، لیکن یہ اپنی وسعت اور بڑائی کے باوجود کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں، سیاروں میں ثقل اور اپنی طرف کھینچنے کی قوت بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی شئے کو تھامے ہوئی ہے، ایسی خوبصورت اور وسیع کائنات کسی پیدا کرنے والے کے بغیر آپ سے آپ وجود میں نہیں آسکتی اور اتنا مستحکم، منضبط اور مربوط نظام کسی منتظم کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا، یہی وہ حقیقت ہے، جو ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور رب ضرور موجود ہے، جس کے حکم اور اشارہ پر یہ پورا نظام جاری وساری ہے۔

پھر غور کیجئے تو کائنات کی ہر چیز خدمت میں مشغول ہے، سورج اپنا سینہ جلا کر روشنی دیتا اور حرارت پہنچاتا ہے، چاند کی گردش سے موسم وجود میں آتے ہیں، پانی جانداروں ہی کی نہیں بلکہ درختوں اور پودوں کی بھی پیاس بجھاتا ہے، ہواؤں پر حیوانات کی زندگی کا مدار ہے، سمندر مسلسل اچھلتا اور کودتا بخارات پیدا کرتا رہتا ہے، ہوائیں اپنے کاندھوں پر ان بخارات کو اٹھاتی ہیں، اور بادل بنا کر حسبِ ضرورت برساتی ہیں، پتھر ہو یا مٹی، لوہا ہو، یا پیتل، نباتات ہو یا حیوانات سب خدمت میں مشغول ہیں، کائنات کی کوئی چیز مصلحت اور فائدہ سے خالی نہیں، یہاں تک کہ زہریلے سانپ بھی فائدہ سے خالی نہیں، ان خدمت گاروں کا مخدوم کون ہے؟ شجر وحجر اور آب وآتش شب وروز کس کی خدمت میں مصروف ہیں؟ کون ہے جسے اس کارگاہِ عالم کا فرمانروا بنا کر بھیجا گیا ہے؟ غور کیجئے تو یہ حضرت انسان ہیں، بزمِ کائنات انھیں کے لئے آراستہ کی گئی ہے، کارگاہِ عالم کو ان ہی کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے، ان ہی کے لئے یہ خوبصورت بستی بسائی گئی ہے اور ان کے دَم سے اس جان رنگ وبو کی رونق قائم ہے۔

خدانے اس کائنات کوانسان کی خدمت کے لئے اور خود انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا فرمایا ہے:''وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ''(الذاریات:۵٦)جب خدانے پوری کائنات کے لئے ایک نظامِ کار مقرر کیا ہے،تو ضرور تھا کہ انسان کے لئے بھی خدا کی طرف سے زندگی گذارنے کا نظام مقرر ہو،اور اسے اس سے آگاہ کیا جائے ، کیوں کہ انسان کا علم محدود اور ناکافی ہے،اس کے مفادات اور جذبات میں ٹکراؤ ہے،وہ خود اپنے نفع ونقصان سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں،چنانچہ خدائے رحمان ورحیم نے جہاں اس کے لئے یہ وسیع کائنات بنائی،وہیں اس کائنات میں رہنے اور زندگی گذارنے کی بھی رہنمائی فرمائی،اسی رہنمائی کا نام ''ہدایت'' ہے،پھر انسان کی آسانی کے لئے یہ کیا گیا کہ یہ ہدایت کسی اور مخلوق کے ذریعہ بھیجنے کے بجائے انسانوں ہی کے ذریعہ بھیجی گئی،تاکہ انسان ان حاملین ہدایتِ ربانی سے انس محسوس کرے،بہ سہولت ان سے استفادہ کرے اور خود ان کی زندگی میں خدا کے احکام کا عملی نمونہ دیکھ لے؛کیوں کہ انسان کسی عمل کر دیکھ کر بہتر طور پر اس کی نقل کرسکتا ہے۔

آسمانی کتابیں ہدایتِ ربانی کے صحیفے ہیں اور انبیاء ورسل ان مبارک صحیفوں کے حاملین ہیں ، یہ انسان کے روحانی تقاضوں کی تکمیل اور اخلاقی قدروں کے تحفظ کے لے اسی قدر ضروری ہیں ،جس قدر انسانی جسم کے تحفظ اور بقا کے لے ہوا ، پانی اور کھانا ،پیغمبروں اور کتابوں کا یہ سلسلہ تخلیق انسانی کی ابتدا ہی سے چل رہا ہے،حضرت آدم علیہ السلام جس طرح اس دنیا میں پہلے انسان تھے،اسی طرح پہلے پیغمبر بھی تھے،انسانی تمدن جوں جوں ترقی کرتا رہا اور اس کے احوال میں جیسے جیسے تبدیلیاں آتی رہیں ، اسی طرح خدا کی طرف سے نئے ہدایت نامے بھی آتے رہے،بار بار ایسا بھی ہوا کہ قوموں نے اپنی مجرمانہ ذہنیت کے تحت ان ربانی ہدایت ناموں میں آمیزشیں کردیں اور اپنی ملاوٹوں کے ذریعہ اس کی روح کو مجروح کردیا ، ایسی صورت میں پیغمبروں کے ذریعہ نئے صحائف بھیجے گئے۔

جیسے انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور ایک سال جو لباس اس کے جسم پر فٹ آتا ہے، دوسرے سال چھوٹا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ انسان جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اور اب جو

لباس اس کے لئے سلتا ہے وہ زندگی کی آخری سانس تک اس کے لئے قابل استعمال رہتا ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا دَور انسانی تمدن کے بلوغ اور اس کے فہم و شعور کے کمال کا دور ہے، اسی لئے جو لباسِ ہدایت آپ ﷺ کے ذریعہ بھیجا گیا، اس کی موزونیت قیامت تک باقی رہے گی، چوں کہ آپ ﷺ کی ذات پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور خدا کا فیصلہ ہے کہ اب اس کے بعد کوئی اور کتابِ آسمانی نازل نہ ہو، اس لئے ضروری تھا کہ ہر طرح کی آمیزشوں سے اس کتاب کی حفاظت کا انتظام بھی کیا جائے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ''۔(الحجر:۹)

اسی لئے قرآن مجید کو ''فرقان'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، (الفرقان:۱) فرقان کے معنی اس شیٔ کے ہیں جو حق اور باطل اور سچ اور جھوٹ کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دے اور واضح فرق پیدا کردے، چوں کہ اب قیامت تک کے لئے اسی کتاب پر ہدایت کا دار و مدار ہے اور کسی اور مذہبی کتاب میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے، اس لئے صرف یہی ایک کتاب 'فرقان' کہلانے کی مستحق ہے۔

دنیا میں اس وقت اسلام کے علاوہ دو بڑے مذاہب ہیں، جو خدا کے وجود کے قائل ہیں، ہندومت اور عیسائیت، ہندو مذہب دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے، لیکن اس کی تاریخ غیر محفوظ ہے، ہندو بھائی ویدوں کو الہامی کتاب مانتے ہیں، لیکن ویدوں کی تعداد میں اختلاف ہے، جن ویدوں کو آج تسلیم کیا جاتا ہے ان کے اشلوکوں کی تعداد بھی متفق علیہ نہیں ہیں، ویدیں صرف دو سو سال پہلے چھپی ہیں اور ان سے پہلے ہزاروں سال سے سینہ بہ سینہ آرہی ہیں اور ایک مخصوص طبقہ کی اس پر اجارہ داری رہی ہے، آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں رامائن، مہابھارت اور گیتا کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، ان کتابوں میں جو کردار نقل کئے گئے ہیں، وہ حقیقی ہیں یا تمثیلی؟ اس کے بارے میں ہندو مفکرین کے یہاں سخت اختلاف رائے پایا جاتا ہے، پھر ان مذہبی کتابوں میں ایسی داخلی شہادتیں بھی موجود ہیں، جو ان کتابوں کے من جانب اللہ ہونے کی نفی کرتی ہیں، یعنی خلافِ عقل باتیں، خلافِ فطرت احکام اور غیر اخلاقی واقعات، خود گیتا جس

کومہاتما گاندھی سے لے کر آج تک کے بڑے بڑے ہندو بزرگ تقدس کا مقام دیتے آئے ہیں، میں شری کرشن جی کی رادھا اور گوپیوں کے ساتھ عیش کوشی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ ہرگز خدا کے کسی نیک بندہ کے شایانِ شان نہیں ہے اور ان کو درست ماننا شری کرشن جی کی شخصیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔

یہی حال تورات وانجیل کا ہے، تورات میں جو غیر متوازن اور غیر معتدل احکام دیئے گئے ہیں، وہ عدل کے تقاضوں کے مغائر ہیں، حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت یوسف، حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام وغیرہ انبیاء کرام کی زندگیوں کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے جسے پڑھ کر جبینِ حیا خم ہو جاتی ہے اور ان اولوالعزم اور قدسی صفت پیغمبروں کی تصدیق اگر قرآن میں موجود نہ ہوتی اور صرف بائبل کے ذریعہ ان کے حالات کو پڑھا جاتا، تو لوگ بے جا بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے، انجیل کی تعداد اور اس کے معتبر و نامعتبر نسخوں کے سلسلہ میں بے شمار اختلافات ہیں، پھر جو چار انجیل آج عیسائیوں کے یہاں معتبر ہیں، ان کے راوی بھی صحیح طور پر متعین نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سریانی تھی اور انجیل کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں ہے، ہر چند سال پر اصلاح کے نام سے بائبل میں ترمیمات ہوتی رہتی ہیں، اسی لئے بہت سے عیسائی اہل علم نے بھی بائبل میں تحریف کا اعتراف کیا ہے، اور یہ ایک حقیقت اور واضح سچائی ہے کہ یہ کتابیں محفوظ طریقہ پر ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔

قرآن مجید وہ آسمانی کتاب ہے، جس کا ایک ایک حرف جوں کا توں محفوظ ہے، عقل سے مطابقت، قانونِ فطرت سے ہم آہنگی، توازن واعتدال اور انسانی ضروریات سے موافقت ایسی حقیقتیں ہیں، جن کا مسلمانوں ہی کو نہیں غیر مسلموں کو بھی اعتراف ہے، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات و معمولات کے ذریعہ اس کی توضیح وتشریح فرمائی ہے، ان ہی توضیحات کا نام ''حدیث'' ہے، ہر حدیث کی آپ ﷺ تک سند موجود ہے اور ہر سند کے ہر راوی کے حالات محفوظ ہیں، جہاں قرآن مجید کے حفظ وقراءت کے ذریعہ اس کے الفاظ کی حفاظت ہوئی ہے، وہیں حدیث کے ذریعہ معانی قرآن کی حفاظت کا سروسامان ہوا ہے، اسی

لئے جب ہم اس کتاب کو ''فرقان'' کہتے ہیں تو یہ قرآن مجید کی صحیح اور مبالغہ سے خالی تعریف ہوتی ہے۔

قرآن مجید جب نازل ہوا اور بیمار طبیعتوں نے اس کتاب کو قبول کرنے سے انکار کردیا، تو بار بار انھیں چیلنج کیا گیا کہ وہ اس جیسی کتاب لے آئیں، خواہ اس کے لئے تمام جن وانس جمع ہو جائیں (بنی اسرائیل: ۸۸) نہیں تو دس سورتیں ہی لے آئیں اور جس سے چاہیں مدد لے لیں (ہود: ۱۳) پھر فرمایا گیا کہ کم سے کم ایک ہی سورت لے آئیں اور جن سے مدد لینا چاہیں، مدد بھی لے لیں، (بقرہ: ۲۳، یونس: ۳۸) یہی چیلنج ان عربوں سے کیا گیا جو اسلام کے بدترین مخالف تھے، اور ان لوگوں سے کہا گیا جو زبان وادب کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے، لیکن کسی کو اس چیلنج کا جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی، آج بھی قرآن مجید کا یہ چیلنج موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔

عیسائی اور یہودی دنیا کے پاس ایک تو محفوظ آسمانی کتاب باقی نہیں رہی، دوسرے کلیسا اور حکومت کی جنگ کے نتیجہ میں عیسائیت نے مذہب کا طوق بھی اپنے گلے سے اتار پھینکا، اور اب وہ ایک ایسی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں، جس میں خدا کی ذات اور اس کا حکم چرچ کی چہار دیواریوں تک محدود ہے، باقی پوری زندگی مادر پدر آزاد ہیں، لوگ اس طرح بندۂ نفس ہو چکے ہیں کہ اب فطرت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی خواہشات پوری کرنے کے بجائے فطرت سے بغاوت پر کمر بستہ ہیں اور ہم جنسی کی شادیوں کو قانونی جواز عطا کردیا گیا ہے، ان کی اس نفسانیت پرستی اور شہوات وخواہشات کی غلامی اور بندگی میں اگر کوئی دین اور کوئی کتاب رکاوٹ ہے، تو وہ اسلام اور قرآن مجید ہے، اسی لئے مغربی مصنفین نے قرآن مجید کو ہمیشہ ہدفِ تنقید بنانے کی کوشش کی ہے اور قرآن کی حقانیت اور صداقت پر بے جا اعتراضات کئے ہیں۔

اب یہودی اور عیسائی دماغ نے ایک نئی سازش کے تانے بانے بننے شروع کئے ہیں اور ایک کتاب ''فرقان الحق'' کے نام سے مرتب اور شائع کی گئی ہے، اس بے ہودہ کتاب کو قرآن مجید ہی کے اُسلوب پر لکھنے اور قرآن مجید ہی کی تعبیرات میں ترتیب دینے کی سعی نامراد کی گئی

ہے، جومختلف سورتوں پر مشتمل ہے، اس میں عیسائی عقائد کو الہامی کتاب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور قرآن مجید کو مسخ کرنے کی نازیبا اور ناکام کوشش کی گئی ہے، امریکہ کے بعض اداروں نے اسے بہت بڑی تعداد میں شائع کیا ہے اور مسلم ممالک اور مسلمان علاقوں کو بڑی تعداد میں مفت فراہم کیا جارہا ہے، ان شاء اللہ یہ ناروا کوششیں نامراد ہی رہیں گی اور چاند پر تھوکنے کی سعی ثابت ہوگی، لیکن مسلمانوں کو بہرحال ایسے فتنوں کے بارے میں چوکس رہنا چاہئے اور دینی حمیت و اسلامی غیرت کی آگ کو ایک لمحہ کے لئے بھی سرد نہ ہونا چاہئے!!

۱۱/ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ ۲۰/مئی ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

عمرانہ کا فسانہ

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جس طرح اپنی مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اسی طرح ان کی افزائش کا بھی ایک نظام قائم کیا ہے، یہ نظام حیوانات میں جنسی اتصال کے وسیلہ سے رکھا گیا ہے، یعنی نر و مادہ کے اتصال سے نسلیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور کائنات کی یہ بستی منشأ ربانی کے مطابق آباد رہتی ہے، قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ نے حیوانات ہی کی طرح دوسری مخلوقات میں بھی جوڑا پیدا کیا ہے، وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (ذاریات:۴۹) اور موجودہ سائنس بھی اپنا سفرِ تحقیق طے کرتے کرتے اب اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ صرف حیوانات میں ہی نہیں، دوسری مخلوقات میں بھی اس طرح کا نظام موجود ہے، خاص کر نباتات میں۔

''انسان'' اور ''جن'' کے علاوہ دنیا میں جو مخلوقات ہیں، انھیں قانونِ شرعی کا مکلّف نہیں بنا گیا ہے، ان کے لئے نہ کوئی چیز حلال ہے اور نہ حرام، اور اسی لئے ان کے اعمال سے ثواب و عذاب بھی متعلق نہیں ہے، لیکن انسان اس کائنات کا مقصود و مطلوب ہے، اس کو ارادہ و اختیار کی قوت دی گئی ہے، خیر و شر کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے، جوہر اخلاق سے سرفراز کیا گیا ہے، اس میں شرم و حیا کا عنصر رکھا گیا ہے، اسی لئے اس کی فطرت اس سے عفت و پاک دامنی اور زندگی کے مختلف تقاضوں کے سلسلہ میں اخلاقی قدروں کی رعایت کا مطالبہ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے شریعت نازل کی ہے، شریعت کوئی بوجھ نہیں ہے، بلکہ وہ فطرت کی عین آواز ہے، جو شخص سلیم الفطرت ہوگا، اس کا ضمیر ٹھیک اسی حکم کی طرف مائل ہوگا جو کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے، حیوانات میں نکاح کا کوئی نظام نہیں اور ایک مادہ سے کئی نر ملتے ہیں، یہ اتصال کسی بیماری کے پیدا ہونے کا موجب بھی نہیں ہوتا، لیکن انسانی سماج میں ہمیشہ اس بات کو ضروری سمجھا گیا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے وفادار بن کے رہیں، اور یہ عین قانونِ فطرت ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ایک عورت سے کئی مردوں کے جنسی

روابط ہوں، تو اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ایڈس جیسی بیماری جس سے آج پوری دنیا لرزہ براندام ہے، اسی خلاف فطرت امر کا نتیجہ ہے، اسی طرح یہ بھی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ کچھ قریب ترین رشتوں کے درمیان حرمت کی دیوار قائم رکھی جائے، اسی لئے تمام قابل ذکر انسانی گروہ میں ماں، بیٹی، بہن، بہو، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی وغیرہ کو حرام سمجھا گیا ہے، اور کبھی کسی نے اس کے خلاف کیا ہے، تو اسے فطرت کا باغی اور سماج کا مجرم تصور کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے حرام رشتوں کو بہت ہی تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے (نساء:۲۲) ان حرام رشتوں میں صراحتاً بہو کا بھی ذکر ہے، (نساء:۲۳) کیوں کہ بہو بالکل بیٹی کے درجہ میں ہے، لیکن افسوس کہ کچھ ایسے بدقماش اور بدکردار لوگ بھی ہوتے ہیں، جو انسان کے پیکر میں شیطان کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں کرتے، اس طرح کے لوگ ہر سماج میں ہوتے ہیں، لیکن چوں کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں میں حلال وحرام کی حدیں مقرر نہیں ہیں اور اگر ان کے مذہب میں مقرر بھی ہیں، تو لوگوں نے اپنے آپ سے مذہب کے لباس کو اتار پھینکا ہے، اس لئے جب ان سے کوئی خلافِ فطرت بات سرزد ہوتی ہے، تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی، اسلام نے حلال وحرام کی واضح سرحدیں متعین کردی ہیں، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال وحرام بالکل واضح ہیں: ''الحلال بیّن و الحرام بیّن ''اس لئے اگر کوئی بدبخت اس سرحد کو عبور کرتا ہے، تو یہ ایک ایسا قابل نفرت واقعہ ہوتا ہے کہ سماج میں گفتگو کا موضوع بن جاتا ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اگر سفید کپڑے پر سیاہی کا ایک قطرہ بھی گر جائے، تو دریا کی طرح واضح نظر آتا ہے، اور سیاہ کپڑے پر سیاہی کی دوات بھی انڈیل دی جائے تو قطرہ کے گرنے کا بھی گمان نہیں ہوتا!!

اس وقت ذرائع ابلاغ نے مہم چلا رکھی ہے کہ وہ اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو ذلیل کریں گے، اس لئے ایسے غیر اخلاقی واقعات سے صرفِ نظر کرنے کے بجائے وہ اسے خوب اچھالتے اور موضوع بحث بناتے ہیں، اور کچھ ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا مسلم سماج میں

کثرت سے اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں، حالاں کہ یہ صحافت کے آداب کے خلاف ہے، آپ کو خبریں حاصل کرنے اور پہنچانے کا حق حاصل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ لوگوں کی خوابگاہ میں داخل ہو جائیں، اور جن باتوں کے ذکر سے سماج میں برائیاں پھیل سکتی ہوں ان کو مزالے لے کر بیان کریں، اور حسبِ موقع کچھ مرچ مسالہ لگاتے جائیں، اگر عمرانہ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے تو جتنا ظلم اس پر اس کے خسر نے کیا ہے، اس سے بڑھ کر ذرائع ابلاغ نے کیا ہے، کہ خسر نے کمرہ کی تنہائی میں اسے بے آبرو کیا ہے اور میڈیا پورے ملک میں اسے بے آبرو کر رہا ہے، یہ صحافت کی آزادی کا غلط استعمال اور صحافت کے بنیادی مقصد سے انحراف ہے۔

جب ایسی شاہ سرخیوں کے ساتھ کسی خاتون سے متعلق خبریں اخبار میں آتی ہیں، تو وہ اپنے معاشرہ میں اچھوت بن کر رہ جاتی ہیں، اس کی واضح مثال خود شہر حیدرآباد میں ''آمنہ'' نامی لڑکی والا معاملہ ہے، ذرائع ابلاغ نے اس کی ایسی تشہیر کی کہ آج تک اس لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکا، اگر کسی سماج میں اس طرح کے خراب واقعات پیش آجائیں، تو خاندان کے لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زیادہ تشہیر نہ ہونے پائے، تشہیر سے انھیں اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے، اس پہلو سے سوچئے کہ عمرانہ کے والدین اور ان کے اقارب پر کیسی قیامت گذر رہی ہوگی اور وہ کس طرح سماج سے اپنا منھ چھپاتے ہوں گے؟ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمان ایسے واقعات میں الجھ جائیں اور ان ہی بے جا اور بے فائدہ بحثوں کے اسیر بنے رہیں، اور ہماری نا سمجھی یہ ہے کہ ہم ان کے ایجنڈہ کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور ایسی نامعقول باتوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، عمرانہ سے متعلق واقعہ اگر صحیح ہے، تو اس بد بخت سسر کے بعد سب سے بڑا جرم ذرائع ابلاغ کا ہے، جس نے ساری قوم کے سامنے اسے بے آبرو کیا ہے۔

فقہاء کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلافِ رائے ہے، تاہم خاندانی قوانین سے متعلق مسائل میں نسبتاً کم اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اور ان کم اختلافی مسائل میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ جب کسی طرف سے قانونِ شریعت کو نشانہ بنایا جا رہا ہو، تو

اس وقت ہمیں فقہی اختلاف سے پرے اٹھ کر دفاع کا فریضہ انجام دینا چاہئے ، بلکہ جس مکتبۂ فکر کی جو رائے ہو، اسی پر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق عمل کرنا چاہئے ، یہی معقول طریقۂ کار ہوسکتا ہے، اور مسلمانوں کے سب سے بڑے اور ہمہ مسلکی پلیٹ فارم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا بھی اختلافی مسائل میں ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہے۔

فقہاء کے نقاطِ نظر کی تفصیل یہ ہے کہ مرد وعورت کے تعلق کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں : ایک صورت حلال طریقہ پر نکاح کی ہے، اس کی وجہ سے بالاتفاق رشتوں کی حرمت قائم ہو جاتی ہے، یعنی منکوحہ کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہوجاتی ہے، اور خود منکوحہ اس مرد کے بیٹے یا باپ پر حرام ہوجاتی ہے، دوسری صورت شبہ کی بناء پر تعلق کی ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں ''وطی بالشبہہ'' کہتے ہیں، اگر کوئی ایسی صورت پیش آ گئی کہ غلط فہمی جنسی تعلق کا باعث بن گئی، تو اس صورت میں بھی بالاتفاق وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں، جن کی حرمت نکاح سے متعلق رکھی گئی ہے، تیسری صورت حرام تعلق یعنی زنا کی ہے، اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرلے تو کیا اس کی ماں اور بیٹی زانی پر حرام ہوجائے گی؟ یا کوئی بدبخت اپنی بہو سے زنا کرلے تو وہ اس کے بیٹے پر، یا ساس سے زنا کرلے تو اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی؟ اس سلسلہ میں دو نقاطِ نظر پائے جاتے ہیں :

ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو رشتہ حلال ہے اس حرام کاری کی وجہ سے وہ حرام نہیں ہوگا، مثلاً اگر کسی نے اپنی بہو کے ساتھ بدکاری کی تو وہ اس کے بیٹے پر حرام نہیں ہوگی ، اس کے قائل تابعین میں عروہ، ابن شہاب زہری، سعید بن المسیب اور ائمہ متبوعین میں امام مالک اور امام شافعی ہیں، نیز صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہ رائے منسوب کی گئی ہے۔ (المغنی: ۵۲۶/۹)

ان حضرات کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اگر اس نے کسی عورت کے ساتھ برائی کی ہو، اور پھر وہ اس سے یا اس کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہے تو کیا نکاح کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حرام کسی حلال رشتہ کو

حرام نہیں کرتا، حرمت، نکاح کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے: ''لا یحرم الحلال الحرام ''اس روایت کو ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور طبرانی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، لیکن یہ دونوں ہی روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف سمجھی گئی ہیں، کیوں کہ ابن ماجہ کی روایت میں ایک راوی عبداللہ بن عمر عمری آئے ہیں، (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۰۲۵) اور یہ ضعیف ہیں (تقریب التہذیب ترجمہ نمبر: ۳۴۸۹، نیز دیکھئے: کتاب الضعفاء و المتروکین لابن الجوزي: ۳/ ۲۹) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی روایت میں عثمان بن عبدالرحمٰن زہری ہیں، (مجمع الزوائد: ۴/ ۲۶۹) ان کو متروک یعنی نامقبول راوی سمجھا گیا ہے، اور علامہ ابن معین نے تو ان کو جھوٹا راوی بھی قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: حوالہ مذکور، وتقریب التہذیب، ترجمہ نمبر: ۴۴۹۳)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف بھی اس رائے کی نسبت کی گئی ہے (سنن سعید بن منصور: ۱/ ۳۹۳، باب الرجل یفجر بالمرأۃ، سنن بیہقی: ۷/ ۱۶۱، باب الزنا لا یحرم الحلال) اور خود امام بخاریؒ نے بھی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے، لیکن امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ابونصر کی روایت اس کے برخلاف نقل کی ہے، جس کو سفیان ثوریؒ نے بہ سندِ متصل روایت کیا ہے، کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ وہ اپنی خوشدامن کے ساتھ برائی کا مرتکب ہوگیا ہے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم پر تمہاری بیوی حرام ہوگئی، ''حرمت علیک امرأتک''۔ (فتح الباری: ۹/ ۶۰)

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نکاح اور وطی بالشبہ کی طرح زنا سے بھی حرمت کے رشتے قائم ہوجاتے ہیں، تابعین میں اس کے قائل حسن بصری، عطاء، طاؤس، شعبی اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہ ہیں، ائمہ مجتہدین میں امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ اور امام اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں، (المغنی: ۹/ ۵۲۶) اور امام مالکؒ کا بھی ایک قول اسی طرح کا منقول ہے، (فتح الباری: ۹/ ۶۱) اور اسی نقطۂ نظر کے حامل امام اوزاعیؒ ہیں، (حوالۂ سابق) —— ان حضرات کی دلیلیں اس طرح ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا نے قربت کی ہے، تم

ان سے نکاح نہ کرو لاَ تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ آبَائُکُمْ مِنَ النِّسَاءِ (النساء:۲۲) اس آیت میں نکاح سے مراد ان حضرات نے ہم بستری لی ہے، خواہ جائز طریقہ پر ہو یا ناجائز طریقہ پر، کیوں کہ نکاح کا اصل لغوی معنی ہم بستری ہی کا آتا ہے، گو یہ لفظ قرآن مجید میں عقد نکاح کے معنی بھی استعمال ہوا ہے، لیکن نکاح کے اصل معنی مرد و عورت کے تعلق کے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد لینے میں احتیاط ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف دیکھے گا بھی نہیں جس نے کسی عورت اور اس کی بیٹی دونوں کی شرمگاہ کو دیکھا ہو، (دارقطنی:۳/ ۲۶۹، باب المہر)، مراد دونوں سے ہم بستر ہونا ہے۔

(۳) حضرت امّ ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھا، اس پر اس کی ماں اور بیٹی حلال نہیں رہی "من ینظر إلی فرج المرأۃ لا تحلہ أمھا و لا بنتھا" اس روایت کو ابن ابی شیبہؒ نے نقل کیا ہے اور اس کی سند پر علامہ بیہقی کو کلام ہے۔ (اعلاء السنن:۱۱/۳۰)

(۴) امّ المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبد بن زمعہ تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کے عزیز ہیں اور زمانۂ جاہلیت میں ان کے مورث اور عبد بن زمعہ کی والدہ کے ناجائز تعلق کی بنا پر ان کی پیدائش ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے غور کیا تو عبد بن زمعہ کی شباہت پر ان کی مماثلت غالب تھی، جن کی طرف سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ منسوب کر رہے تھے، چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ وہ ان سے پردہ کیا کریں، (صحیح البخاری، حدیث نمبر:۶۵-۶۷، باب من ادعی أخا أو ابن اخٍ، نیز دیکھئے: مسلم، حدیث نمبر:۱۴۵۷) دیکھئے اس واقعہ میں زنا کی وجہ سے حضرت سودہ رضی اللہ سے پردے کے حکم کو باقی رکھا گیا، اگر حرام کی وجہ سے حلال کی حرمت نہ ہوتی، تو حضرت سودہ رضی اللہ کو جو بغیر حجاب کے نکلنے کی اجازت تھی، وہ ختم نہیں ہوتی۔

(۵) احکامِ شریعت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے،

کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ ﷺ سے استفادہ کیا ہے، اس مسئلہ میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے یہی ہے کہ زنا سے بھی رشتوں کی حرمت قائم ہو جاتی ہے، حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے اپنی خوشدامن کے ساتھ بدکاری کی، اس پر اس کی بیوی اور اس کی خوشدامن دونوں حرام ہو جائیں گی، اس کو مصنف عبدالرزاق میں مقبول سند سے روایت کیا گیا ہے، (اعلاء السنن: ۱۱/ ۳۰) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر نہیں فرمائے گا، جس نے کسی عورت اور اس کی بیٹی کی شرمگاہ کو دیکھا ہو، (فتح الباری: ۹/ ۶۱) ایک اور روایت میں حضرت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں سے ایسے شخص کے بارے میں مروی ہے کہ اس طرح کی بات پیش آنے کے بعد جب بھی وہ میاں بیوی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوں گے، زنا کرنے والے ہوں گے ''لا یزالا زانیین ما اجتمعا'' (مجمع الزوائد: ۴/ ۲۶۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل تھے، (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۵۰۱۵) یہی رائے صحابہ میں حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ کی ہے۔ (فتح الباری: ۹/ ۶۱)

غرض کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن زید اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین کا فتویٰ یہی تھا، اس کے برخلاف صرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ منقول ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف اس کی نسبت مشکوک ہے، کیوں کہ —— جیسا کہ مذکور ہوا —— ان سے دونوں طرح کے فتاویٰ منقول ہیں۔

(۶) قیاس اور نظائر کا تقاضہ بھی یہی ہے؛ کیوں کہ رشتوں کی حرمت کا حکم جیسے مباح طریقہ پر ہم بستری سے متعلق ہوتا ہے، اسی طرح حرام طریقہ پر کی جانے والی ہم بستری سے بھی متعلق ہوتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص حالتِ حیض میں عورت سے ملے، تو حالاں کہ یہ حرام ہے اس کے باوجود حرمت کے رشتے قائم ہو جاتے ہیں، اسی طرح اگر ظہار کے بعد کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی سے ملے یا روزہ کی حالت میں بیوی سے ہم بستری کرے، تو جس رشتہ کی حرمت صرف نکاح سے نہیں بلکہ دخول سے متعلق ہو وہ بھی ثابت ہو جاتی ہے، اس لئے زنا

کی وجہ سے حرمت کے رشتے ثابت ہوجانے چاہئیں۔

(۷) حلال وحرام کے معاملے میں اور بالخصوص انسانی عصمت کے سلسلہ میں احتیاط کا حکم ہے، اسی لئے فقہاء نے اصول متعین کیا ہے کہ جب حلال وحرام کا احتمال جمع ہوجائے تو حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جائے گی ''إذا اجتمع الحلال و الحرام فغلب الحرام ''نیز انسانی عصمت وآبرو کے سلسلے میں اصل حرام ہونا ہے ''الأصل في الأبضاع التحريم '' لہٰذا زنا کی وجہ سے حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اور غور کریں تو یہ فطرت کی آواز بھی ہے، ایک عورت جو ظلماً یا جبراً ہی سہی کسی مرد کے تصرف میں آچکی ہے، اس کے لئے اسی کے باپ یا اسی کے بیٹے سے جنسی تعلق قائم کرنا نفسیاتی طور پر حد درجہ تکلیف دہ اور اس کی غیرت کو چیلنج کرنے والا ہوتا ہے، حرام رشتوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ گھر کی فضا شک وشبہ سے محفوظ رہے، کیوں کہ حرمت کی دیوار سلیم الفطرت لوگوں کے لئے برائی کے تصور کو بھی ختم کردیتی ہے، لیکن جب ایک دفعہ کوئی شخص برائی کر گزرتا ہے تو وہ حیا کی چادر اتار پھینکتا ہے، پھر اس سے دوبارہ اس حرکت کے ارتکاب کا امکان بھی رہتا ہے، شک وشبہ کی فضا بھی باقی رہتی ہے اور عورت اپنے اوپر مسلسل ایک دباؤ بھی محسوس کرتی ہے، اس لئے سماجی مصالح اور نفسیاتی تقاضوں کے تحت بہتر یہی ہے کہ رشتۂ نکاح ختم ہوجائے، اب غور کیجئے کہ اگر عورت اس خاندان کا حصہ باقی رہے، تو قرابت داری کی وجہ سے بار بار مظلوم عورت کا اپنے زانی سسر سے سامنا ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں اس پر کیا اثر مرتب ہوگا؟

رہ گئی بات قصوروار سزا کی، تو سب سے بڑا مجرم تو اس کا زانی سسر ہے اور اس کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے، اسلامی حکومت میں تو اس کی سزا بہت ہی سخت ہے اور وہ دار الاسلام ہی کے لئے مخصوص ہے، ہندوستان جیسے ملک میں مالی تعزیر عائد کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ عورت کی دوسری شادی کے اخراجات اس زانی سسر کے ذمہ عائد کئے جائیں، نیز اس پر سماجی دباؤ بھی ڈالا جائے اور لوگوں کو جمع کر کے ایسی جسمانی تعزیر کی جائے جو قانون کے دائرہ کے اندر ہو۔

اس میں کسی قدر شوہر بھی قصوروار ہوتا ہے، اس طرح کے واقعات عام طور پر اچانک

پیش نہیں آتے ، بلکہ مختلف مرحلوں میں پیش آتے ہیں، مظلوم عورت اپنے شوہر یا ساس کو متوجہ کرتی ہے، لیکن اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا الٹے اسی کو متہم کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ناخوشگوار بات پیش آجاتی ہے، اسی طرح بعض اوقات عورت مطالبہ کرتی ہے کہ اسے الگ رکھا جائے؛ کیوں کہ وہ اپنے سسرالی خاندان کے بعض مردوں کی نیت کے بارے میں مطمئن نہیں ہوتی، لیکن اسے سسرال والوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس لئے ایسے معاملات میں شوہر کے رویہ کی بھی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ بیوی کی عصمت وعفت کی حفاظت بنیادی طور پر اسی کی ذمہ داری ہے، اگر شوہر قصوروار ہو تو اس کی بھی سرزنش ہونی چاہئے، اور ہندوستان کے ماحول میں سزائیں وہی ہوسکتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا، نیز قصور اس کا ہو یا نہ ہو، بچوں کا نفقہ اسی کے ذمہ ہے اور عورت جب تک ان بچوں کی پرورش کرتی رہے گی، وہ اجرتِ پرورش کی بھی حقدار رہے، فقہاء نے اجرتِ پرورش اتنی مقرر کی ہے کہ اسی میں خود اس کے گذر بسر کا سامان ہو جائے۔

عورت اگر بے قصور ہو تو اسے واقعی ناکردہ گناہ کی سزا مل جاتی ہے، لیکن محض اتنی سی بات اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ اس رشتہ کو باقی رکھا جائے، اگر محض یہ بات رشتے کو باقی رکھنے کا باعث ہو تو غور کیجئے کہ شوہر نے بلا وجہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیا، یا اس سے ایلاء کر لیا، عورت نے بلا وجہ خلع حاصل کیا یا اس نے اپنی مرضی سے خدانخواستہ اپنے سسر یا سوتیلے بیٹے سے جنسی تعلق استوار کر لیا، تو پہلی دونوں صورتوں میں عورت اور بعد کی دونوں صورتوں میں مرد بے قصور ہے، تو کیا محض بے قصور ہونے کی وجہ سے اس رشتے کو باقی سمجھا جائے گا؟ اگر اس اصول کو دوسرے معاملات میں لے جائیں تو اور بھی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قصوروار ہی کو اس کے فعل کا نقصان پہنچے، قرارِ واقعی سزا ملے اور بے قصور کو نقصان نہیں پہنچے، اس کی جگہ دنیا میں نہیں آخرت میں ہے، دنیا میں کتنے ہی واقعات ہیں، جن میں بے قصور سزا پاتے ہیں اور قصوروار بچ جاتے ہیں، اسی لئے دنیا میں کوئی ایسا قانون بنانا ممکن نہیں جو صد فی صد اس اصول پر پورا اترتا ہو، ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ ہے کہ جو لوگ دنیا

میں سزا سے بچ جاتے ہیں، وہ خدا کی عدالت سے نہیں بچ سکیں گے اور ہمیں کچھ اُس عدالت کے لئے بھی باقی رکھنا چاہئے!

پھر اس قضیہ میں دو اور پہلو بھی قابل غور ہیں، اول یہ کہ میاں بیوی کی علاحدگی صرف بیوی ہی کے لئے سزا نہیں ہوتی، شوہر کے لئے بھی سزا ہوتی ہے، ایک شریف مرد جس کے تعلقات اپنی بیوی سے خوش گوار ہوں اور جو بال بچے والا ہو، کے لئے اس کی بیوی کا فراق معمولی آزمائش نہیں ہوتی، اس کا گھر بکھر جاتا ہے، اس کے لئے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش کا مسئلہ دامن گیر ہوتا ہے، اس لئے اس کو محض عورت کے حق میں ہی سزا نہ سمجھنا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ کیا واقعی اس کا ثبوت بھی موجود ہے؟ مرد ہو یا عورت، غلطی دونوں سے متوقع ہوتی ہے، بعض واقعات ایسے بھی سامنے آتے ہیں کہ سسرال والوں سے انتقام لینے اور انھیں ذلیل کرنے کے لئے عورت تہمت لگا دیتی ہے یا دوسرے لوگوں کے ورغلانے پر ایسی باتیں کہہ جاتی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ برائی کی تشہیر تیز ہوا کی طرح ہوتی ہے، اس لئے ہر بات جو مشہور ہو جائے اس کا درست ہونا ضروری نہیں، جو لوگ اس طرح کے سماجی مسائل کو حل کرتے ہیں، انھیں اس کا خوب تجربہ ہے، غور کیجئے کہ امّ المومنین سیدنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے جھوٹی تہمت لگائی اور اسے اتنی ہوا دی کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، تو جب اتنی عظیم خاتون کے بارے میں غلط فہمی جنم لے سکتی ہے، تو عام واقعات میں غلط فہمی کا پیدا ہونا کیا عجیب ہے؟ اس لئے یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ بعض واقعات میں خود وہ مرد مظلوم ہوتا ہے، جس کی طرف برائی کی نسبت کی جاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام کے تمام قوانین فطرت پر مبنی ہیں، شریعت میں بعض رشتوں کا جو تقدس رکھا گیا ہے وہ بھی انسانی فطرت کی آواز اور سماجی اور معاشرتی مصالح پر مبنی ہے اور شریعت کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر ہے، حقیقی عدل کا تحقق اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھی جائے اور کسی واقعہ میں رائے قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ

انصاف کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اس کی تحقیق بھی کی جائے، نیز مسلمانوں کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ انھیں اختلاف میں الجھانے اور ان کے درمیان اختلافی موضوعات کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے، انھیں چاہئے کہ ایسی ناپاک کوششوں کے بارے میں بیدار مغزی سے کام لیں اور غیر ارادی طور پر فقہی اور فروعی اختلافات کو ابھار کر اعداءِ اسلام کو شریعت مطہرہ کے بارے میں زبان کھولنے کا موقع نہیں دیں!!

❑ ❑ ❑ ❑

فتویٰ — سچائی اور پروپگنڈہ

اسلام اس لئے آیا کہ زندگی کے تمام مراحل میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے، اسی لئے قرآن وحدیث میں انسان کی زندگی گذارنے کے اصول پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور زندگی کے مختلف مراحل کے لئے متوازن، معتدل، حکمت ومصلحت سے بھرپور اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ قوانین دیئے گئے ہیں، ان قوانین کو سینکڑوں سال عملی زندگی میں برتا اور اجتماعی وانفرادی زندگی میں نافذ کیا گیا ہے اور ہر منصف مزاج شخص نے اس کی افادیت اور نافعیت کو تسلیم کیا ہے۔

چوں کہ ہر شخص کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ براہِ راست احکام کا استنباط کرے اور انھیں حالات و واقعات پر منطبق کرے، اس لئے ان فقہاء نے 'جن کو اللہ تعالیٰ نے گہری بصیرت اور وسیع مطالعہ سے سرفراز فرمایا ہے' کتاب وسنت میں غور وفکر کر کے احکام مستنبط کئے ہیں اور انھیں مرتب اور مربوط شکل میں عام لوگوں کی رہنمائی کے لئے پیش فرمایا ہے، اسی کا نام ''فقہ'' ہے، اس فن کی آبیاری میں مسلمان علماء کی بہترین ذہانتیں اور قابل رشک صلاحیتیں خرچ ہوئی ہیں اور اتنی گہرائی اور باریکی کے ساتھ انسانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا تجزیہ کیا گیا اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے کہ دنیا کے نظام ہائے قانون میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، قانون کے بہت سے شعبے وہ ہیں جن کی بنیاد مسلمان علماء نے رکھی ہے، اس کا یورپ کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی اعتراف کرتے ہیں، مثلاً حدیث کی تحقیق کے لئے پورے سلسلۂ سند میں آنے والے راویوں کی تحقیق، ان کے حالات کی روشنی میں یہ بات معلوم کرنا کہ ان کی روایت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور پھر تاریخی حوالوں سے یہ جاننا کہ ان راویوں کے درمیان تسلسل ہے، یا بیچ سے روایت کی کوئی کڑی ٹوٹ گئی ہے؟ —— اسی طرح ''اصولِ فقہ'' کا فن ہے، جس کے ذریعہ یہ بات جانی جاتی ہے کہ احکام شریعت کو کس طرح اخذ کیا

جائے ؟ یہی فن آج کل ’’اصولِ قانون‘‘ کے نام سے پوری دنیا میں مروّج ہے اور مغربی مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ایجاد کا سہرا مسلمان علماء وفقہاء کے سر ہے، اسی طرح بین ملکی اور جنگ وامن سے متعلق قوانین، جن کی اہمیت آج پوری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے، مستشرقین اور مغربی ماہرین قانون بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قانون کی تاریخ میں سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ’’سیر صغیر‘‘ اور ’’سیر کبیر‘‘ کے نام سے نہایت ہی عظیم الشان کتابیں تالیف کی ہیں۔

فقہاء کی ان خدمات سے بھی ہر شخص براہِ راست استفادہ نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ یہ پورا ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور صرف عربی زبان سے واقف ہونا بھی ضروری نہیں، جیسے ہر انگریزی داں طب وعلاج کے سلسلہ میں مشورہ نہیں دے سکتا اور انجینیر نگ سے متعلق فنون کی باریکیوں تک اسے رسائی حاصل نہیں ہوسکتی، اسی طرح ہر وہ شخص جو عربی زبان سے واقف ہو اور کسی قدر شعر وسخن کا ذوق رکھتا ہو، فقہ کے اس اتھاہ سمندر سے موتی تلاش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ علماء جنھوں نے عربی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو بھی پڑھا ہے، فقہاء کے مرتب کئے ہوئے علمی ذخیرہ سے استفادہ کیا ہے اور علم کی روشنی حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھوں کو جلایا اور خونِ جگر کا چراغ سلگایا ہے، وہی اس خزانہ سے براہِ راست فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

عام مسلمانوں کے لئے احکامِ شریعت سے واقف ہونے اور ان پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ وہ ایسے اصحابِ نظر علماء سے استفادہ کریں، ان سے اپنی زندگی کے مسائل کے بارے میں سوال کریں اور وہ جو جواب دیں اس پر عمل کریں، جیسے کہ مریض کے لئے ڈاکٹر سے رجوع کرنا اور اس کی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح عام مسلمانوں کے لئے احکامِ شریعت کو جاننے کئے لئے ایسے علماء سے رجوع کرنا ضروری ہے اور اسی میں ان کی دنیا اور آخرت کی بھلائی اور دین وایمان کی حفاظت ہے، اسی پس منظر میں مسلمانوں کے یہاں ابتدائی دور ہی سے ’’فتویٰ‘‘ کا نظام قائم ہے، شرعی احکام کے بارے میں دریافت کرنے کو

’’استفتاء‘‘ اور دریافت کرنے والے کو’’مستفتی‘‘ کہتے ہیں اور ان سوالات کے جواب کو’’فتویٰ‘‘ اور جواب دینے والے کو’’مفتی‘‘ کہا جاتا ہے۔

مفتی جب کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اس میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کا ترجمان ہوتا ہے، اور فتویٰ کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے واجب ہونے یا جائز ہونے کی خبر دینا ہے، ’’الفتویٰ إخبار عن اللّٰہ تبارک و تعالیٰ من إلزام أو إباحۃ‘‘ (کتاب الفروق للقرافی:۴/۵۳) اسی لئے فتویٰ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو شخص فتویٰ دینے میں جری ہو، وہ دراصل دوزخ پر جری ہے، (سنن دارمی:۱/۵۷) صحابہ رضی اللہ عنہم کی احتیاط کا حال یہ تھا کہ ابن ابی لیلیٰؒ نقل کرتے ہیں :

> میں نے ایک سو بیس انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ ان میں سے ایک سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ دوسرے کا، دوسرا تیسرے کا حوالہ دیتا اور اسی طرح ایک دوسرے سے رجوع کرنے کی تلقین کرتا، یہاں تک کہ یہ سوال پھر پہلے شخص کی طرف لوٹ آتا۔
> (شرح مہذب:۱/۴۰)

امت کے سب سے پہلے مفتی خود پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ تھے، (اعلام الموقعین:۱/۱۱) اور آپ ﷺ وحی الٰہی کی بناء پر فتویٰ دیا کرتے تھے، پھر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی ذمہ داری کو انجام دیا، علامہ ابن قیمؒ نے ایک سو تیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے، جن سے فتویٰ دینا ثابت ہے، ان میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، (دیکھئے: اعلام الموقعین:۱/۱۴-۱۲) پھر تابعین اور ائمۂ مجتہدین نے اپنے اپنے عہد میں اس اہم فریضہ کو انجام دیا اور اس کے بعد ہر دور کے علماء اور فقہاء اس خدمت کو انجام دیتے رہے ہیں اور مقامِ مسرت ہے کہ اس سلسلہ میں علما ہند کی خدمات کی بھی روشن اور تابناک تاریخ ہے۔

مسلمانوں کو مذہب سے جوڑے رکھنے اور حلال وحرام کے سلسلہ میں احکامِ شریعت کا

پابند بنانے میں فتویٰ کا بڑااہم حصہ ہے،احکامِ شریعت پرعمل کرنے کے لئےعلم ضروری ہے، اورعلم وآگہی کے لئے اہل علم سے رابطہ ناگزیر ہے، اس لئے فتویٰ اور اہل افتاء کا سماج کی اصلاح اور معاشرہ کی گناہوں سے حفاظت میں نہایت خاموش اوراہم خدمت ہے، آج کل چوں کہ اسلام سے عناد رکھنے والے اور مذہب کا طوق اتار پھینکنے والے، مسلمانوں کے ہر اس ادارہ پر حملہ کررہے ہیں، جوانھیں دین سے مربوط رکھنے میں کوئی کردار ادا کررہا ہے، چنانچہ کبھی مسجدوں کونشانہ بنایا جاتا ہے، کبھی دینی درسگاہوں کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا جاتا ہے، کبھی دینی جماعتوں اور تنظیموں کو بنیاد پرستی کا اصل سبب گردانا جاتا ہے، کبھی اسلامی لٹیریچر پر زبانِ طعن کھولی جاتی ہے، اور کبھی شرعی عدالتی نظام کے خلاف آوازیں کسی جاتی ہیں، ایسی ہی نا رَوا کوششوں کا ایک حصہ یہ ہے کہ اب فتویٰ اوردارالافتاء کے نظام پربھی انگلی اٹھائی جارہی ہے، اس کومسلمانوں کے اندر بنیاد پرستی پیدا کرنے کا سرچشمہ قرار دیا جارہاہےاوراس کا استہزا بھی کیا جاتا ہے۔

چنانچہ چندروزقبل ایک عزیز فاضل نے معروف انگریزی ہفت روزہ ''Out Look'' کے ۱۲/ دسمبر کے شمارہ کی طرف توجہ دلائی ہے، جس میں فتویٰ اور دارالافتاء کی نہایت ہی وحشت ناک اورخلاف واقعہ تصویر کھینچی گئی ہےاوراسے سرورق کا عنوان بنایا گیا ہے، جس پرایک ایسی عورت کا فوٹو ہےجس کے ہونٹ پرخطرہ کا نشان بنا کرلکھا گیا ہے: ''No makeup'' گویا مفتی حضرات عورتوں کوتزئین وآرائش سے منع کرتے ہیں، پھراس مضمون میں عمرانہ کی تصویر، سلمان رشدی کے خلاف نوجوانوں کے احتجاج اورشرعی عدالت کا ایک منظرفوٹو کے ذریعہ نمایاں کرتے ہوئے اورمختلف فتاویٰ کے اقتباسات دیئے ہوئے فتویٰ سے متعلق تاریک پہلو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، نیزمختلف ایسے نام نہادمسلمانوں کی رائے بھی پیش کی گئی ہے، جن کی اسلام کے بارے میں واقفیت نہایت ہی معمولی، ابتدائی اورنا قابل لحاظ ہے؛ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نےمخالفین اسلام کے لٹریچر سے اسلام کوجاننے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کے پروپگنڈوں سے باخبر رہیں اور جو

مسلمان انگریزی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کر سکتے ہوں ، وہ سنجیدہ اور معقول طریقہ پر ایسی غلط فہمیوں کا انگریزی رسائل کے ذریعہ جواب دیں ، اور خاص کر انگریزی صحافت سے وابستہ مسلمان ایسی تحریروں کے سلسلہ میں قارئین کے سامنے حقائق اور سچائیوں کو پیش کریں ، احکامِ شریعت اور فتاویٰ کے سلسلہ میں چند باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں :

☆ فتویٰ علماء کی طبع زاد خود ساختہ باتیں نہیں ہیں ، بلکہ یہ اصل میں قرآن وحدیث ہی کی تشریح ہے ، اس لئے جو لوگ فتاویٰ پر تنقید کرتے ہیں اور علماء کو لعن وطعن کا نشانہ بناتے ہیں وہ دراصل خود اسلام پر حملہ کر رہے ہیں ، اور مسلمانوں کے غیظ وغضب سے بچنے کے لئے انھوں نے علماء کی مذمت کو اپنے لئے ڈھال بنا رکھا ہے۔

☆ فتاویٰ میں چوں کہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا شرعی حکم بتایا جاتا ہے اور انسانی زندگی میں اچھے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور برے بھی ، یہاں تک کہ بعض بہت ہی گھناؤنے افعال کا بھی ارتکاب ہوتا ہے ، جو دین انسانی زندگی کا مکمل رہنما ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان ناشائستہ واقعات کے بارے میں بھی شریعت کے منشاء کو واضح کرے ، اس لئے فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں بعض ناشائستہ افعال سے متعلق احکام بھی ملتے ہیں ، یہ اس فن کا نقص نہیں ہے ، بلکہ کمال ہے ، کیوں کہ اگر ان واقعات کے بارے میں رہنمائی موجود نہ ہو تو دین کی رہنمائی نامکمل اور نا تمام رہ جائے گی ، جس مکان میں صحت مندوں کے آرام کی جگہ ہو اور بیماریوں کے لئے کوئی جگہ نہ ہو ، جس سماج میں طاقتوروں کے مسائل کا حل ہو اور کمزوروں کے لئے کوئی رہنمائی نہ ہو اور جس قانون میں بہتر اعمال کے لئے جزاء اور انعام ہو اور مجرمین کے لئے سزا وعِتاب نہ ہو ، وہ مکان ، وہ سماج اور قانون ناقص ہی ہو سکتا ہے ، اس لئے فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں ایسے مسائل کو دیکھ کر بدگمان نہ ہونا چاہئے۔

☆ اسلام نے عورتوں کو زیبائش وآرائش کی اجازت دی ہے اور اسی لئے زیورات ، سونا چاندی ، مہندی ، سرخ اور زعفرانی رنگ وغیرہ کو عورتوں کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے ، بلکہ بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے ؛ البتہ مردوں کے لئے مبالغہ آمیز زینت کو پسند

نہیں کیا گیا ہے۔

☆ اسلام میں خروجِ ریح کو وضو ٹوٹنے کا سبب بتایا گیا ہے، اس کو بھی بار بار استہزاء اور تمسخر کا نشانہ بنایا گیا ہے، حالاں کہ غور کیا جائے تو اس میں انسان کے لئے بڑی حکمت و مصلحت ہے، بعض مذاہب میں صفائی ستھرائی سے گریز کو خدا سے قربت کا باعث سمجھا گیا ہے، خاص طور پر استنجاء کرنے کا تو اکثر مذاہب اور اہل مذاہب میں تصور ہی نہیں ہے، جن لوگوں نے صفائی ستھرائی کی تلقین کی ہے ان کے یہاں بھی اس کا کوئی باضابطہ عملی نظام قائم نہیں ہے۔

اسلام میں نظافت وطہارت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف اس کی تلقین فرمائی، بلکہ اس کا ایک پورا عملی نظام مرتب فرما دیا، ہفتہ میں ایک دن غسل کو سنت قرار دیا گیا، نوجوان حضرات کو چوں کہ زیادہ محنت ومشقت کرنی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے پسینہ نکلتا ہے اور میل کچیل جمع ہوجاتا ہے، اس لئے ایسے اسباب کو غسل کا موجب قرار دیا گیا جو نوجوانوں کی زندگی میں بار بار پیش آتے ہیں، اسی طرح چہرہ اور ہاتھ پاؤں زیادہ غبار آلود ہوتا ہے، اس لئے پنج وقتہ نماز کے لئے وضو کو ضروری قرار دیا گیا اور ایسی چیزیں ناقض وضو قرار پائیں جو انسان کو بار بار پیش آتی رہتی ہیں، اس طرح اسلام نے نظافت اور صفائی ستھرائی کو محض ایک نظریہ اور اخلاقی ہدایت تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کا ایک مکمل عملی نظام اور پروگرام دے دیا گیا، آج کل مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کی مثال حضرت مسیح علیہ السلام کے قول کی طرح ہے کہ وہ اونٹ کو نگلتے اور مچھر کو چھانتے ہیں، فطرت سے بغاوت، اخلاقی انحطاط، ظلم و جور دوسری قوموں کے معاملہ میں انسانی حقوق کی پامالی، غریب ملکوں کا استحصال اور اس جیسی کتنی ہی بیماریاں خود ان کے سماج میں موجود ہیں، ان کا کہیں ذکر نہیں، لیکن اسلام کا حسن بھی انھیں عیب اور اس کا کمال بھی انھیں نقص نظر آتا ہے!

۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ ۳۰/ دسمبر ۲۰۰۵ء

❑ ❑ ❑ ❑

انبیاء کی اہانت اور یہود و نصاریٰ

ادھر عرصہ سے مغربی ممالک کا مزاج یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر دینے والی کوئی بات کہتے ہیں، یا ایسا کوئی عمل کر گذرتے ہیں اور جب مسلمانوں کی طرف سے فطری ردِعمل سامنے آتا ہے تو اس سے دوہرا فائدہ اُٹھاتے ہیں، ایک تو ان پر شدت پسندی کا لیبل لگا یا دیا جاتا ہے، دوسرے مسلمانوں کو ایسے واقعات میں الجھا کر تعمیری کاموں کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی منصوبہ بند کوشش کی جاتی ہے، مسلمانوں کو ذہنی اذیت بھی پہنچائی جاتی ہے، ان کے جذبات بھی مجروح کئے جاتے ہیں، عملی زندگی کی پیش رفت میں ان کا راستہ بھی روکا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں بدنام اور رسوا بھی کیا جاتا ہے، اب اسی جسارت کو دیکھئے کہ ڈنمارک کے ایک اخبار نے پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مضحکہ خیز کارٹون شائع کیا اور جب مسلمانوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو زخموں پر نمک پاشی کے لئے ناروے، فرانس اور یورپ کے بعض اخبارات بھی میدان میں کود پڑے، پھر اخبار نے اس احتجاج پر جو معذرت شائع کی ہے، وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق اور مغرب کی اندرونی خباثتوں کا آئینہ دار ہے، چنانچہ ڈنمارک کے مذکورہ ایڈیٹر کے الفاظ اس طرح ہیں :

> ہمارے خیال میں وہ بارہ کارٹون خاصے سنجیدہ تھے جنھیں ہمارے اخبار نے شائع کیا تھا، ان کا مقصد کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا، نہ ہی ان کے سبب ڈنمارک کے کسی قانون کی خلاف ورزی ہوئی تھی، لیکن بلا شبہ ان کارٹونوں کے سبب بہت سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی تھی، اس لئے ہم ان سے معافی کے خواستگار ہیں۔

گویا خلافِ واقعہ بات لکھنا کوئی غیر سنجیدہ بات نہیں ہے، یہ دراصل مغرب کے مبالغہ آمیز تصورِ آزادی کا نتیجہ ہے، آپ کو سڑک پر گاڑی چلانے کی آزادی ہے، لیکن اس آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سمتِ مخالف سے آنے والی گاڑی کو ٹکر دے دیں، یا آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی پیدل راہ گیر کو روند ڈالیں، آپ کی آزادی اسی دائرہ تک محدود ہے جو دوسروں کے نقصان اور ضرر کا موجب نہ ہوتی ہو، اور یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنی آزادی کا استعمال سچائی اور اخلاقی قدروں کی رعایت کے ساتھ کریں، آزادی کے نام پر اخبار کسی کی بہو بیٹی کی عزت نیلام کرنے لگے اور شریف اور معزز لوگوں کو برسر بازار رسوا کرنے کی مہم شروع کر دے تو یہ آزادی کا ناروا استعمال ہے، اس لئے کہ قانون خواہشات وجذبات کی آزادیوں کو محدود کرتا ہے اور انھیں مناسب حدود میں رہتے ہوئے ہی پوری کرنے کی اجازت دیتا ہے، اگر یہ قیود وحدود باقی نہ رہیں تو انسانی سماج جنگل بن کر رہ جائے گا، جس میں نہ جان کی امان ہوگی نہ مال کی حفاظت ہوگی، نہ عزت و ناموس کا تحفظ ہوگا اور کمزوروں اور زیر دستوں کو طاقتوروں اور بالا دستوں کی چیرہ دستیوں کا لقمۂ تر بننا پڑے گا۔

مسلمانوں کو اس موقع پر دو باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے: اول یہ کہ انبیاء کرام کی توہین مغرب کا کوئی نیا عمل نہیں ہے، بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی پرانی فطرت کے عین مطابق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی سعادت سے یہ حضرات تو محروم ہی ہیں، لیکن جن پیغمبروں پر ان کا ایمان ہے، ان کے ساتھ بھی ان کا سلوک اتنا شرمناک رہا ہے کہ جس کو زبان اور قلم پر بھی لانے کی ہمت نہیں ہوتی، لیکن محض ان کی موروثی خصلتِ بد کے اظہار کے لئے دل پر پتھر رکھ کر چند نمونے نقل کئے جاتے ہیں :

○ عیسائیوں کا عقیدۂ کفارہ تمام تر اس بات پر مبنی ہے کہ نعوذ باللہ حضرت آدم علیہ السلام گنہگار تھے اور گنہگاری بھی اس درجہ کی تھی کہ اس وقت سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش تک نسل درنسل منتقل ہوتی گئی اور عیسائی علماء کا عقیدہ رہا ہے کہ آپ کو اس سے توبہ کی توفیق بھی میسر نہیں آئی۔

○ اولوالعزم پیغمبروں میں ایک سیدنا حضرت نوح علیہ السلام ہیں، ان کے بارے میں تورات میں ہے :

......نوح کاشتکاری کرنے لگا، اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا اور اس نے اس کی مے پی، اور اسے نشہ آیا، اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہوگیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو باہر آکر خبر دی۔ (پیدائش:۹:۲۰-۲۲)

○ حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام پروٹسٹنٹ فرقہ کے ایک رہنما پادری ولیم اسمتھ کے بیان کے مطابق (نعوذ باللہ) ایک زمانہ میں بت پرستی کیا کرتے تھے۔

(اظہار الحق، مترجم:۳۵۲/۳، بحوالہ: طریق الاولیاء)

اسی طرح حضرت سارہ کی موجودگی میں حضرت ہاجرہ سے آپ علیہ السلام کے نکاح کرنے کو بھی پروٹسٹنٹ علماء نے جرم سے تعبیر ہے۔

○ حضرت لوط علیہ الصلاۃ والسلام کی پاک زندگی پر ایسی ناشائستہ تہمت لگائی گئی ہے جس کی پیغمبر تو کیا، کسی شریف انسان سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی ہے، چنانچہ تورات کا بیان ہے :

اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جابسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں، کیوں کہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے، تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں، جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے، آؤ ہم اپنے باپ کو مئے پلائیں، اور اس سے ہم آغوش ہوں، تا کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں، سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مئے پلائی، اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ

> کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی، اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، آؤ آج رات بھی اس کو مئے پلائیں، اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو، تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں، سو اس رات بھی انھوں نے اپنے باپ کو مئے پلائی، اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی، سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ (پیدائش:۱۹:۳۰-۳۶)

○ حضرت اسحاق علیہ الصلاۃ والسلام پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو بہن کہا (پیدائش:۲۶:۶) گویا دروغ گوئی سے کام لیا۔

○ حضرت یعقوب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بھوک سے نڈھال اپنے بڑے بھائی کو اس وقت تک روٹی اور مسور کی دال تک نہیں دی، جب تک کہ وہ پہلوٹھا ہونے کی حیثیت سے اپنے حق سے حضرت یعقوب کے حق میں دستبردار نہ ہو گیا (پیدائش: ۲۵: ۲۹-۳۴)، تورات میں (نعوذ باللہ) حضرت یعقوب علیہ السلام کے راحل بنت لابن سے معاشقہ اور پھر لابن کی دونوں بیٹیوں لیا اور راحل سے ہم آغوش ہونے کا ذکر آیا ہے۔ (دیکھئے: پیدائش:۲۹:۱۵-۳۰)

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے صاحبزادہ کے کردار کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے :

> روبن نے جا کر اپنے باپ کی حرم بلہاہ سے مباشرت کی اور اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا۔ (پیدائش:۳۵:۲۲)

گویا بیٹے نے خود اپنے باپ کی بیوی کو بے آبرو کیا اور یہ بات باپ کے علم میں بھی آ گئی، پھر بھی اس پر کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں ایک یہوداہ ہیں، جن کی طرف یہود اپنی نسبت کرتے ہیں، تورات کا بیان ہے کہ یہوداہ نے اپنے ہلاک شدہ بیٹے کی بیوی سے نسل

بڑھانے کی ترغیب اس کے چھوٹے بھائی کو دی اور خود بھی تمر نامی اپنی بہو سے مباشرت کی۔ (دیکھئے: پیدائش:۳۸:۱۶-۱۹)

○ حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں تورات کہتا ہے کہ انھوں نے سونے کے زیورات جمع کر کے بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پرستش کی دعوت دی۔ (خروج:۳۲:۱-۶)

○ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا قہر بھڑکا (خروج:۴:۱۴)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ انھوں نے غصہ میں تورات کی تختیوں کو پٹک دیا اور اسے توڑ ڈالا (خروج:۳۲:۱۹)، بنی اسرائیل کے ساتھ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی قصوروار قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان پیغمبروں نے خدا کی تقدیس نہیں کی۔ (گنتی:۲۰:۱۲)

○ بائبل کے صحائف میں سمسو نامی ایک نبی کا ذکر آیا ہے اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے پیشہ ور عورت کے ساتھ زنا کیا۔ (قضاۃ:۱۶:۱)

○ حضرت داؤد علیہ السلام کی جو تصویر بائبل میں کھینچی گئی ہے، وہ ناقابل بیان ہے اور وہ یہ ہے کہ نعوذ باللہ کسی کی منکوحہ پر جو غسل کر رہی تھی، آپ کی نظر پڑی، آپ نے اس عورت کو بلوا کر اس سے قربت کی، یہاں تک کہ وہ حاملہ ہوگئی، پھر اس کے شوہر کو میدانِ جنگ میں آگے بھیج دیا، تاکہ وہ مارا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد آپ اسے اپنے حرم میں لے آئے۔ (سموئیل کے گیارھویں اور بارھویں باب میں اس کی تفصیل موجود ہے)

○ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک صاحبزادے امنون تمر نامی خاتون سے زنا بالجبر کا ارتکاب کرتا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام باوجود مطلع ہونے کے اس پر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ (سموئیل:۲، باب:۱۳)

○ حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحبزادہ ابوسلوم کا بھی تورات میں ذکر ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ محل کی چھت پر سب بنی اسرائیل کے سامنے اپنے باپ کی حرموں کے پاس گیا (سموئیل:۲، باب:۱۶:۲۳) تورات اس بے آبروئی کو نعوذ باللہ خود حضرت داؤد علیہ السلام کے

عمل کا خمیازہ قرار دیتا ہے، چنانچہ تورات کہتا ہے :

> سو خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں شر کو تیرے (حضرت داؤد) ہی گھر سے تیرے خلاف اٹھاؤں گا، اور میں تیری بیویوں کو لے کر تیری آنکھوں کے سامنے تیرے ہمسایہ کو دوں گا، اور وہ دن دھاڑے تیری بیویوں سے صحبت کرے گا، کیوں کہ وہ تو نے چھپ کر یہ کیا، پر میں سارے اسرائیل کے روبرو دن دھاڑے کروں گا۔ (سموئیل:۲:۱۲:۱۱،۱۲)

○ تورات حضرت سلیمان علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی زیادہ خطا کار قرار دیتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام لگاتا ہے کہ وہ فرعون کی بیٹی اور بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگے تھے اور سات سو شہزادیاں اور تین سو بیویاں ان کے حرم میں تھیں، ان کی یہ بیویاں کافر و مشرک تھیں، جنھوں نے (نعوذ باللہ) آپ کو بھی شرک کے راستہ پر ڈال دیا تھا، یہاں تک کہ خدا کی تنبیہ کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام کو تنبیہ نہیں ہوسکا، چنانچہ تورات آپ کے بارے میں مختلف مذموم باتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

> اور خداوند سلیمان سے ناراض ہوا، کیوں کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا، جس نے اسے دوبارہ دکھائی دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے وہ بات نہ مانی، جس کا حکم خداوند نے دیا تھا، اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا: چوں کہ تجھ سے یہ فعل ہوا اور تو نے میرے عہد اور میرے آئین کا جن کا میں نے تجھے حکم دیا نہیں مانا، اس لئے میں ضرور ٹکڑے ٹکڑے کر کے تیرے خادم کو دے دوں گا۔
>
> (سلاطین اول:۱۱:۹-۱۱)

اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے بت خانے بنانے کی بھی نسبت کی گئی ہے۔

○ تورات ساؤل نامی بادشاہ کے نبی بنائے جانے اور اسی حال میں سارا دن اور ساری رات ان کے ننگے رہنے کا ذکر کرتا ہے۔(دیکھئے:سموئیل:۱:۹۱:۳۲)

یہ بیانات تو بائبل کے عہد عتیق کے ہیں، جن پر یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کا اتفاق ہے، لیکن بائبل کا عہد جدید بھی ایسے تذکروں سے خالی نہیں، اب یہی دیکھئے کہ یہوداہ اسکر یوتی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ میں ہیں، لیکن محض تیس درہم کی لالچ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے حوالہ کر ڈالا (دیکھئے:انجیل متی:۲۷)، یوحنا کی انجیل میں اسے چور قرار دیا گیا ہے، بائبل کے بیان کے مطابق جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو گرفتار کرایا تو کمال بے وفائی کے ساتھ آپ سے الگ ہوگئے، ان حواریوں میں سب سے زیادہ لائق و فائق شخصیت جناب پطرس کی ہے، ان پر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حمایت اور ان سے تعلق کا الزام لگایا گیا تو ''مسیح پر لعنت کرنے اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا'' (متی:۲۶:۷۴) یہ بنی اسرائیل ہی ہیں جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جسمانی نقص وعیب کی تہمت لگائی، قومِ عمالقہ سے جنگ کی نوبت آئی تو کہنے لگے: آپ اور آپ کے رب جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھیں گے،''**اذهب انت وربک فقاتلا ، انا ههنا قاعدون** ''(مائدہ:۲۴)حضرت یحییٰ علیہ السلام کو دو ٹکرے کردیا، اس لئے قرآن نے ان کی جسارت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:''**يقتلون النبيين**'' کہ یہ انبیاء کے قتل سے بھی نہیں چوکتے تھے''۔

یہ حال تو موجودہ مغربی دنیا کے آباء واجداد کا تھا، جن کی سرتابیوں اور نافرمانیوں اور انبیاء کے ساتھ بدسلوکیوں اور شرارتوں کا ذکر کسی اور کتاب نے نہیں ؛ بلکہ اس کتاب نے کیا ہے جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں، اس لئے وہ اگر انبیاء کی اہانت جیسے سنگین جرم کے مرتکب ہیں، تو یہ مجرمانہ ذہن انھیں میراث میں ملا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کا ایمان ہے اور وہ انھیں نبی سے آگے تک مانتے ہیں، لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے امریکہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک فلم بنی تھی، جس میں یہ بات دکھائی گئی تھی کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جارہے تھے تو نعوذ باللہ ان پر ایمان لانے والی ایک طوائف کے بارے یہ بات ان کے ذہن میں

گردش کررہی تھی کہ انھوں نے اس عورت کے ساتھ بدکاری کیوں نہیں کرلی؟ اس فلم پر جب اکادکا اعتراض ہوا تو فلم کے ڈائرکٹر نے اسے اظہارِ خیال کی آزادی سے تعبیر کیا، اسی طرح ایک مشہور ناول ''ڈاؤنچی کوڈ'' لکھا گیا، جسے امریکہ اور یورپ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس میں یہ بات بتائی گئی کہ حضرت مسیح نعوذ باللہ ایک فاحشہ عورت سے ہم آغوش ہوئے اور اس عورت کو اس سے اولاد بھی حاصل ہوئی، ان جسارتوں اور خباثتوں پر غور کیجئے جو یہودیوں اور عیسائیوں نے انبیاء بنی اسرائیل اور خود اپنے آباء واجداد کے ساتھ روا رکھی ہے، تو ان کی بدگوئی پر حیرت نہ ہوگی۔

چوں کہ اسلام اور شریعت اسلامی کی اساس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ہے، اس لئے مغربی دنیا نے صلیبی جنگوں سے لے کر آج تک ہمیشہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات کو نشانہ بنایا ہے، مستشرقین نے اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کی شخصیت کی ایسی تصویر کھینچی ہے جس کو اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی مسترد کردے گا، یہاں تک کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ پر بت پرستی اور نفس پرستی کی تہمت لگائی گئی، سیرتِ نبوی ﷺ کو غلط انداز پر پیش کرنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی غرض سے مستشرقین نے اتنا زیادہ لکھا ہے اور ہر روز لکھنے کا سلسلہ جاری ہے کہ صرف ان کتابوں کے نام لکھے جائیں تب بھی پوری ایک جلد ہوجائے۔

مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے ایمان وعقیدہ سے کھیلنے کے لئے انھوں نے مسلم سماج میں سے سلمان رشدی جیسے بددین اور بدزبان شخص کو بھی کھڑا کیا، شراب خانوں کا نام مکہ (Mucca) تک رکھا گیا، تاکہ مسلمان اس صورتِ حال سے مشتعل ہوں، اس لئے خدا ناترسی، آخرت میں جواب دہی کے عقیدہ سے محرومی، حساب وکتاب سے بے خوفی، حد سے گذری ہوئی لذت پسندی، نفس کی پرستاری، اندرونی خباثت اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی منصوبہ بند سازش کی وجہ سے وہ ہمیشہ انبیاء کی اہانت کے مرتکب ہوتے رہے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی اور یادہ گوئی کا ایک مزید مقصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و

عظمت کومسلمانوں کے دلوں سے نکال پھینکنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے دل میں تمام انبیاء کی اور خاص کر پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی بے پناہ محبت ڈال دی ہے،اس کے لئے سر کٹا دینا، اپنی رگِ جاں کا آخری قطرۂ خون بہا دینا، اس راہ میں جان و مال کا نذرانہ پیش کرنا نہ صرف آسان ہے، بلکہ وہ اسے ایک سعادت سمجھتا ہے، اس سے اس کی زندگا کا سودا کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے نبی کی محبت خریدی نہیں جاسکتی، وہ اپنی رسوائی اور بے آبروئی کو برداشت کرسکتا ہے لیکن حضور ﷺ کی شان میں ادنیٰ بے توقیری کو گوارا نہیں کرسکتا، اس کے گھر کو آگ لگائی جاسکتی ہے، لیکن اس کے سینہ میں محبت کی جو انگیٹھی جل رہی ہے اسے بجھایا نہیں جاسکتا، یہی محبت اس کی سب سے بڑی متاع ہے، اس کے لئے نبی کی محبت کے مقابلہ والدین اور بیوی بچوں کی محبت بھی کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ محبت جو اسے اپنے آباء واجداد سے میراث میں ملی ہے اور پیغمبر کے نام پر مرمٹنے کا جذبہ اور اپنے آپ کو قربان کردینے کا حوصلہ جو اسے اپنے بزرگوں سے ایک درنایاب کی طرح حاصل ہوا ہے، کسی بھی قیمت پر وہ اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔

یہ اتھاہ محبت اور انمٹ جذبۂ احترام مغرب کی بے حس، مذہب کے معاملہ میں غیر سنجیدہ، خدا کی محبت اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے سے محروم قوموں کے لئے باعث تعجب ہے کہ آخر اس کے دلوں سے اس کے نبی کی محبت کیوں کر نکالی جائے اور کیوں کر آپ ﷺ کی عظمت وحرمت کا یہ جذبۂ بے پناہ کم کیا جائے؟ تاکہ دین سے ان کا رشتہ کمزور تر ہوجائے اور مغرب کی خدا بے زاری اور مادیت پرستی میں وہ پوری طرح ان کے ہم دوش اور ہم قدم بن کر کھڑے ہوجائیں، کیوں کہ اگر خدانخواستہ کسی شخص کے دل سے آپ ﷺ کی عظمت وبزرگی کا احساس نکل جائے اور آپ ﷺ کی محبت کا عنصر کم ہوجائے تو پھر اس کے ایمان کا اغوا کرلینا چنداں دشوار نہیں ہوگا، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس عالمی سازش پر متنبہ رہیں اور انبیاء کی محبت وعظمت کی جو امانت انھیں اپنے بزرگوں سے ملی ہے اور جس پر ان کا مسلمان ہونا موقوف ہے، وہ اس امانت میں ذرا بھی اضمحلال نہ آنے دیں اور اسے اگلی نسلوں تک پہنچائیں۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام دشمن عناصر مسلمانوں کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ مسائل میں الجھا کر رکھنا چاہتے ہیں، وہ خواہاں ہیں کہ مسلمان احتجاج اور مظاہروں میں اُلجھ جائیں اور تعمیری کام نہ کرسکیں، ان کی صلاحیت احتجاج اور مدافعت میں خرچ ہوجائے، تعلیم کے میدان میں حالیہ برسوں میں مسلمانوں نے بہتر پیش رفت کی ہے، سائنس وتحقیق میں بھی ان کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں، امریکہ ویورپ کی یونیورسٹیوں میں زیادہ تر طلبہ وطالبات ایشیاء وعالم اسلام کے ہیں اوران کی خدمات نہایت ہی نمایاں ہیں، مغرب چاہتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ ایسے غیر حقیقت پسندانہ مسائل میں اُلجھے رہیں کہ ان کے لئے علمی ترقی دشوار ہوجائے۔

اس صورتِ حال کو سمجھنے اوراس کی روشنی میں لائحۂ عمل بنانے کی ضرورت ہے، ایسے واقعات پر برہمی اور ناراضگی کا اظہار ایسی حدوں میں ہونا چاہئے جوخود مسلمانوں اور عالم اسلام کے لئے نقصاندہ نہ ہوجائے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایسے کئی واقعات پیش آئے جن میں آپ ﷺ کی اہانت کی کوشش کی گئی، غلط القاب سے آپ ﷺ کو ذکر کیا گیا، صحابہ ؓ کو فطری طور پر اس طرح کی ناشائستہ باتیں مشتعل کردیتی تھیں، لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی انھیں بے قابو نہیں ہونے دیا، اصل مقصد پر نظر رکھا اور پوری توجہ دعوت دین پر مرکوز کئے رہے، اس طرح دشمنوں کی سازشیں ناکام ہوتی رہیں، آج بھی ہمیں یہی رویہ اختیار کرنا ہوگا، ہمیں ایسے واقعات پر احتجاج ضرور کرنا چاہئے، ناراضگی کا اظہار بھی ہونا چاہئے، لیکن ہمیں یہ بات بھی یادرکھنی چاہئے کہ ہمارا اصل مشن اسلام کی دعوت اور بندگانِ خدا کی ہدایت ہے، یہ بات خوش آئند ہے کہ ہندوستان نے ہمیشہ ایسے مسائل میں تمام مذہبی طبقات کے جذبات کو ملحوظ رکھا ہے اوراس واقعہ میں وزیر اعظم من موہن سنگھ کا ردعمل منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ہے اور آندھراپردیش کی اسمبلی نے اتفاق رائے سے تجویز مذمت منظور کرکے پوری قوم کو راہ دکھائی ہے، بہت سے دوسرے غیر مسلم ممالک نے بھی مذہبی دل آزاری کے اس واقعہ کی مذمت کی ہے، اس لئے ہمیں تمام غیر مسلم اقوام وممالک کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلام نے سفارتی آداب کے بارے

میں بھی رہنمائی کی ہے، آپ ﷺ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کا قاصد آیا، مسیلمہ نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ مجھے بھی آپ کے ساتھ نبوت میں شریک کردیا گیا ہے، آپ ﷺ نے اس بدبخت کے سفیر سے پوچھا کہ کیا تمہارا ابھی اس پر ایمان ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہارے قتل کا حکم دیتا'' چنانچہ کافی عرصہ کے بعد جب یہ شخص غیر سفارتی حیثیت میں پکڑا گیا تو اسے قتل کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ سفارت خانوں پر حملہ مناسب عمل نہیں ہے اور اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے، اس لئے بے قصور غیر مسلم بھائیوں کو نشانہ بنانے سے بچنا چاہئے اور جذبات میں آکر شریعت کی قائم کردہ حدود کو توڑنا نہیں چاہئے۔

۱۷-۲۵/فروری ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ارتداد کی سزا

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جس طرح اس کی جسمانی غذا کا انتظام کیا ہے، اسی طرح اس کی روح کے لئے بھی غذا فراہم کی ہے، اور یہ غذا ہے ہدایتِ ربانی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی کتابیں زمین میں اُتاری گئیں، ان سب کا مقصد انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی ہے، چنانچہ قرآن مجید نے اپنا تعارف ان ہی الفاظ میں کرایا ہے کہ یہ کتاب ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے اور متلاشیانِ حق کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے، **ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین**، (بقرہ:۲) پھر ان کتابوں کی تشریح وتوضیح کے لئے اللہ کی طرف سے انبیاء و رسل بھی آئے، جن کا وجود سراپا ہدایت اور جن کی زندگی صبح سے شام تک منشاء ربانی کی ترجمان ہوا کرتی تھی۔

خدائے قادر مطلق کے لئے یہ بات عین ممکن تھی کہ جیسے ہر انسان کو بھوک لگتی ہے اور غذا کھائے بغیر اسے سکون نہیں ہوتا، اسی طرح ہر انسان کے اندر ہدایت کی طلب اور اس کی پیاس پیدا کردی جاتی اور ہدایت ربانی کو قبول کئے بغیر اسے چین نہیں آتا، اس طرح پوری دنیا مسلمان ہوجاتی اور کفر کا نام ونشان بھی نہیں رہتا، لیکن ایسا نہیں ہوا، اس لئے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور اسی امتحان کی بنیاد پر آخرت کا نظام قائم ہوگا، اچھے لوگ جنت میں جائیں گے اور اللہ سے بغاوت کرنے والوں کی جگہ دوزخ ہوگی، اسی امتحان کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو لوہے اور پتھر کی طرح مجبور محض اور بے اختیار نہیں بنایا، بلکہ اسے اپنے اختیار سے خیر و شر کو قبول کرنے کی طاقت دی، البتہ ہدایت اور گمراہی کو اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ اس طرح واضح فرمادیا کہ جس شخص کے اندر تھوڑا بھی تلاشِ حق کا جذبہ ہوگا، وہ بسہولت حق کی روشنی کو پالے گا اور گمراہی کی تاریکیوں سے اپنے آپ کو بچالے گا، **لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی**۔(البقرہ:۲۵۶)

اسی لئے اسلام نے کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا ، بعض معاندین کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ، حالاں کہ جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو اس کے پاس اخلاق ، دیانت و امانت اور سچائی کی تلوار کے سوا کوئی تلوار نہیں تھی اور اس کے مقابلہ میں سینکڑوں تلواریں بے نیام تھیں اور چاہتی تھیں کہ اس چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر کے رکھ دیں ، خود ہمارے ملک ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج تقریباً ایک ہزار سال تک درخشاں رہا ، لیکن آج بھی مسلمان اقلیت میں ہیں ، اگر انھوں نے جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو کیا مسلمان اس ملک میں اقلیت میں ہوتے ؟ پھر اسلام کی دعوت کا جو کچھ کام ہوا اس میں بھی حکمرانوں کی کوشش برائے نام ہی رہی ہے ، اصل محنت اس ملک کے برگزیدہ اور بلند کردار مشائخ اور صوفیاء کی رہی ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ کی کوششوں سے وسطی ہندوستان کے علاقہ میں اسلام کی روشنی پھیلی ، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور حضرت مولانا سید کرامت علی جونپوریؒ کی کاوشوں سے غیر منقسم ہندوستان کے مشرقی علاقہ میں ایمان کی بہار آئی ، حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے ہندوستان کے مغربی علاقوں میں ہدایت کا چراغ روشن کیا اور پورا کشمیر ایک صوفی بزرگ شیخ علی ہمدانی کی محنت سے دامنِ اسلام میں آیا ، یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس اللہ پر یقین اور بلند اخلاق کے سوا کوئی ظاہری مادی سہارا نہیں تھا اور جو محض محبت کی تلوار سے لوگوں کے قلوب کو فتح کرتے تھے ۔

لیکن جو شخص ایک دفعہ غور و فکر کر کے اور حق و باطل کو سمجھ کر مسلمان ہو جائے ، اس کے لئے کفر و گمراہی کی طرف لوٹنا اسلام کے لئے نا قابل قبول ہے ، اس وقت افغانستان میں عبدالرحمٰن نامی ایک شخص کے مرتد ہونے اور اس پر سزائے ارتداد ''قتل'' کے جاری ہونے کے امکان کے پس منظر میں پوری مغربی دنیا بے چین ہوگئی ہے اور اسے جمہوریت اور حقوق انسانی کے مغائر قرار دیا جا رہا ہے ، عجیب بات ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہو ، فلسطینیوں کو بے گھر کیا جائے ، افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کے مقتل سجائے جائیں ، پیغمبر اسلام

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرکے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے جائیں، تو مغرب کا ضمیر بیدار نہیں ہوتا اور اسے انسانی حقوق اور انسانی جذبات کی کوئی فکر نہیں ہوتی، لیکن ایک شخص اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے تو پوری صلیبی دنیا چیخ پڑتی ہے۔

ارتداد کی سزا کے سلسلے میں اسلام پر جبر وتشدد کا جو طعنہ دیا جارہا ہے اور شریعت اسلامی کے خلاف پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں، اس سلسلہ میں چند باتیں سوچنے کی ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ارتداد کی یہ سزا اس ملک میں ہے، جہاں اسلامی حکومت ہو، جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہوں اور جمہوری نظام کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوں، وہاں ارتداد کی سزا جاری نہیں ہوگی، البتہ مسلمانوں پر یہ بات لازم ہوگی کہ وہ ایسے شخص کو سمجھائیں اور مطمئن کرنے کی کوشش کریں اور اگر وہ مطمئن نہیں ہوں، تو ان کا سماجی بائیکاٹ کریں، کیوں کہ جو شخص خدا کا باغی ہو، اس سے کوئی مسلمان محبت کا تعلق نہیں رکھ سکتا، یہ کچھ ارتداد ہی پر موقوف نہیں؛ بلکہ تمام ہی شرعی سزائیں (حدود) اسلامی حکومت ہی میں نافذ کی جائیں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں بھی ہر شخص اپنے طور پر مرتد کو قتل نہیں کرسکتا، بلکہ قانونی طور پر عدالت واقعہ کی پوری تحقیق کرے گی، صفائی کا موقع دے گی اور جرم ثابت ہوجانے پر سزا جاری کرے گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مرتد کو پہلے سمجھانے اور مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی، نیز غور وفکر کی مہلت دی جائے گی، اگر وہ اس درمیان تائب ہوجائے، تو اس کی توبہ قابل قبول ہوگی اور اس پر کسی طرح کی دست درازی اور زیادتی کی گنجائش نہیں ہوگی، اگر اس کوشش اور مہلت کے باوجود وہ تائب نہ ہوا اور وہ شخص عاقل وبالغ مرد ہو، تو اس پر سزائے قتل جاری کی جائے گی اور عورت ہو تو جب تک توبہ نہ کرے اسے قید میں رکھا جائے گا۔

مرتد کی سزا کے سلسلہ میں دو سمتوں سے اعتراض کیا جاتا ہے، ایک تو اسلام کے کھلے

دشمنوں کی طرف سے، وہ کہتے ہیں کہ مرتد کو قتل کرنا اس کی مذہبی آزادی کے مغائر ہے، دوسرا اعتراض خود نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ہے، جو مغرب کی ہر بات پر لبیک کہنے اور اسلام میں بہ تکلف اس کو ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ارتداد کی سزا ''قتل'' اسلام میں ہے ہی نہیں، اگر کسی مرتد کو قتل بھی کیا گیا ہے تو وہ بطور تعزیر کے تھا، نہ کہ بطور مستقل سزائے شرعی کے، اس وقت ان ہی دونوں نکات پر گفتگو کرنی ہے۔

جہاں تک قرآن وحدیث سے سزائے ارتداد کے ثبوت کی بات ہے، تو اس مسئلہ میں احادیث اور صحابہ کا تعامل اس کثرت سے موجود ہے کہ کسی صاحبِ علم کے لئے انکار کی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ نے ایمان قبول کرنے کے بعد پھر اس سے پھر جانے والوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان سے قتال کرو، **وإن نكثوا أيمانهم من بعد عهدهم وطعنوا في دينكم فقاتلوا أئمة الكفر**، (توبہ :۱۲) اسی طرح قرآن مجید نے اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کی سزا قتل قرار دی ہے، (المائدہ:۳۳) اور مفسرین کے نزدیک اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو اسلام قبول کرنے کے بعد ارتداد کا راستہ اختیار کرلیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان شخص کا خون تین ہی صورتوں میں حلال ہے : ایک یہ کہ اس نے کسی کا قتل کیا ہو، دوسرے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کا مرتکب ہو، تیسرے اسلام سے پھر جائے، **المفارق لدينه**، (بخاری : کتاب الدیات) اسی مضمون کی روایت نسائی میں حضرت عائشہؓ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، (نسائی : باب ذکر مایحل به دم المسلم)، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یمن تشریف لائے تو ایک شخص آیا، جو یہودی تھا، مسلمان ہوا، پھر مرتد ہوگیا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تین بار کہا کہ جب تک اس پر اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ جاری نہ ہو اور اسے قتل نہیں کر دیا جائے، میں بیٹھ نہیں سکتا، چنانچہ اسے قتل کیا گیا پھر آپ رضی اللہ عنہ بیٹھے، (ابوداؤد : باب الحکم فی من ارتد) چنانچہ اس سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے گیارہ حدیثیں اور خلفاء راشدین کے

چودہ فیصلوں کو جمع فرمایا ہے، اور لکھا ہے کہ تقریباً تیس حدیثیں اس سلسلہ میں سرسری نظر میں مل گئیں، (دیکھئے: رسالہ ''مرتد کی سزا اسلام میں''، جواهر الفقه :۱۵۱/۲-۱۶۵) اسی طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا رسالہ ''مرتد کی سزا'' بھی اس موضوع پر لائق مطالعہ ہے، جس میں آٹھ حدیثیں اور خلافت راشدہ کی دس نظیریں جمع کی گئی ہیں، اس پر ائمہ اربعہ اور دوسرے فقہاء کا بھی اتفاق ہے، اس لئے ارتداد کی سزا قرآن وحدیث اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

جہاں تک اہل مغرب کے اعتراض کی بات ہے، تو اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں، اول یہ کہ حق اور باطل کو ایک ہی ترازو میں نہیں تولا جاسکتا، اسلام دین حق ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، یہ ایسی حقیقت ہے جو نہ صرف علمی وعقلی دلیلوں سے ثابت ہے اور اس پر مستند ترین تاریخی شہادت موجود ہے، بلکہ دنیا کی بیشتر مذہبی کتابیں بھی اسلام کی حقانیت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر گواہ ہیں ، اس لئے دین حق کو قبول کر کے پھر اس سے منہ موڑنا دوسرے مذاہب سے منہ موڑنے کی طرح نہیں ہے، مساوات کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ظالم اور مظلوم، سچ اور جھوٹ اور روشنی اور تاریکی کو ایک ہی درجہ حاصل ہو جائے، اس لئے دوسرے مذاہب کو اسلام پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

دوسرے اسلامی مملکت میں اسلام کی حیثیت صرف عقیدہ کی نہیں ہوتی، بلکہ ایک نظام سلطنت کی ہوتی ہے، جہاں اسلام کا اجتماعی، سیاسی نظام ہی نافذ ہوتا ہے، وہاں ایک مسلمان کو اسلام کے متبع اور پیروکار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوتی ہے اور حقوق دیئے جاتے ہیں، لہٰذا وہاں کسی مسلمان کا مرتد ہونا دراصل سلطنت اسلامی سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے اور باغی کی سزا تقریباً تمام ہی ملکوں میں موت ہے، اس لئے اگر شریعت اسلامی، اسلامی مملکت میں بسنے والے مسلمان کے ارتداد کو موجب قتل قرار دیتی ہے تو اسے قابل اعتراض نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اس ملک کی شہریت قبول کر کے اس نے خود اس قانون کی وفاداری کا عہد کیا ہے اور

اسی عہد کے مطابق اس پر یہ سزا جاری کی جائے گی، کلیسا کے زمانۂ اقتدار میں عیسائی دنیا میں نہ صرف عیسائیت سے ارتداد اختیار کرنے والوں کو زندہ جلائے جانے کی سزا دی جاتی تھی ، بلکہ جو لوگ کلیسا کی مذہبی تشریحات سے اختلاف کرتے تھے انھیں بھی اس دردناک سزا کا سامنا کرنا پڑتا تھا، —— اس لئے اگر حقیقت پسندی اور انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ارتداد کی یہ سزا عین مطابق انصاف ہے۔!

۳۱/ مارچ ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

شرعی سزائیں اور خواتین

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جس صفت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے وہ ہے باری تعالیٰ کا ''رب'' ہونا، یعنی خدا صرف کائنات کا خالق اور موجد ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ''پالنہار'' بھی ہے، وہ دنیا اور اس میں پائی جانے والی تمام چیزوں کی مسلسل دیکھ ریکھ اور نگہداشت کر رہا ہے، اس دیکھ ریکھ میں سورج اور چاند سے لے کر انسان وحیوان اور کیڑے مکوڑوں تک سب شامل ہیں، اس لئے وہ ہر مخلوق کی خصوصیات، اس کی صلاحیتوں، اس کی ضرورتوں اور اس سے متعلق نفع و نقصان کی جہتوں سے بخوبی واقف ہے، کیوں کہ اسی نے کائنات کی ہر شئے کو اس کی خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اسی بنا پر اس نے کائنات کے لئے احکام بھی دیئے ہیں اور قوانین بھی متعین فرمائے ہیں، ان قوانین سے نہ صرف آخرت کی بھلائی متعلق ہے بلکہ دنیا کی فلاح ونجات بھی اسی میں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہ احکام ان مخلوقوں کے لئے نہیں ہیں، جو مکلّف نہیں ہیں، یعنی فطری طور پر وہ اسی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں، ہوائیں مجبور ہیں کہ وہ چلتی رہیں، سمندر کا پانی حکم خداوندی کے مطابق مسلسل رواں دواں ہے، سورج و چاند اور زمین اور بہت سے سیارے بلا وقفہ ایک دوسرے کے ساتھ گردش کرنے اور چکر لگانے میں مصروف ہیں، حیوانات کو گو یک گونہ اختیار اور شعور سے نوازا گیا ہے، لیکن وہ خدا کی پیدا کی ہوئی قدرت کے مطابق ہی عمل کرنے کے پابند ہیں، شیر کتنا بھی بھوکا ہو گھاس نہیں کھاتا اور ہاتھی اپنی غیر معمولی جسامت اور قوت کے باوجود گوشت کو منہ نہیں لگاتا، افزائش نسل کا جو نظام قدرت نے ان کے لئے متعین کر دیا ہے، وہ اسی کے دائرے میں رہتے ہیں، وہ فطرت سے بغاوت نہیں کرتے، مثلاً جنسی اختلاط کا فطری راستہ نر و مادہ کا اختلاط ہے، فطرت سے بغاوت کرنے والے انسانوں کی طرح

جانوروں میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ انھوں نے فطرت کے اس نظام کو توڑا ہو۔

انسان اور جنات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کا تشریعی طور پر پابند بنایا ہے ، یعنی چوں کہ ان کا امتحان لینا مقصود ہے اس لئے ان کو نیکی اور بدی کی قدرت دی گئی ، وہ خدا کے حکم پر عمل بھی کر سکتے ہیں اور اس کے حکم کو توڑ بھی سکتے ہیں ، لیکن خدا کے احکام پر عمل کرنے میں ان کی دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے اور احکام خداوندی کی خلاف ورزی میں دنیا اور آخرت دونوں کا نقصان وخسران ہے ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کچھ باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ کاموں کے کرنے سے منع فرمایا ہے ، جس بات کے کرنے کا حکم ہے ان کو نہیں کرنا اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان کا مرتکب ہونا معصیت اور نافرمانی اور یہی اسلامی قانون کی اصطلاح میں جرم ہے ، یعنی کسی فعل کے جرم ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے خدا ناراض ہوتا ہے ، خواہ اس کو دو آدمیوں نے مل کر رضامندی سے کیا ہو یا جبر کے ساتھ ، لیکن مغرب نے چوں کہ انسانی زندگی سے خدا کے تصور کو نکال دیا ہے ، اس لئے ان کے یہاں کسی بات کے جرم ہونے اور نہ ہونے میں خدا کی خوشنودی اور ناراضگی کا کوئی دخل نہیں ہے ، جس فعل کا تعلق دو آدمیوں سے ہو اور دونوں اس سے راضی ہوں تو خواہ مذہب اور اخلاق کے ترازو میں اسے کتنا ہی برا سمجھا جاتا ہو ، وہ کوئی جرم نہیں ہے اور جس عمل میں دوسرے فریق کو مجبور کیا گیا ہو اور اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو وہ جرم ہے۔

جرم کے اس پیمانے نے نہ صرف خدا کے تصور کو نکال دیا ہے ، بلکہ انسان کے نفع وضرر اور اس کی مصلحت ومضرت کے پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا ہے ، تمام میڈیکل ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ نشہ انسانی صحت کے لئے نہایت نقصاندہ ہے ، لیکن چوں کہ انسانوں کی اکثریت نشہ کو پینا چاہتی ہے ، اس لئے انسانی قانون نے اسے جواز عطا کر دیا ہے ، ماہرین معاشیات اس بات پر متفق ہیں کہ سود تقسیم دولت کے بجائے ارتکاز دولت کا سبب ہے اور دولت کا کچھ ہاتھوں میں مرتکز ہو جانا سماج کے لئے نقصان دہ ہے ، لیکن چوں کہ سود کے لینے اور دینے میں باہمی رضامندی پائی جاتی ہے اور اکثر لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے اس لئے قانون نے اسے

سند جواز دے دیا ہے، اس بات پر بھی لوگوں کا اتفاق ہے کہ ''جوا'' کسبِ زر کا ایک غیر فطری طریقہ ہے، اس سے سماج میں بے عملی پیدا ہوتی ہے اور بغض وعناد بڑھتا ہے اور ہزاروں لوگوں کے پاس سے دولت چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے، لیکن چوں کہ ایک بہت بڑا طبقہ جوا بازی پر کمر بستہ ہے اس لئے قانون نے جوے کی بہت سی صورتوں کو تحفظ عطا کر دیا، ماہرین طب اس بات پر متفق ہیں کہ زنا انسانی صحت کے لئے انتہائی نقصاندہ ہے اور خلافِ فطرت فعل مہلک بیماریوں کی جڑ ہے، لیکن مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی شہوت پرستی، ہوس انگیزی اور لذتیت نے آج اس کو بھی جائز ٹھہرا دیا ہے، لیکن اسلام محض لوگوں کی خواہشات کی بنا پر ایسی چیزوں کی اجازت نہیں دے سکتا جو انسانیت کے لئے مہلک اور جسمانی و اخلاقی مضرت کا باعث ہوں۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی گناہ ہے اور مسلمانوں کے لئے اس سے بچنا واجب ہے، لیکن کچھ بڑے بڑے گناہ جو انسانی سماج کے لئے صحت و اخلاق کی حفاظت کے پہلو سے نہایت اہم ہیں، کی خلاف ورزی پر شریعت نے سخت سزائیں متعین کی ہیں، ان کو ''حدود و قصاص'' کہا جاتا ہے، یہ جرائم ہیں: زنا، چوری، شراب نوشی، تہمت تراشی، قتل اور ڈاکہ زنی، غور کیجئے کہ یہ تمام جرائم وہ ہیں جن کا نقصان صرف مجرم کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس لئے ان سخت گیر قوانین کا فائدہ نہ صرف اس شخص کو پہنچتا ہے جو کسی جرم کا شکار ہوا ہو، بلکہ اس کا فائدہ پورے سماج کی طرف لوٹتا ہے، اسی لئے ان قوانین کی خصوصی اہمیت ہے۔

پڑوسی ملک پاکستان اسی نعرہ کے ساتھ وجود میں آیا تھا کہ یہاں پوری شریعتِ اسلامی نافذ کی جائے گی، ظاہر ہے قانونِ شریعت کا ایک بنیادی حصہ ان حدود کا نفاذ بھی ہے، بدقسمتی سے جن لوگوں نے پاکستان میں اقتدار حاصل کیا، وہ شروع ہی سے اسلام کے بارے میں مخلص نہیں تھے اور بدترین قسم کے فکری اور عملی نفاق میں مبتلا تھے، اس لئے انھوں نے کبھی بھی خلوص اور دل کی آمادگی کے ساتھ اسلامی قانون کو نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی اور عملاً جمہوریت

کے مفقود ہونے کی وجہ سے کبھی اس ملک میں رائے عامہ کو کوئی وقعت نہیں دی گئی، بہرحال بڑی کوششوں اور تگ و دو کے بعد ۱۹۷۹ء میں یہاں حدود سے متعلق پانچ آرڈیننس جاری کئے گئے، جن میں ایک زنا آرڈیننس تھا، اس آرڈیننس کے ذریعہ کتاب وسنت سے ثابت ہونے والی حدزنا کو قانونی حیثیت دی گئی ہے اوراس کے لئے شریعت نے شبہات کا جو قانون مقرر کیا ہے اسی کو برقرار رکھا گیا، شریعت نے شہادت کا جو قانون مقرر کیا ہے اسی کو برقرار رکھا گیا ہے، حالاں کہ پاکستان میں بے حیائی اور فحاشی کو روکنے کے لئے جو ماحول مطلوب ہے وہ فراہم نہیں کیا گیا، اس کے باوجود اس قانون کے مثبت اثرات مرتب ہوئے، مثلاً ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء ہندوستان میں زنا میں اضافہ کی شرح ۴۰ء۴ فیصد ہے، جب کہ پاکستان میں اضافہ ۸ء۴ فیصد ریکارڈ کیا گیا ہے اور اگر اس کے ساتھ اس بات کو بھی ملالیں کہ ہندوستان میں باہمی رضامندی کے ساتھ جنسی تعلق کو زنا نہیں کہا جاتا، جب کہ پاکستان میں جبر کے ساتھ ہو یا طرفین کی رضامندی سے دونوں پر زنا کا اطلاق ہوتا ہے، اس تفصیل کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجئے کہ اس قانون کی بدولت ہندو پاک کے درمیان اس جرم کے تناسب میں کتنا فرق پایا جاتا ہے، تو یہ فرق اور بڑھ جاتا ہے۔

جناب پرویز مشرف جو پاکستان کے خودساختہ صدر ہیں اور جنھوں نے امریکہ ویورپ کی خوشنودی کی قربان گاہ پر اسلام کو بھینٹ چڑھانے کا ذمہ لے رکھا ہے، اپنے مغربی آقاؤ کی تعمیل حکم میں حدود وقوانین میں ترمیم کے لئے کوشاں ہیں اوراسے تحفظ خواتین ۲۰۰۶ء کا نام دیا جارہا ہے، گویا اسلام نے خواتین کو تحفظ سے محروم کردیا تھا، اس لئے قانون کے ذریعہ خواتین کو تحفظ حاصل ہوگا۔

اس مجوزہ ترمیم کی رو سے زنا بالجبر کی سزا موت اور عمر قید ہوگی اوراس کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی شرط ضروری نہ ہوگی، نیز باہمی رضامندی سے اگر زنا کا ارتکاب ہوا ہو تب چار گواہ ضروری ہوں گے، لیکن ان گواہوں کا مرد ہونا ضروری نہیں ہوگا، خواتین کی گواہی بھی کافی ہوگی، نیز مالی معاملات میں بھی ایک مرد اور دو عورتوں کے بجائے ایک مرد اور ایک عورت

کی گواہی کو کافی سمجھا جائے گا، اسی طرح تہمت یعنی قذف سے متعلق قوانین میں صرف عورت ہی مرد کے خلاف تہمت لگانے کا حق رکھتی ہے، مرد عورت کے خلاف دعویٰ نہیں کرسکتا، ظاہر ہے کہ یہ باتیں صراحتاً احکام شریعت کے خلاف ہیں اوران کو تحفظ خواتین کا نام دینا شریعت اسلامی کو بدنام کرنے اوردین حق سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قانونِ حدود میں ہی خواتین کا تحفظ ہے، عام طور پر مردوں کی جانب سے عورتوں پر زیادتی ہوتی ہے، یہ قانون اس کا سدِ باب کرتا ہے، مولانا محمد تقی عثمانی، جنھوں نے سترہ اٹھارہ برس حدود سے متعلق مقدمات کی سماعت کی ہے، ان کا بیان ہے کہ کم از کم نوے فیصد مقدمات میں مردوں کو سزا دی گئی ہے، ایک سروے کے مطابق ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۴ء پانچ سال میں پاکستان میں زنا بالرضا کے کیس میں ۱۴۵ مردوں اور ۱۴۴ عورتوں کو سزا سنائی گئی، شرعی وفاقی عدالت نے ان میں سے ۷۱ مردوں اور ۳۰ خواتین کی سزا کو بحال رکھا اور دو عورتوں کو سزا سنائی اور وفاقی شرعی عدالت نے ۵۹ مردوں کی سزا بحال رکھی اور دو عورتوں کو بھی بری کردیا، اس سے ظاہر ہے کہ ان قوانین سے دراصل خواتین کو تحفظ حاصل ہوا ہے، پھر بھی قانونِ حدود کے مخالفِ خواتین ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں اخلاق و کردار، شرم و حیا، مذہب اور شرافت بے معنی الفاظ ہوگئے ہیں اور خواہشات وشہوات کی تکمیل اور ہوس کو پوری کر گزرنا زندگی کا مقصود سمجھ لیا گیا، یہ شہوت پرستی ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے اور اس نے انسان کو ایسا اندھا بنا دیا ہے کہ زہر اور تریاق کا فرق بھی ختم ہوگیا ہے اور دو گھڑی کی لذت —— گو جان لیوا ہی کیوں نہ ہو —— انسان کو بدمست بنا کر رکھ دیتی ہے، مغربی معاشرہ کا حال یہ ہے کہ وہاں زنا کی ایسی کثرت ہے کہ ناجائز ولادتوں کا ایک طوفان سا آیا ہوا ہے، ۱۹۹۶ء کے سروے کے مطابق سویڈن میں ۵۵ فیصد، فرانس میں ۳۸ فیصد، امریکہ میں ۳۲ فیصد اور ناروے میں ۴۸ فیصد ولادتیں ناجائز تعلقات کا نتیجہ ہوتی ہیں، پھر قدرت سے اس بغاوت کے نتیجہ میں انسانی سماج جن تکلیف دہ اور الم ناک بیماریوں سے دوچار ہورہا ہے وہ بجائے خود انسانیت کے لئے قدرت کی بہت بڑی تنبیہ ہیں،

۱۹۹۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایچ آئی وی کے علاوہ دوسرے جنسی امراض کے شکار مریضوں کی تعداد ۳۳ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی اور ایڈز تو ایسی بیماری بن کر اُبھری ہے کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اس کا آغاز تو امریکہ و یورپ سے ہوا، لیکن اب افریقہ اور ایشیاء اس کے نرغہ میں ہیں، یہ رب کائنات کے دیئے ہوئے حکم سے بغاوت اور اس کی بنائی ہوئی فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

مغربی ممالک چاہتے ہیں کہ گناہ کی جس آگ میں وہ جل رہے ہیں اور اخلاق و شرافت کے جس لباس کو انھوں نے تار تار کر دیا ہے، پوری دنیا اسی راہ پر چلے اور لغت سے شرم و حیا کا نام مٹ جائے، ایشیائی اور مشرقی ملکوں کو مغربی تہذیب اور اس کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے اور علامہ اقبالؒ کی زبانِ حق ترجمان میں سمجھ لینا چاہئے کہ ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی ، مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے !

۸/ستمبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

پوپ کا غیر دانشمندانہ بیان

چند ہفتے پہلے عیسائیوں کے عالمی مذہبی رہنما پوپ بینڈ یکٹ نے جو نزاعی خطاب کیا، اس نے اُمتِ مسلمہ کو بجا طور پر بے قرار کر دیا، پوپ نے متعدد ایسی باتیں کہیں جو تاریخی حقائق کے خلاف ہیں، اگر ان کی یہ بات لاعلمی پر مبنی ہے تو کسی مذہب کے اتنے بڑے عالم کا دوسرے مذاہب سے اس قدر ناواقف ہونا اور پھر اس ناواقفیت کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا افسوس ناک بات ہے اور اگر پوپ نے جانتے بوجھتے غلط بیانی سے کام لیا ہے، تو یہ اور بھی زیادہ قابل افسوس اور شرم ناک ہے، لوگ مذہبی شخصیتوں سے سچائی کی توقع رکھتے ہیں، اگر وہ بھی دروغ گوئی اور کذب بیانی پر اتر آئیں تو آخر انسان کن پر اعتماد کرے؟

مغرب اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے میں قصداً خیانت سے کام لیتا ہے اور اسلام کے بارے میں ہر تقریر و تحریر کھلے طور پر یا در پردہ بغض و عناد کا مظہر ہوتی ہے، جس نے عیسائی دنیا کے رگ و ریشہ میں اسلام کے تئیں نفرت کا زہر گھول دیا ہے اور نفرت کی آگ میں وہ خود اپنے آپ کو جھلسا رہے ہیں، پوپ صاحب کا بیان بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

ان کے بیان میں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے اور جہاد تشدد ہی کا دوسرا نام ہے، دوسرے یہ کہ اسلام تلوار اور طاقت کے زور سے پھیلا ہے، جہاں تک جہاد کی بات ہے، تو جہاد تشدد نہیں، بلکہ ظالموں کو ظلم سے روکنے کی کوشش ہے، قرآن صاف کہتا ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کی اجازت اس لئے دی گئی کہ ان پر ظلم کیا جا رہا تھا: **أذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا** (حج:۲۹)، اسی لئے جو لوگ مسلمانوں سے آمادۂ جنگ تھے، ان سے جہاد کرنے کی تلقین کی گئی اور پھر بھی فرمایا گیا کہ اس جوابی اقدام میں بھی زیادتی نہ ہونے پائے: **وقاتلوا فی سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين** (البقرہ:۱۹)، جو غیر مسلم

مسلمانوں کو ان کی بنیادی حقوق سے محروم نہیں کریں اور ان کی مذہبی آزادی کے درپے نہ ہوں، ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لا ینھاکم اللہ عن الذین یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرؤھم وتقسطوا إلیھم إن اللہ یحب المقسطین . (الممتحنہ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کرتے ہوں اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالتے ہوں ، اللہ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تشدد ظلم و جور کا نام ہے، نہ کہ ظلم کے خلاف مدافعت کا، یہ تو اسلام کا تصورِ جہاد ہے، جس میں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں، لیکن پوپ صاحب خود بائبل کو دیکھیں کہ بائبل میں جہاد کا ذکر ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کس شدت کے ساتھ؟ کتاب استثناء کے باب: ۳۰ میں تفصیل سے جہاد کے احکام ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی شہر کے لوگ اپنا دروازہ کھول دیں، تو وہ سب باج گزار بن کر تیری خدمت کریں اور اگر کوئی گروہ بنی اسرائیل سے لڑنا چاہے اور وہ ان شہروں کے ہوں، جن کو خدا نے بطورِ میراث بنی اسرائیل کو نہیں دیا ہے، تو قبضہ حاصل ہونے کے بعد تمام مردوں کو تلوار سے قتل کر دیا جائے، عورتیں، بال بچے، چوپائے اور مال واسباب کو تصرف میں لایا جائے اور جن شہروں کو خدا نے بطورِ میراث کے دے دیا ہے، اس میں تو کسی بھی جاندار کو زندہ نہ چھوڑا جائے بلکہ بالکل نیست و نابود کر دیا جائے (دیکھئے: کتاب استثناء:۳۰:۱۰-۱۷)، غور کیجئے! بائبل کے اس حکم کے مطابق عورتوں، بچوں، یہاں تک کہ چوپایوں کو بھی تہ تیغ کر دینے کا حکم ہے!

ایک خاص موقع پر بنی اسرائیل کو جنگ کے بارے میں ہدایت کرتے ہوئے کہا جاتا ہے :

بنی اسرائیل سے یہ کہہ دے کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملکِ کنعان میں داخل ہو، تو اس ملک کے سب باشندوں کو ہلاک کر دینا اور ان کے شبیہ دار پتھروں کو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے سب اونچے مکانوں کو مسمار کر دینا۔ (گنتی:۳۳:۵۱)

اس میں نہ صرف ملک کے باشندوں کو قتل کر دینے کا حکم ہے بلکہ ان کی عبادت گاہوں کو بھی مسمار کر دینے کی ہدایت ہے، اسی طرح بائبل میں مختلف بادشاہوں اور خاص کر حضرت داؤد علیہ السلام کے جہاد کے متعدد واقعات مذکور ہیں، جیسے مصر میں آباد قوموں سے جہاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

اور داؤد (علیہ السلام) نے اس سرزمین کو تباہ کر ڈالا اور عورت مرد کسی کو جیتا نہ چھوڑا اور ان کی بھیڑ، بکریاں اور بیل اور گدھے اور اونٹ اور کپڑے لے کر لوٹا۔ (سموئیل:۲۷:۸،۹)

اسی طرح ایک اور موقعہ پر آرامیوں سے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے جہاد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے :

اور داؤد (علیہ السلام) نے آرامیوں کے سات سو رتھوں کے آدمی اور چالیس ہزار سوار قتل کر ڈالے اور ان کی فوج کے سردار کو ایسا مارا کہ وہیں مر گیا۔ (سموئیل ثانی:۱۰:۱۸)

ان ہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ عیسائی دنیا نے مسلمانوں پر کروسیڈ کے نام صلیبی جنگیں مسلط کیں اور سات جنگیں مسلمانوں سے لڑی گئیں، جو بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی فتح پر پایۂ انجام کو پہنچیں، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی تعلیم صرف قرآن ہی نے نہیں دی ہے بلکہ دوسرے مذاہب، خاص کر عیسائیت میں بھی جہاد کا تصور موجود ہے۔

یہ بات کہ اسلام تلوار اور طاقت کے زور سے پھیلا ہے، دن کو رات کہنے کے مترادف ہے، جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تو اس وقت آپ ﷺ تنہا

مسلمان تھے، جو پوری انسانیت کو سچائی کی طرف بلا رہے تھے، مکہ میں تیرہ سال اس طرح گزرے کہ مسلمان اعلانیہ نماز بھی ادا نہیں کر سکتے تھے اور اہل ایمان پر ظلم و جور کے ایسے پہاڑ توڑے جا رہے تھے جن کو سن کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، ان مظلوم مسلمانوں کو کس تلوار نے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا؟ پھر جب اہل مکہ کی اذیت رسانی سے مجبور ہو کر آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت کی اور اہل مدینہ اسلام کی آغوش میں آئے تو سوائے اسلام کی کشش کے اور کونسی چیز تھی، جس نے ان کو دین حق کا علمبردار اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بے دام بنا دیا؟ پھر مدنی زندگی میں بھی اہل مکہ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی بستی پر بار بار یلغار کرتے رہے، یہاں کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا، یہ وقت تھا کہ آپ ﷺ مشرکین مکہ کو ایمان پر مجبور کر سکتے تھے، لیکن نبیٔ رحمت نے اپنے جانی دشمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''میں آج تم سے وہی کہوں گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم آزاد ہو اور تم پر کوئی پکڑ نہیں'' (انتم الطلقاء ولا تثریب علیکم الیوم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں ایک بھی مثال اس کی نہیں ملے گی کہ کسی شخص کو ایمان پر مجبور کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بہت سے قریبی اعزہ کی موت کفر کی حالت میں ہوئی۔

پھر عالم اسلام کے نقشہ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے تو بہت سے خطے وہ ہیں جہاں کبھی فوج نے قدم ہی نہیں رکھا، انڈونیشیا، ملیشیا، مالدیپ اور افریقہ کے بہت سے ممالک وہ ہیں جہاں عرب تاجروں اور علماء کے ذریعہ ایمان کی روشنی پہنچی، بہت سے علاقے وہ ہیں جہاں صوفیاء نے اپنے خیمے ڈالے اور اخلاق کی تلوار سے لوگوں کے قلوب کو فتح کیا، خود ہندوستان میں حضرت خواجہ معین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، مولانا سید کرامت علی جونپوریؒ وغیرہ کے ہاتھوں پر لاکھوں اشخاص مشرف بہ اسلام ہوئے، یہ دلوں کے فاتحین تھے اور محبت کے شمشیر سے دشمنوں کو دوست بنانے کا فن جانتے تھے۔

یہ تو ماضی کی داستانیں ہیں، جن کے لئے تاریخ کے اوراق الٹنے پڑیں گے، لیکن آج کے حالات سے آگاہ ہونے کے لئے ورق گردانی کی ضرورت نہیں، صرف نگاہِ حقیقت پسند

مطلوب ہے، آج امریکہ اور یورپ میں اسلام کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور سر آنکھوں پر بٹھائی جانے والی شخصیتیں دامن اسلام سے وابستہ ہو رہی ہیں، اس کا سبب اسلام کی جاذبیت، عقل وفطرت سے اس کی ہم آہنگی، اس کی سادگی اور فکری واستدلالی قوت کے سوا اور کیا ہے؟ اسلام نے تین میں ایک اور ایک میں تین جیسے نا قابل فہم عقیدۂ تثلیث کی طرف دعوت نہیں دی، نہ اس نے عقیدۂ کفارہ جیسا عقل میں نہ آنے والا جزا وسزا کا تصور دیا کہ گناہ بھی نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور ایک شخص کے گناہ کی سزا دوسرے کو بھگتنی پڑتی ہے۔

ایسے پیچیدہ اور نا قابل فہم تصورات کے بجائے اسلام توحید و رسالت اور آخرت کا واضح اور شفاف عقیدہ پیش کرتا ہے اور پھر قرآن کی اثر انگیزی انسان کی پوری زندگی کو مذہب سے جوڑتی ہے، جس سے دنیا کے دوسرے مذاہب محروم ہیں، یہ وہ خصوصیات ہیں جو مغرب کے مخالفانہ پروپیگنڈوں کے باوجود لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کر رہی ہیں، عجیب بات ہے کہ گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو بدنام کرنے اور اسلام کے خلاف نفرت کی فضا بنانے کی جو عالم گیر کوششیں ہوئی ہیں، انھوں نے جہاں عالم اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اور افغانستان وعراق میں مسلمانوں کے لہو کی ارزانی کا دل دوز منظر دکھایا ہے، وہیں امریکہ اور مغرب میں قبول اسلام کی رفتار کو بھی تیز تر کر دیا ہے اور اب بہت سے مغربی ممالک میں اسلام دوسرے بڑے مذہب کی حیثیت سے ابھر رہا ہے، غور کیجئے کہ یہ کس تلوار کا کرشمہ ہے؟

اب کچھ اس مذہبی تشدد کا حال بھی سن لیں، جیسے خود عیسائی کلیسا نے روا رکھا ہے، یہ اتنی خوں چکاں داستان ہے کہ اسے سن کر شاید درندوں کو بھی حیا آئی ہوگی، یہ داستانیں نہ صرف عیسائیوں کے ظلم و بربریت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہیں کہ وہ یہودیوں کو عیسائی بننے پر مجبور کرتے تھے، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے ایک عیسائی پادری کی تالیف ''کشف الآثار'' سے نقل کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :

> شہر الطیوخ کے یہودی جب شکست خوردہ اور مغلوب ہو کر گرفتار ہوئے تو بعض کے اعضا کو کاٹا اور بعض کو قتل کیا اور باقی ماندہ تمام

افراد کو جلاوطن کیا، پھر شہنشاہ نے اپنی تمام مملکت میں قسم قسم کے ظلم
کئے، آخر کار پھر ان کو اپنی حدودِ سلطنت سے باہر کر دیا گیا، بلکہ
دوسرے ملکوں کے سلاطین کو بھی اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بھی
یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے
ایشیاء سے لے یورپ کی آخری حد تک پیٹ بھر کر ظلم کیا، پھر کچھ
عرصہ کے بعد اسپنول کی سلطنت میں ان کو تین شرطوں میں سے کسی
ایک کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، کہ اولاً عیسائی مذہب کو قبول
کریں اور اگر یہ منظور نہ ہو تو قید کئے جائیں اور اگر دونوں باتیں
منظور نہ ہوں تو جلاوطنی قبول کریں، ملک فرانس میں بھی ان کے
ساتھ کچھ اسی قسم کا معاملہ کیا گیا، مسکین لاچار ایک ملک سے
دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں مارے مارے پھرتے
تھے، مگر کہیں ان کو ٹھکانہ نصیب نہ ہوتا تھا اور ایشیائے بزرگ میں ان
کو چین و قرار حاصل نہ تھا، بلکہ اکثر اوقات ان کا قتل عام ہوا،
جیسا کہ فرنچ سلطنتوں میں پیش آیا۔ (بائبل سے قرآن تک: ۳/۴۷۴)

کیتھولک فرقہ نے اپنی ایک مجلس شوریٰ میں یہودیوں کے خلاف پانچ دفعات پر مشتمل فیصلے کئے، ان میں دفعہ نمبر: ۵ اس طرح ہے :

ان کے بچوں کو ان سے چھین کر مذہب عیسوی کی تربیت دی جائے۔
(بائبل سے قرآن تک: ۳/۴۷۶)

فرانس میں بار بار یہودیوں کا قتل عام کیا گیا، ان میں ایک قتل عام کر ذکر کرتے ہوئے مصنف کا بیان ہے :

ملکِ غسا میں بہت سے یہودیوں کا قتل عام ہوا، بہت سے لوٹے
گئے اور بہت کم ان میں سے بچ سکے، وہ بھی صرف وہ تھے، جنھوں

نے عیسائیت قبول کر لی۔(بائبل سے قرآن تک:۳؍۴۷۷)

فلسطین اول کے بعد چھٹے بادشاہ نے اپنے امراء سلطنت کے مشورہ سے ۳۷۹ھ میں یہ حکم جاری کیا کہ ہر وہ شخص جو سلطنت روم میں آباد ہے اس کو عیسائیت اختیار کرنا لازم ہوگا اور جو عیسائیت اختیار نہیں کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔(بائبل سے قرآن تک:۳؍۴۷۹)

عیسائیوں کی یہ زیادتی صرف یہودیوں اور دوسری قوموں کے خلاف ہی نہیں تھی، بلکہ آپسی فرقہ وارانہ اختلاف میں بھی انھوں نے یہی رویہ اختیار کیا، کیتھولک نے پروٹسٹنٹ کے خلاف اور پروٹسٹنٹ نے کیتھولک کے خلاف، چنانچہ رومن کلیسا جو کیتھولک فکر کا ترجمان رہا ہے اس کے بارے میں ایک عیسائی مصنف کا بیان ہے :

رومی کلیسا نے بارہا جبری تبدیلیٔ مذہب اور استیصال کلی کے حربے پروٹسٹنٹوں کے لئے استعمال کئے ہیں، یورپ کے ملکوں میں بکثرت یہ واقعات پیش آئے، خیال کیا جاتا ہے کہ کم از کم تیس ہزار ایسے لوگ جو یسوع پر تو بے شک ایمان لائے تھے مگر پوپ پر ایمان نہ رکھتے تھے اور اپنے ایمان اور اعمال کے لئے صرف کتبِ مقدسہ کو رہنما مانتے تھے، آگ میں جلائے گئے، ان میں سے ہزاروں لوگ اور بڑی بڑی جماعتیں تلواروں، حبوس اور کلبتین کے ذریعہ (یہ ایک اوزار ہے، جس سے بدن کے جوڑ الگ کر کے کھینچ لئے جاتے ہیں) قتل کئے گئے اور قسم قسم کے شدید عذاب ان کو دیئے گئے۔

اسی مصنف نے سپین کے مقام طلیطلہ کی مجلس شوریٰ کا فیصلہ بھی نقل کیا ہے کہ :

ہم یہ قانون مقرر کرتے ہیں کہ جو شخص اس ملک میں رہنا قبول کرتا ہے اس کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ اس وقت تک کرسی پر بیٹھ سکے جب تک اس امر کی قسم نہ کھالے کہ وہ اپنے ملک میں کیتھولک عیسائی

کے سوا اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

۱۷۲۴ء میں بادشاہ لوئیس پازدہم نے جو قوانین مقرر کئے، ان میں سے اٹھارہ کے من جملہ دو دفعات یہ تھیں :

(۱) ہمارے ملک میں صرف کیتھولک مذہب ہی جاری رہ سکتا ہے، جو لوگ اس کے علاوہ کسی اور مذہب کو اختیار کرتے ہیں، ان کو زندگی بھر قید رہنا پڑے گا، عورتوں کے بال کاٹ دیئے جائیں گے اور مرتے دم تک قید رکھی جائیں گی۔

(۲) ان تمام واعظوں کو جنھوں نے کیتھولک عقائد کے خلاف لوگوں کو دوسرے عقائد پر جمع کیا ہے...... یا وہ لوگ جن کو دوسرے عقائد کا علم یا مہارت ہے، کو موت کی سزا دی جائے گی۔

پھر کیتھولک نے پروٹسٹنٹوں پر جو ظلم ڈھائے، وہ انسانیت سوزی کا نہایت افسوسناک واقعہ ہے، جس میں لاکھوں انسان قتل کر دیئے گئے، یہ تو سکہ کا ایک رُخ ہے، دوسری طرف پروٹسٹنٹوں نے کیتھولک کے خلاف جو مظالم روا رکھے ہیں، وہ بھی خون کے آنسو رلانے والے ہیں، چنانچہ پروٹسٹنٹ حکومت نے جو قوانین جاری کئے، ان میں یہ بات شامل تھی کہ کوئی کیتھولک ماں باپ کا ترکہ نہیں پائے گا، اگر پروٹسٹنٹ نہ ہو جائے، تو اٹھارہ سال کی عمر کے بعد وہ کوئی زمین خریدنے کا مجاز نہیں ہوگا، نہ ان کا کوئی مدرسہ ہوگا اور نہ ان کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی، بلکہ اس حکم کی خلاف ورزی پر عمر قید کی سزا دی جائے گی، انھیں سلطنت کا کوئی عہدہ نہیں دیا جائے گا، عدالت میں کسی کیتھولک عقیدہ والے آدمی کی گواہی معتبر نہیں ہوگی، آخر کار پھر یہ حکم جاری ہوا کہ اگر یہ لوگ سب کے سب پروٹسٹنٹ ہونا قبول نہ کریں تو ان کو قید کرکے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا جائے گا، ان کو ہتھیار رکھنے کا حق نہ ہوگا اور نہ قیمتی گھوڑے پر سواری کی اجازت ہوگی۔ (دیکھئے: بائبل سے قرآن تک: ۳: ۴۷۸-۴۹۳)

اسی طرح کیتھولک کو جبراً پروٹسٹنٹ بنانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ملکہ ایلزبیتھ کے حکم سے ان کے بہت سے راہب اور علماء کو کشتی میں

> سوار کر کے سمندر میں ڈبو دیا گیا، اس کا لشکر آئر لینڈ میں اس غرض سے داخل ہوا کہ کیتھولک فرقہ کے لوگوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں جبراً داخل کرلیں، اس فوج نے ان کے تمام گرجے جلا ڈالے، ان کے علماء کو قتل کیا، وہ ان کو اس طرح شکار کیا کرتے تھے، جس طرح جنگل کے وحشی جانوروں کو شکار کیا جاتا ہے، یہ لوگ کسی کو امن نہیں دیتے تھے اور اگر کسی کو امن دے دیتے تو امن دینے کے بعد بھی اس کو قتل کر دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں تشدد عیسائی دنیا کا خاص مزاج رہا ہے، انھوں نے یہودیوں، مسلمانوں اور خود مخالف عیسائی فرقوں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا اور ظلم و بربریت کی ایسی ایسی شکلیں ایجاد کیں، جن سے پہلے کے لوگ شاید واقف بھی نہ تھے، جیسے ایک خاص قسم کے ہتھیار سے جسم کے اعضاء کو الگ الگ کر دینا، زندہ انسان کے ناک، کان وغیرہ کاٹ دینا اور جو لوگ ان کے خیال کے مطابق مرتد ہو گئے ہوں، ان کو زندہ جلانا اور اس جلائے جانے کو کھیل تماشے کی نظر سے دیکھنا، بچوں اور عورتوں تک کا شوقیہ اس کا مشاہدہ کرنا، نیز درندہ جانوروں سے انسان کو لڑانا، اسی لئے امریکہ اور برطانیہ اگر عراق اور افغانستان میں ناقابل تصور ستم ڈھاتے ہیں اور مردم آزاری کے نت نئے نمونے پیش کرتے ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ یہ ان کی آبائی روایت ہے اور یہ اسی عمل کو دہرا رہے ہیں، جو ان کے آباء واجداد اپنے غلبہ کے زمانہ میں کرتے رہے ہیں۔

ایک طرف عیسائیوں کی یہ تاریخ ہے اور دوسری طرف قرآن مجید کا بتایا ہوا واضح اُصول، کہ دین اور مذہب کے معاملے میں کسی جبر اور دباؤ کی گنجائش نہیں، **لااکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی** (البقرۃ:٢٥٦)، جہاں مختلف فکر وعقیدہ کے لوگ بستے ہیں، ان کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ کوئی جبر وتشدد کا راستہ اختیار نہ کیا جائے اور ہر آدمی اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرے، **لکم دینکم ولی دین** (الکافرون:٦)، حضرت عمرؓ کی شہادت ایک ایرانی آتش

پرست کے ہاتھوں ہوئی ہے، اس کے باوجود حضرت عمرؓ کا حال یہ ہے کہ اپنی وفات کے وقت جن باتوں کی خاص طور پر وصیت فرماتے ہیں، ان میں سے ایک غیر مسلم اقلیت کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔

اگر پوپ صاحب خود اپنی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتے اور ذرا بھی حقیقت پسندی سے کام لیتے، تو شاید انھیں یہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی اور اگر اس کے ساتھ ساتھ چرچ کی وہ تاریخ بھی ان کی نظر میں ہوتی، جب پوپ جنت کے ٹکٹ تقسیم کرتے تھے، مرنے والوں کے لئے مغفرت نامے لکھ کر دیئے جاتے تھے اور اس کے بدلہ عوام سے کثیر رقم نہایت بے شرمی کے ساتھ اینٹھ لی جاتی تھی، تو اسلام کی عظمت، اس کی سادگی، انصاف پسندی، شخصی آزادی کا تحفظ، اظہار رائے کا حق، عقل وفطرت سے اس کی ہم آہنگی اور انسانی فکر کی تعمیر میں اس کے مؤثر کردار اور خود عیسائی دنیا میں اسلام کے اثر سے آنے والے فکری انقلاب اور دین کے معاملے میں علماء اسلام کی بے لوث اور بے غرض خدمات کے متعلق اعتراف وتحسین کے کلمات ان کی زبان پر ہوتے، لیکن افسوس! کہ عالم عیسائیت میں کم لوگ ہیں، جن میں حقیقت کے اعتراف اور سچائی کو قبول کرنے کا حوصلہ ہے۔

۲۹ر ستمبر و ۶ر اکتوبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

مسئلہ نقاب کا!

اللہ تعالیٰ کی خاص شان غنا اور بے نیازی ہے، وہ ہر طرح کی احتیاج اور ضرورت سے بری ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سراپا حاجت مند اور ضرورت مند ہیں، انسان جو اشرف المخلوقات ہے، اس کی ضروریات کا دائرہ اور بھی وسیع ہے، بہت سے جانور جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں، لیکن انسان بنے بنائے مکان کا محتاج ہے، کچھ جانور گھاس پھوس کھاتے ہیں، کچھ شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتے ہیں، لیکن انسان پکا پکایا کھانا ہی کھا سکتا ہے اور پکوان کے بھی ایک سے ایک طریقے لذت کام و دہن کی آسودگی کے لئے اس نے وضع کر رکھے ہیں، اپنی ضروریات میں صنفی ضرورت بھی ہے، مرد اپنی صنفی ضرورت کے لئے عورت کا اور عورت، مرد کی محتاج ہوتی ہے اور اسی سے نسل انسانی کی افزائش متعلق ہے۔

پھر قدرتی بات یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا حاجت مند ہوتا ہے، اس کی طرف طبعی رغبت پائی جاتی ہے، گھاس پھوس رکھا ہوا ہو تو گائے، بیل کھانے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، لیکن انسان کی بھوک اس سے بیدار نہیں ہوتی، کچا گوشت پڑا ہوا ہو، تو کتے بلی ان کو کھینچ لے جانے لئے چکر لگانے لگتے ہیں اور چیل سینکڑوں میٹر اوپر سے اسے گھور گھور کر دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگوں کی نگاہِ غفلت سے فائدہ اُٹھا کر اسے جھپٹ لے، بھونا ہوا گوشت اگر سامنے ہو، تو انسان کی بھوک کھل جاتی ہے اور منہ میں پانی آنے لگتا ہے اور آدمی کھانے کے لئے بے چین ہونے لگتا ہے، یہی حال انسان کے صنفی تقاضوں کا بھی ہے، صنف مخالف کو دیکھ کر انسان کے اندر رغبت پیدا ہوتی ہے، اس میں شہوانی جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کا نظام رکھا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ہے؛ تاکہ انسان کے طبعی تقاضے بے سمتی اختیار کر نہ کرلیں، پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ مردوں سے جو فرائض متعلق ہیں، ان کو ادا کرنے

کے لئے اقدامی صلاحیت کی ضرورت ہے، اسی لئے اس کی طرف سے جرم میں پیش قدمی کا امکان زیادہ رہتا ہے، عورتوں سے جو ذمہ داریاں متعلق ہیں، ان کے لئے ایک طرح نزاکت اور لطافت مطلوب ہے؛ بلکہ یہ اس کے حسن کا ایک حصہ ہے، اس کے اندر اقدام کا مزاج کم ہوتا ہے، اسی لئے عام حالات میں عورت کی طرف سے جرم میں پہل کے واقعات پیش نہیں آتے ، بلکہ ان کے لئے اکثر اوقات اپنی مدافعت اور محافظت بھی دشوار ہوتی ہے، اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کا لڑکا گھر سے باہر نکلا، اپنی تعلیم گاہ یا جائے ملازمت کو گیا اور واپس آنے میں گھنٹہ دو گھنٹہ کی تاخیر ہوگئی تو ماں باپ بے چین ہوجاتے ہیں، لیکن اگر کسی کی لڑکی وقت پر گھر نہیں پہنچتی تو گھر میں کہرام مچ جاتا ہے اور ہر شخص متفکر ہوجاتا ہے۔

اسی فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں متعین کی ہیں، مردوں کو حکم دیا گیا کہ زمین کی وسعتوں میں پھیل کر رزق کی تلاش کریں؛ تاکہ اہل تعلق کی ضروریات پوری کرسکیں، **فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ** (جمعہ:۱۰)، اور عورتوں کے لئے حکم ہوا کہ وہ گھر میں رہنے کی کوشش کریں اور گھر کی ملکہ رہ کر اُمور خانہ داری کو انجام دیں، **وقرن بیوتکن** (احزاب:۳۳)، اسی مناسبت سے مردوں اور عورتوں سے متعلق پردے کے مختلف احکام دیئے گئے، مردوں کے لئے کم سے کم ضروری پردہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ ان کا جسم بھی ٹخنہ سے اوپر تک ڈھکا چھپا رہے، اسی لئے کھلی آستین کے ساتھ نماز پڑھنے کو پسند نہیں کیا گیا، عورتوں کے لئے پردہ کے مختلف درجات رکھے گئے ہیں شوہر، محرم، غیر محرم اور اجنبی ہر ایک کی نسبت سے پردہ کے مستقل احکام ہیں، اُصولی طور پر چہرہ اور ہتھیلیوں کے علاوہ عورت کا پورا جسم گھر میں بھی ڈھکا رہنا چاہئے ، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لڑکی جب بالغ ہوجائے تو اس کے چہرہ اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آنی چاہئے، **الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یریٰ منھا الا وجھھا ویدھا الی المتصل** (ابوداؤد : باب فی ماتبدی المرأۃ)، غیر محرم اور اجنبی کے سامنے چہرہ کا چھپانا بھی ضروری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو گھونگٹ

(جلباب) ڈالنے کا حکم دیا(نور:۳۱)، جلباب کپڑے کے ایک حصہ کو چہرہ پر اس طرح گرا لینے کا نام ہے کہ چہرہ چھپ جائے، اسی کو اُردو میں گھونگٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آج کل زیادہ بہتر طور پر نقاب کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے، مختلف حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے، ام المؤمنین سیدنا عائشہؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ جب حالت احرام میں سفر کرتے اور مرد ہمارے سامنے آجاتے تو ہم سر سے اپنے چہرے پر کپڑے ڈال لیا کرتے اور جب مرد آگے بڑھ جاتے تو ہم چہرہ کھول لیتے (ابوداؤد، باب فی المحرمة تغطی وجهها)، اسی مضمون کی اور روایتیں بھی منقول ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد خواتین چہرہ کا بھی پردہ کیا کرتی تھیں، اسی لئے آپ ﷺ نے حج کے بارے میں فرمایا کہ مرد کا احرام سر میں ہے اور عورت کا چہرہ میں یعنی عورتیں عام حالات میں چہرہ چھپا کر رکھیں گی، لیکن احرام کی حالت میں چہرہ کو کپڑے سے بچائیں گی، اگر خواتین کو چہرہ چھپانے کا حکم نہ ہوتا تو حالت احرام کے لئے اس خصوصی حکم کی ضرورت نہ ہوتی، اس لئے یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ اسلام میں عورتوں کو چہرہ چھپانے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

افسوس کہ مغرب نے آزادی کو ایسی بے قید اور بے لگام بنا دیا ہے کہ انسان آزادی کے نام پر ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی کا غلام بن کر رہ گیا ہے، مرد کے لئے جسم پوشی مطلوب تھی، ان کے کے لئے ایسی وضع کے کپڑوں کو رواج دیا گیا جن میں پورا جسم تو چھپا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ پینٹ کے پائینچے زمین کو چھوتے ہوں اور عورتوں کے لئے ایسی وضع کے ملبوسات تیار کئے گئے، جس میں جسم کے حصے زیادہ سے زیادہ نظر آئیں، ہاتھ اور بازو کھلے ہوں اور پنڈلیاں کھلی ہوں، پیٹ اور سینہ کھلا ہو، سر کھلا ہوا اور پیٹھ کھلی ہو، گویا چھپے ہوئے حصے کم ہوں اور کھلے ہوئے زیادہ ہوں، پھر لباس کا چست اور باریک ہونا اس سے سوا ہے کہ جسم کا ایک ایک نشیب و فراز نمایاں ہو جائے، مغرب نے تہذیب اور آزادی کے نام پر ایسا صور پھونکا ہے کہ مغرب کی خواتین کو یہ لباس بھی بوجھ ہونے لگا ہے، یہاں تک کہ اب کلبوں اور تفریح گاہوں میں محض زیر جامہ پہن لینے کو بھی کافی سمجھا جاتا ہے، یہ ترقی ایسی تیز گام ہے کہ اگر کسی دن یہ اطلاع آئے کہ

مغرب میں عورتوں کے کسی گروہ نے اس ''تہمتِ لباس'' سے اپنے آپ کو بالکل ہی آزاد کرلیا ہے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

اس بے قید آزادی کا تقاضا یہ تھا کہ اگر کوئی خاتون ایسا لباس استعمال کرے، جس سے پورا جسم چھپ جائے تو اس کی بھی اجازت ہو؛ لیکن طرفہ تماشا ہے کہ عورتوں کو بے لباس رہنے کی آزادی ہے، لیکن اپنے جسم کو چھپانے پر پابندی ہے، فرانس میں اسکارف کے مسئلہ کو لے کر ایک نزاع چل ہی رہی تھی کہ اب برطانیہ میں نقاب کے مسئلہ پر گرما گرم بحث چھڑ گئی، برطانیہ کے وزیر خارجہ اور اس کے بعد وزیر اعظم کے بیانات اتنی اہمیت کے ساتھ اس سلسلہ میں آئے ہیں کہ گویا برطانیہ کا سب سے اہم مسئلہ اس وقت یہی ہے، مغرب نے مشرقی ممالک میں بھی اپنی ایک فطری نسل تیار کرلی ہے، جو مغربی نظریات پر نہ صرف لبیک کہتی ہے؛ بلکہ اس کو اسلام کا لباس بھی پہنا دیتی ہے، چنانچہ مشہور فلمی اداکارہ شبانہ اعظمی نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھا اور انھوں نے بیان دے یا کہ اسلام میں چہرہ کا پردہ ہے ہی نہیں، احکام شریعت کے بارے میں ان کا بیان دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی وکیل میڈیسن کے بارے میں اور جیسے کوئی کمپیوٹر انجینئر قانون کی تشریح وتوضیح کے سلسلہ میں اظہار خیال کرنے لگے۔

پھر لوگ اتنے ناسمجھ بھی نہیں کہ وہ اس بیان کو شبانہ اعظمی کی شخصی زندگی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش نہ کریں، لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ وہ فلم انڈسٹری سے اپنی بے پردگی کی ہی قیمت وصول کرتی رہی ہیں اور ''حسن آوارہ'' ہی ان کا سارا اثاثہ اور سرمایہ ہے، اس لئے پردہ کے بارے میں ان کا بیان کیسے حقیقت پسندانہ ہوسکتا ہے! یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے کہ کسی کی شخصی زندگی پر حرف گیری کی جائے؛ لیکن جب بات بے موقع اور بے محل کہی جاتی ہے، تو آئینہ دکھانا ایک مجبوری ہوجاتی ہے۔

خدا کا نظام یہی ہے کہ جو چیز اہم اور نازک ہوتی ہے، جس کی طرف نگاہ حرص اٹھتی ہے اور دست ہوس دراز ہوتا ہے، اس کو چھپا کر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے! پتھر اور مٹی کے ڈھیر ہر جگہ نظر آتے ہیں، لیکن سونے کے ذرات منوں اور ٹنوں پتھر کے درمیان ڈھکے ہوتے ہیں،

بے قیمت گھونگے دریاؤں اور سمندروں کے کنارے پڑے رہتے ہیں لیکن موتی سیپ کی دیواروں میں چھپا ہوتا ہے، خود انسان اپنے وجود پر غور کرے، جسم کا جو حصہ جتنا نازک ہے، اسے اتنا ہی چھپا کر رکھا گیا ہے، ہاتھ پاؤں اوپر ہیں اور انسان کا دل و دماغ اور گروہ وجگر ہڈیوں کی تہوں میں محفوظ، اسی طرح چہرے پر آنکھ کی حفاظت کے لئے دو پلکیں، زبان کی حفاظت کے لئے ۳۲ دانت اور ناک کی حفاظت کے لئے چہرہ پر ایک پورا ڈھانچہ موجود ہے، یہ حفاظتی حصار ان اعضاء کی اہمیت کو کم نہیں کرتا؛ بلکہ بڑھاتا ہے، اسی طرح خواتین کے لئے پردہ ونقاب ان کی تحقیر نہیں ہے، بلکہ ان کی لطافت وحرمت کا اعتراف ہے، نہ یہ کہنا درست ہے کہ پردہ ترقی میں رکاوٹ ہے اور نہ یہ کہ یہ خواتین کے باہمی ارتباط میں مانع ہے۔

آج مسلم ممالک میں اور خود ہندوستان میں بے شمار لڑکیاں پردہ کے ساتھ میڈیکل اور انجینئرنگ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور بعض اپنی صلاحیت واستعداد میں اپنی ہم عمر طالبات سے فائق اور ممتاز ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا یہ نقاب جائز اور ضروری ارتباط میں رکاوٹ نہیں بنتا، نقاب پہننے والی ڈاکٹر خواتین مریضوں سے اور مریضہ ڈاکٹر سے، معلّمہ طالبات سے اور طالبات معلّمہ سے اسی طرح مربوط ہوتی ہیں، جیسے ایک بے پردہ خاتون، اسی لئے نقاب کی وجہ سے سماج میں کبھی کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔

اس میں یہ ضرور ہے کہ جب ایک عورت نقاب پہنتی ہے، تو وہ عملاً اپنے اس مزاج کا اظہار کرتی ہے کہ اس کے نزدیک عفت وعصمت اور شرم وحیا متاعِ حیات ہے، وہ بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو گوارا نہیں کرسکتی، اس سے اخلاق کے دائرہ میں رہ کر ارتباط کیا جاسکتا ہے، وہ ایسا پھول نہیں ہے جسے ہر شخص اپنی ناک سے لگالے، عفت وپاکیزگی کا یہ پیغام ہوسناک ہاتھوں کو تھام لیتا ہے اور حریص اور مریض طبیعتوں کو بے جا اُمید اور ناروا توقع سے باندھ رکھتا ہے اس لئے بے جا ارتباط میں نقاب ضرور رکاوٹ بنتا ہے اور اس میں رکاوٹ ہی مطلوب ہے، مغرب نے اس رکاوٹ کو ختم کردیا اور وہ قوم جو حضرت مریمؑ جیسی عفیف خاتون کی طرف اپنی نسبت رکھتی ہے، آج دنیا میں بے عفتی کی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور پاکدامنی کا لفظ ہی اس کی

ڈکشنری سے مٹ چکا ہے، یورپ کے بہت سے ممالک وہ ہیں جہاں صحیح النسب اولاد کے مقابلہ بےنسب اولاد کی بہتات ہے اور بعض ممالک نے تو فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ اس ملک میں ایک بھی باعفت خاتون نہیں ہے، یہاں تک کہ لذت پرستی کی نہ ختم ہونے والی بھوک نے انھیں قانونِ فطرت کا باغی بنا دیا ہے اور قانون ساز اداروں نے ہم جنسی کی شادی کو سند جواز دے دیا ہے، نہ معلوم نفس کی یہ ہوس اور لذتیت، انسانیت کو کہاں تک پہنچائے گی، شاید اس مقام تک جس کا شیطان نے بھی تصور نہ کیا ہو!

۳رنومبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

چوں کفر از کعبہ می خیزد......

پڑوسی مملکت ''پاکستان'' شاید دنیا کا واحد ملک ہے، جو خاص اسلام ہی کے نام پر وجود میں آیا ہے، اس ملک کے وجود میں آنے کے لئے برصغیر کے مسلمانوں کو ایسی قربانیاں دینی پڑیں کہ ان کا ذکر سن کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے، بعض پرجوش مقررین استعارہ وتشبیہ کے طور پر کہتے ہیں کہ ''ہم سروں کا قطب مینار کھڑا کر سکتے ہیں'' لیکن ۴۸-۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع سے اور اس بعد جو خوں ریزی اور خون آشامی ہوئی، اگر ان ستم رسیدہ لوگوں کے سروں کو جمع کیا جاتا تو یقیناً اس سے انسانی سروں کے ایک ہی نہیں، کئی قطب مینار تعمیر ہو جاتے اور یہ تشبیہ ایک واقعہ بن جاتی، اللہ تعالیٰ ایسے طوفانِ بلاخیز سے ہمیشہ اس ملک کی اور پوری انسانیت کی حفاظت فرمائے، آمین!

پاکستان بنانے والوں نے اپنے لئے جس منزل کا اعلان کیا تھا، اگر وہ خلوص کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں ہوتے تو شاید خونِ مسلم کی ارزانی کا غم غلط ہو جاتا، اور شہداء کی روحوں کو بھی تسکین ہوتی، کہ ان کا خونِ جگر کسی کام آ گیا ہے، یہ مقصد تھا اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کرنا اور ایک ایسے علاقہ کی تشکیل کرنا جس میں اسلام اپنی تمام تب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہو، اور جس میں خلافت راشدہ کو عملی طور پر دیکھا جا سکے۔

لیکن افسوس کہ یہ خواب آج تک تشنۂ تعبیر ہے، اس مسلم مملکت سے بعض دفعہ ایسا کافرانہ پیغام لوگوں تک پہنچتا ہے، جو یہود ونصاریٰ کو بھی شرم سار کردے :

چوں کفر از کعبہ می خیز کجا ماند مسلمانی ؟

—— ایسی ہی باتوں میں ایک ''حقوقِ خواتین'' کے تحفظ سے متعلق وہ قانون ہے جس نے ''حدود آرڈیننس'' کی جگہ لی ہے، حدود سے متعلق یہ آرڈیننس جنرل ضیاء الحق شہید کے دور میں جاری کیا گیا، اس آرڈیننس کے ذریعہ دوسری اسلامی سزاؤں کی طرح زنا سے

متعلق حد کو بھی نافذ کیا گیا تھا اور اس میں مطلقاً زنا کو جرم قرار دیا گیا تھا، خواہ زنا کا واقعہ جبراً پیش آیا ہو یا باہمی رضامندی سے، قانونِ تحفظِ حقوق نسواں میں یوں تو بہت سے نقائص ہیں اور کئی نکات ہیں، جو احکام شرعیہ سے متصادم ہیں، لیکن اس قانون کی بنیادی فکر یہ ہے کہ اگر بالغ مرد و عورت باہمی رضامندی سے بدکاری کریں تو وہ زنا کے دائرہ میں نہیں آتا، زنا اس وقت شمار ہوگا جب اس میں جبر واکراہ کی صورت ہو، اور شریعت اسلامی اس بغاوت کو حقوقِ خواتین کے تحفظ کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مختلف فرسودہ اور ظالمانہ رسوم مروج ہیں جن کا شکار خواتین ہیں، اگر حکومت عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ان مظالم کو روکنے کی کوشش کرتی اور اس کے لئے قانون بناتی، تو یہ ایک معقول اور مناسب بات ہوتی اور یہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا، پاکستان کے بعض علاقوں میں قرآن مجید کے ساتھ نکاح کا نامعقول اور بے اصل طریقہ مروج ہے، جس میں ولی اپنے زیر ولایت لڑکی کا نکاح بزعم خود قرآن سے کر دیتا ہے، پھر زندگی بھر اس لڑکی کا نکاح نہیں کیا جاتا اور وہ ہمیشہ تجرد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے، گویا یہ عیسائیوں کے یہاں ''راہبات'' اور ہندوؤں کے یہاں ''دیوداسیوں'' کے انداز کی رسم ہے، ظاہر ہے کہ یہ عورت کے ساتھ سراسر ظلم ہے اور کسی طور جائز نہیں، پاکستان کے بعض علاقوں میں عورتوں کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، اور میراث میں انھیں تقسیم کیا جاتا ہے، بعض علاقوں میں خواتین کی مرضی معلوم کئے بغیر ان کا نکاح کر دیا جاتا ہے، خواتین وارثت سے محروم رکھی جاتی ہیں، ایک خاص صورت یہ بھی ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے نکاح کرے اور اپنی محرم رشتہ دار بہن یا لڑکی سے اس لڑکی کے محرم رشتہ دار مرد سے نکاح کر دیا جائے، نیز ان عورتوں پر کوئی مہر نہ ہو، جس کو حدیث میں ''نکاحِ شغار'' کہا گیا ہے اور جو پاکستان کے بعض قبائل میں ''وٹہ سٹہ'' کے نام سے جبری طور پر مروج ہے، اسی طرح کسی معقول سبب کے بغیر تین طلاقیں دینے کا مسئلہ ہے، ان اُمور کے بارے میں قانون سازی کی جاتی اور ان کے سد باب کی تدبیر اختیار کی جاتی تو یقیناً یہ ایک قابل تحسین بات ہوتی، چنانچہ

پاکستان کے مؤقر علماء اور مختلف مکاتبِ فکر کی نمائندہ شخصیتوں نے مل کر اس بل کی قباحتوں پر توجہ دلائی اور ان اُمور کی طرف متوجہ کیا، جن کے ذریعہ حقیقت میں ''حقوق خواتین'' کا تحفظ ہوسکتا تھا، لیکن جنرل پرویز مشرف اور ان کی حکومت نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی اور بے نظیر بھٹو کے تعاون سے یہ بل پاس ہوگیا۔

اصل میں پاکستان کے مقتدر حلقہ نے اپنا قبلہ بدل لیا ہے، انھوں نے شریعت اسلامی کے بجائے مغرب کی حیا سوز شریعت سے اپنا رشتہ استوار کرلیا ہے، اور محمد عربی ﷺ کے دامن پر سعادت کو تھامنے کے بجائے امریکہ اور برطانیہ کے حکمرانوں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا ہے، افسوس اور صد ہزار افسوس! کہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا کلمہ پڑھنے والوں کی جبینِ طاعت خدا کے بھیجے ہوئے دین اور اس کے رسول کی لائی ہوئی شریعت کے باغیوں کی چوکھٹ پر خم ہو اور زنا جیسے بدترین گناہ کو جواز کی سند دیدی جائے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جرم کا تصور ہی الگ الگ ہے، مغرب کے نزدیک جرم وہ ہے، جس سے کسی انسان کو نقصان پہنچے اور نقصان کی ایک صورت جبر واکراہ بھی ہے، خدا کی رضاء وخوشنودی اور ناخوشی کا اس میں کوئی دخل نہیں اور اسلام کی نظر میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ان باتوں پر عمل کرنا واجب ہے، جس سے اللہ خوش ہوں اور ان چیزوں سے بچنا واجب ہے، جن سے اللہ ناخوش ہوں، اس لئے ہر وہ بات جو خدا کے حکم کو توڑتی ہو، اسلام کی نگاہ میں جرم ہے، خواہ اس سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے اور وہ کام جبر واکراہ کے بغیر کیا جائے۔

سود کا لین دین آپسی رضامندی ہی سے ہوتا ہے، لیکن اس لئے حرام ہے کہ خدا نے اس سے منع کیا ہے، جوئے بازی بھی باہمی رضامندی ہی سے ہوتی ہے، لیکن حرام ہے، کیوں کہ ہمارے پروردگار نے اسے حرام قرار دیا ہے، شراب خرید کر پی جائے اور پینے والا کسی کو تکلیف نہ پہنچائے تب بھی حرام ہے، کیوں کہ خود خالق کائنات نے اس سے منع فرمایا ہے، پس کسی شئے کا حلال وحرام ہونا محض اس بات پر موقوف نہیں کہ اس سے کسی انسان کو تکلیف پہنچتی ہے یا نہیں

پہنچتی ہے؟ بلکہ اس کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ فعل خدا کی رضاء وخوشنودی کا باعث ہے یا اس کی ناراضگی اور ناخوشی کا؟ زمانۂ جاہلیت میں لوگ تجارت اور سود کو ایک ہی طرح کا معاملہ کہتے تھے، کیوں کہ دونوں میں سرمایہ پر نفع حاصل کیا جاتا ہے، قرآن مجید نے اس کی تردید کرتے ہوئے تجارت کی افادیت اور سود کی مضرت کو بیان کرنے کے بجائے ایک اُصولی بات کہی ہے کہ یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں، جب کہ خدا نے تجارت کو حلال رکھا اور سود کو حرام؟ ''احل الله البیع وحرم الربوٰا ''(سورہ بقرہ:۲۷۵) اور پھر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ مخلوق کی ناراضگی اور ناخوشی کو تو جرم سمجھا جائے اور خالق کی ناخوشی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

مغربی ملکوں میں زنا کو اسی وقت جرم سمجھا گیا ہے، جب کہ اس میں عورت کو مجبور کیا گیا ہو، اگر عورت پر جبر سے کام نہیں لیا گیا ہو تو وہ جرم نہیں، اس نقطۂ نظر پر خالص عقل و مصلحت اور فطرتِ انسانی کے پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

○ بہت سے جرائم وہ ہیں، جن کے باہمی رضامندی سے انجام دینے کے باوجود ہی مانا جاتا ہے، جیسے خودکشی، انسان اپنی خواہش سے کرتا ہے، لیکن یہ جرم ہے، ایک شخص کسی کو دعوت دے کہ وہ اسے قتل کر ڈالے تو مقتول کی طرف سے رضامندی کے باوجود قتل جرم ہی سمجھا گیا ہے، مختلف ملکوں میں سود سے متعلق قوانین موجود ہیں کہ ایک خاص شرح سے زیادہ مقرر کرنے کی اجازت نہیں، حالاں کہ یہ شرح فریقین کی رضامندی ہی سے مقرر ہوتی ہے، منشیات کی تجارت پر پابندی ہے؛ حالاں کہ نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت میں فریقین کی رضامندی شامل ہوتی ہے، اس طرح کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسے فعل کے درست ہونے کے لئے —— جو کسی پہلو سے انسانیت کے لئے مضر ہو —— محض باہمی رضامندی کافی نہیں۔

○ انسان کی رضامندی ایسی بات میں معتبر ہے، جس سے دوسروں کا نفع ونقصان متعلق نہیں؛ اسی لئے ہر قانون میں خودکشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے؛ کیوں کہ انسان سے اس کے والدین، اولاد، شوہر و بیوی وغیرہ کے حقوق بھی متعلق ہوتے ہیں، خودکشی کرنے والا جان

تلف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقین کے حقوق کو بھی تلف کرتا ہے، عفت وعصمت اور بے عفتی سے دوسرے اہل تعلق کے حقوق بھی متعلق ہوتے ہیں، ایک عورت اگر بدکاری میں ملوث ہے تو چاہے خود اپنی بے عفتی کا خیال نہ ہو؛ لیکن یہ بات اس کے ماں، باپ، بھائیوں، بہنوں، بیٹوں، اور بیٹیوں اور دوسرے قرابت مندوں کے لئے نہایت شرم وعار کا باعث ہوتی ہے اور غیرت مند لوگوں کے دل پر اس کی چوٹ خنجر وشمشیر کے زخم سے بھی زیادہ گہری اور تکلیف دہ ہوتی ہے، اس لئے محض اس عورت کی رضامندی اس فعل کے لئے وجہِ جواز نہیں بن سکتی۔

○ ہر سماج میں اس بات کو پسند کیا جاتا ہے کہ مرد وعورت کا جنسی تعلق شوہر و بیوی تک محدود ہو، یہ تمام مذاہب کا متفقہ نقطۂ نظر ہے، اور ان علماء اخلاق نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، جو مذہب پر یقین نہیں رکھتے، انسانی تاریخ میں ہمیشہ شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے جائز بیوی کا ذکر کیا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے ساتھ، جب باہمی رضامندی سے زنا کی اجازت ہوگی تو سماج میں اخلاقی قدریں ختم ہوتی جائیں گی اور ظاہر ہے یہ پورے سماج کو پہنچنے والا اخلاقی نقصان ہے، ایک فرد کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ محض اپنی خوشی کے لئے پورے سماج کو نقصان پہنچائے؟ اگر کوئی بے لباس ہو کر دفتر میں جانا اور بازار میں چلنا چاہے، تو مغرب کی حیاباختہ تہذیب میں بھی اس کی ممانعت کیوں ہے؟ اسی لئے نا کہ اس کی وجہ سے سماج کو اخلاقی نقصان پہنچتا ہے!

○ انسان کو خدا نے ''خاندان'' کی نعمت سے نوازا ہے، خاندان ہی سے اس کی شناخت متعلق ہے، دوسرے جانوروں میں نہ خاندان ہوتا ہے اور نہ ان کو خاندان کی ضرورت ہوتی ہے، خاندان کا وجود نسل ونسب کی حفاظت اور نسبی شناخت کے باقی رہنے سے متعلق ہے، جب ایک عورت کے لئے کسی ایک مرد کی وفادار بن کر رہنے کی شرط نہ ہو تو کیسے پیدا ہونے والے بچوں کی شناخت باقی رہے گی؟ یہ یقیناً ان بچوں کے ساتھ بھی حق تلفی ہے، جن کو اپنے والد کے بارے میں کوئی علم نہ ہو، یا جن کو کوئی شخص بحیثیتِ اولاد قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔

○ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زنا فطرتِ انسانی سے بغاوت ہے، خدا نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ مرد وعورت ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کی زندگی

گزاریں اور ایک عورت کا تعلق ایک ہی مرد سے رہے، یہی وجہ ہے کہ جانوروں میں اگر ایک مادہ سے مختلف نر کا اختلاط ہو تو اس سے کوئی بیماری پیدا نہیں ہوتی، لیکن ایک عورت سے کئی مرد ہم آغوش ہوں تو متعدد سنگین بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جن میں اس وقت سرفہرست ''ایڈز'' ہے، جو ہلاکت خیزی کے اعتبار سے ایٹم بم سے کم نہیں۔

○ فطرت سے جب بھی بغاوت کی جائے گی انسان کو اس کی سزا مل کر رہے گی، اسی لئے زنا کی کثرت صرف زانی اور زانیہ ہی کو متاثر نہیں کرتی، بلکہ اس سے ہونے والے نقصانات پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، چنانچہ جنسی انحراف سے پیدا ہونے والی بیماریاں —— آتشک، سوزاک، ایڈز وغیرہ —— تیزی سے پھیلنے والی متعدی بیماریاں ہیں، اس لئے زنا جیسے بدکار مردوں اور عورتوں کے لئے سم قاتل ہے، اسی طرح یہ ہونے والی اولاد اور سماج کے دوسرے لوگوں کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''...... **لم تظهر الفاحشة فی قوم قط ، حتی یعلنوا بها إلا فشا فیهم الطاعون والأوجاع التی لم تکن مضت فی أسلافهم الذین مضوا** '' (ابن ماجہ عن عبداللہ بن عمر، حدیث نمبر: ۴۰۱۹)، نیز بعض روایتوں میں ہے کہ ان میں موت کی کثرت ہو جائے گی: ...... **لا فشا الزنا فی قوم قط إلا کثر فیهم الموت۔** (مؤطا امام مالک عن عبداللہ بن عباس: ۲/۳۶۷)

پس حقیقت یہ ہے کہ زنا کی حرمت و ممانعت نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے؛ بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور معلمین اخلاق اس کے نادرست و ناروا ہونے پر متفق ہیں، یہی فطرتِ انسانی کی آواز ہے اور فطرت سے بغاوت خود اپنے لئے ہلاکت و بربادی کا سروسامان مہیا کرنا ہے، اس کا نقصان صرف ان لوگوں تک محدود نہیں جو خود گناہ کے مرتکب ہوں؛ بلکہ پورے انسانی سماج کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوتا ہے، ان سب کے باوجود محض مغربی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے زنا کی ایسی تشریح کرنا جو بدکاری کو قانونی جواز عطا کرتی ہو، کس قدر افسوسناک اور شرمناک ہے؟

یکم دسمبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

ہفتہ عشرہ پہلے سپریم کورٹ نے اُڑیسہ کی فاطمہ بی بی سے متعلق مقدمہ میں جو فیصلہ صادر کیا ہے، وہ دردمند دل رکھنے والے مسلمانوں کے لئے ایک چونکا دینے والا واقعہ ہے اور مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ وہ خود رضا کارانہ طور سے اپنی شریعت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور اپنے سماج میں احکام شریعت کے نفاذ کے لئے کسی بیساکھی کے محتاج نہ رہیں، فاطمہ بی بی کو اس کے شوہر نے نشہ کی حالت میں یکبارگی تین طلاق دے دی، عدالت نے ان طلاقوں کو غیر واقع قرار دیا اور مرد و عورت کو اس بنیاد پر ایک ساتھ رہنے کی اجازت دی کہ وہ دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور یہ بات انسان کے بنیادی حقوق میں ہے کہ کوئی شخص باہمی رضامندی سے اپنے بارے میں فیصلہ کرے۔

بے شک عدالتیں قابل احترام ہیں اور معزز عدالتیں ہی مظلوموں کے لئے انصاف کا آخری سہارا ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہماری عدالتوں نے پوری غیر جانبداری کے ساتھ بہت سے ایسے فیصلے کئے ہیں، جن کے ذریعہ ملک کا سر اونچا ہوا ہے اور دنیا کے سامنے ہندوستانی عدلیہ کی حوصلہ مند شبیہ سامنے آئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عدالتیں ملکی قانون کی تشریح کرتی ہیں، کسی بھی مذہب کے احکام کی تشریح کا حق وہ لوگ ادا کر سکتے ہیں، جو براہ راست اس مذہب کی تعلیمات سے واقف ہیں اور ان احکام کی روح پر نظر رکھتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے چند وضاحتیں بہت ضروری معلوم ہوتی ہیں :

اس فیصلہ میں تین باتیں قابل توجہ ہیں :

(۱) حالت نشہ کی طلاق۔

(۲) ایک دفعہ کی تین طلاقیں۔

(۳) اور طلاق کے باوجود سابق شوہر و بیوی کا باہمی رضامندی کے ساتھ ایک ساتھ رہنا۔

جہاں تک حالت نشہ کی طلاق کی بات ہے تو اس حالت میں دی گئی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں قرآن وحدیث کا کوئی صریح حکم موجود نہیں، قرآن وحدیث کے بعد سب سے زیادہ اہم صحابہ ﷺ کے فتاویٰ ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے دین کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھا ہے، صحابہ ﷺ کے فتاویٰ اس سلسلہ میں مختلف ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حالت نشہ کی طلاق کو واقع قرار دیتے ہیں، (دیکھئے: موسوعہ عمر بن خطابؓ: ۳۹۳، تصرفات السکران) اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نزدیک حالت نشہ میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی، (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹/۵) پھر ائمۂ مجتہدین کی آراء میں بھی اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور ایک قول کے مطابق امام شافعیؒ کے نزدیک حالت نشہ کی طلاق واقع ہوجاتی ہے، (المدونۃ الکبریٰ: ۱۳۰/۲، کتاب الام: ۲۵۳/۳، وغیرہ) امام احمد بن حنبلؒ اور ایک اور روایت کے مطابق امام شافعیؒ کے نزدیک حالتِ نشہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، یہی رائے ممتاز شافعی فقیہ امام مزنیؒ کی بھی ہے۔ (المغنی لابن قدامہ: ۱۱۵/۴)

حنفیہ کے نقطۂ نظر کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی کو جبراً نشہ پلا دیا گیا ہو یا کسی نے بہ طور دوا کے نشہ آور چیز استعمال کی ہو یا لاعلمی میں نشہ آور شئی کا استعمال کرلیا ہو، اس کی وجہ سے نشہ پیدا ہوا اور اس حالت میں طلاق دے دی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، ہاں اگر اس نے بہ طور لذت اور لہو لعب کے شراب پی لی، یعنی اس حالت میں نشہ کا استعمال کیا جب کہ وہ اس کے استعمال پر مجبور نہیں تھا، تو اس حالت میں دی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، علامہ کاسانیؒ نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن خود حنفیہ میں مشہور محدث امام طحاویؒ اور بلند پایہ فقیہ امام کرخیؒ کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک نشہ بہ طور حرام استعمال کیا گیا ہے، یا شرعی گنجائش کی صورت میں، حالت نشہ کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (دیکھئے: بدائع الصنائع: ۹۹/۳، خلاصۃ الفتاویٰ: ۷۵/۲)

جن حضرات نے حالت نشہ کی طلاق کو معتبر نہیں مانا ہے، ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نشہ کی

حالت میں آدمی کے اندر خیر وشر کا فیصلہ کرنے اور اختیار وصوابدید سے کسی کام کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی، لہٰذا جیسے پاگل، بے ہوش، مخبوط العقل اور خوابیدہ شخص کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اسی طرح حالتِ نشہ میں جو شخص ہو اس کی طلاق بھی واقع نہیں ہونی چاہئے اور جن حضرات نے طلاق واقع قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس کا سبب سرزنش ہے، یعنی نشہ خوار شخص کو اس بات کی سزا دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی سے محروم ہو جائے —— اسی بناء پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں بہت سے اصحابِ تحقیق علماء احناف کی رائے ہے کہ حالتِ نشہ کی طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے؛ کیوں کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے، قانونی طور پر نشہ نوشی کی کھلی آزادی ہے اور ہندوستان کے سماجی ماحول میں طلاق مردوں کے لئے تو سزا نہیں بنتی، البتہ بے قصور عورتوں کے لئے سزا بن جاتی ہے؛ اس لئے ہندوستان کے ماحول میں حالت نشہ کی طلاق واقع نہیں ہونی چاہئے، بہر حال! یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں دونوں طرح کی آراء پائی جاتی ہیں، اور دونوں کے پاس اپنے اپنے نقطۂ نظر کے لئے دلیلیں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ تین طلاقوں کا ہے، اگر تین طلاقیں تین الگ الگ نشستوں میں دی جائیں تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے، تین طلاقیں ایک ساتھ دے دینا درست نہیں اور یہ طلاق دینے کے مقررہ شرعی طریقہ کی خلاف ورزی ہے، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں، لیکن اگر کوئی شخص ایک ساتھ تین طلاقیں دے ہی دے، تو تینوں طلاقیں واقع ہوں گی یا ایک ہی طلاق؟ اس میں کسی قدر اختلاف ہے، جمہور فقہاء —— ائمہ اربعہ اور امام بخاریؒ وغیرہ —— کی رائے ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی، علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے ممتاز شاگرد علامہ ابن قیمؒ کے نزدیک ایسی صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، موجودہ دور میں غیر مقلد حضرات بھی اسی کے قائل ہیں، اس مسئلہ پر دونوں نقاط نظر کے حاملین کی طرف سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہاں تک کہ بدقسمتی سے اسے مناظرہ بلکہ اس سے بڑھ کر باہمی جدال کا موضوع بھی بنا لیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں نقاطِ نظر کے دلائل کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تیسرا مسئلہ طلاق واقع ہوجانے کے باوجود مرد وعورت کے باہمی رضامندی سے ایک ساتھ رہنے کا مسئلہ ہے، یہ اہم مسئلہ ہے اوراس میں اُمت کے کسی گروہ کا اختلاف نہیں، کہ جب شرعی نقطۂ نظر سے میاں بیوی کا رشتۂ نکاح ختم ہوجائے تو اب ان کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی گنجائش نہیں، نکاح بنیادی طور پر حلال بنیادوں پر مرد وعورت کے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذارنے کا معاہدہ ہے، جب اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کیا جاتا ہے تو عورت مرد کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ مرد کو یک طرفہ طور پر طلاق کے ذریعہ اس معاہدہ کو ختم کرنے کا حق حاصل ہے، ہاں عورت کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ نکاح کے وقت ’ تفویض طلاق‘ کرالے اور اپنے لئے بھی حق علاحدگی حاصل کرلے، جب کسی خاص قانون کے تحت معاہدہ کیا جاتا ہے تو معاہدہ میں اس قانون کی تفصیلات ازخود شامل ہوتی ہیں، لہٰذا نکاح وطلاق سے متعلق تمام احکام نہ صرف شرعی اُصولوں کی بنیاد پر معاہدۂ نکاح میں شامل ہیں بلکہ عاقدین نے اپنی رضامندی اور اختیار سے ان تمام احکام کی پاسداری اور اس پر عمل آوری کا عہد کیا ہے، طلاق کے ذریعہ علاحدگی اور شرعاً حرمت پیدا ہوجانے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اس عہد کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور حکم خداوندی سے سرتابی ہے۔

انسانی حقوق کی بے شک بڑی اہمیت ہے، لیکن کوئی بھی آزادی اگر قید و بند سے بالکل ہی آزاد ہوجائے تو پھر وہ انسانیت کے لئے زہر بن جاتی ہے اور معاشرہ کو تباہ کرکے رکھ دیتی ہے، انسان کو حق ہے کہ وہ لباس پہنے یا بے لباس رہے، تو کیا لوگوں کو سڑک پر بے لباس چلنے کی اجازت دے دی جائے گی؟ رضامندی اس وقت معتبر ہے جب وہ قانون اور اخلاق کے دائرہ میں ہو، اگر طرفین کی رضامندی کسی عمل کے جواز کے لئے کافی ہو تو قحبہ گری کرنے والوں کا کیا قصور، کہ وہ باہمی رضامندی کے ساتھ ہی تو بدکاری کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، پھر بڑھتے ہوئے کرپشن کو کیا کہا جائے گا، کہ اس میں بھی تو رشوت لینے والے اور دینے والے کی رضامندی شامل ہوتی ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ بے قید آزادی اور کسی فعل کو جائز ٹھہرانے کے لئے محض فریقین کی رضامندی معاشرہ کے لئے نہایت ہی مضر ہے۔

انسانی حقوق، انسانی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے ہیں، جہاں آزادی سماج کی مصلحت کو پورا کرنے اور نافع بننے کے بجائے اس کو تباہ کردینے کا سبب بن سکتی ہو، وہ آزادی پھول نہیں کانٹا ہے جس کی چبھن سماج کو بے سکون کردے گی۔

مسلمانوں کے لئے مقام فکر ہے کہ آخر شریعت اسلامی سے کھلے طور پر متصادم فیصلے کیوں ہوتے ہیں؟ اسی لئے نا کہ ہم اپنے مقدمات ان عدالتوں میں لے جاتے ہیں، اگر ہم خود اپنے آپ پر احکام شریعت کو نافذ کریں تو کوئی طاقت ہمیں اس پر عمل کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، اسلام کے معنی خود سپردگی کے ہیں، ہم نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردیا ہے، اس سپردگی میں یہ بات شامل ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو خدا کی خوشنودی کے تابع رکھیں، ہم اپنے وقتی مفادات کو احکام شریعت کے سامنے قربان کرنا سیکھیں، ہم نے اپنے اختیار، اپنی خواہش، اپنی رضامندی اور رغبت کے ساتھ اپنی گردن میں خدا کی بندگی کا طوق ڈال لیا ہے، یہ غلامی ہمیں سلطانی سے زیادہ عزیز ہے اور یہ پستی ہمیں ظاہری بلندی سے زیادہ محبوب ہے، اس لئے ہمارے لئے کسی طور یہ روا نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان اور خدا کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا بھی کہیں اور اپنے حقیر مفادات اور ناروا خواہشات کے مقابلہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پامال بھی کرتے رہیں!!

۵/مئی ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑

ایک خطرناک اور دور رس سازش

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ جتنی قومیں ہیں، مذہب سے ان کا رشتہ برائے نام رہ گیا ہے، مذہب کی حیثیت ان کے نزدیک ایک ''روایت'' کی رہ گئی ہے اور اس کا ذکر محض ایک قومی شناخت کے پہلو سے کیا جاتا ہے، مثلاً مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں دو بڑے مذہبی گروہ بستے ہیں، عیسائیوں میں اس وقت غالب تعداد ان لوگوں کی ہے جو خدا کا انکار کرتے ہیں، جو نبوت و رسالت کے قائل نہیں ہیں اور جن کے یہاں آخرت میں انسان کے محاسبہ کا کوئی تصور نہیں ہے، مذہب سے ان کا تعلق رسمی ہے، ہزار میں دو چار آدمی ہفتہ میں ایک دن چرچ چلے جاتے ہیں، اسی طرح سال میں ایک بار قومی تہوار کی طرح کرسمس مناتے ہیں، جس میں اکثر عبادت و بندگی کا تو شائبہ تک نہیں ہوتا، پوری طرح تفریح اور کھیل کود کا رنگ غالب رہتا ہے اور ایک جشن طرب کی طرح منایا جاتا ہے۔

ہندو بھائیوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں سے قطعاً نابلد ہیں، عام ہندو کا حال یہ ہے کہ عمر گذر جاتی ہے وہ ویدوں، اپنشدوں، پرانوں، گیتا اور رامائن وغیرہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، بس کچھ پوجا کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں، کچھ پرشور اور ہنگامہ خیز تہوار ہوتے ہیں، اس سے زیادہ مذہب سے اس گروہ کا تعلق نہیں، ہندو مذہب کے ماننے والوں کے لئے ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اس مذہب کی کوئی متعین آئیڈیالوجی نہیں ہے، اس لئے جو خدا کا انکار کرتے اور مذہب کا مذاق اُڑاتے ہیں، وہ بھی ہندو سمجھے جاتے ہیں، اور جو لوگ توحید کے قائل اور بت پرستی کے مخالف ہیں، جیسے آریہ سماجی، وہ بھی ہندو ہیں، جو مورتی پوجا کرتے ہیں وہ بھی ہندو ہیں، یہاں تک کہ ہندوؤں کے بعض ایسے فرقے ہیں، جن کے یہاں خدا کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔

مذہب کے احکام اور حلال وحرام کے قوانین سے نہ ہندوؤں کو کوئی تعلق ہے اور نہ عیسائیوں کو کوئی سروکار، اس سے اگر استثناء ہے تو صرف مسلمانوں کا، مسلمانوں کے پاس ان کی آسمانی کتاب محفوظ صورت میں موجود ہے، اس کتاب کے پڑھنے پر مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری نہیں ہے، ہر مسلمان قرآن مجید پڑھ سکتا ہے، شاید ہی کوئی معمولی پڑھا لکھا مسلمان

ایسا ہو جو قرآن مجید کی تلاوت سے بالکل ہی محروم ہو، اس لئے بہت سی کوتاہیوں کے باوجود یہ کتاب ہر گھر میں بلکہ گھر کے ہر فرد کے پاس ہے، لاکھوں کی تعداد میں وہ مرد وعورت ہیں جنھوں نے قرآن مجید کو اپنے سینہ میں محفوظ کر رکھا ہے، اسی طرح قرآن مجید کے ترجمہ وتشریح سے واقف لوگوں کی تعداد بھی لاکھوں تک پہنچتی ہے، مسلمانوں کی شاید ہی کوئی آبادی ہو، جس میں دو چار علماء قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر سے واقف نہ ہوں، مسجدوں میں قرآن مجید کا درس دیا جاتا ہے اور دینی مدارس میں پوری تحقیق کے ساتھ قرآن مجید کا ایک ایک حرف پڑھایا جاتا ہے۔

پھر قرآن کے احکام وقواعد کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں اور اس کے بنیادی نوعیت کے احکام سے عام مسلمان بھی آگاہ ہیں، مسلمان صرف اپنی عبادتوں (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور صدقہ وقربانی) ہی میں احکام شریعت کے پابند نہیں ہیں، بلکہ وہ نکاح وطلاق، میراث، تجارت وکسبِ معاش اور حلال وحرام سے متعلق دوسرے قوانین میں بھی شریعتِ اسلامی پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عمل نہیں کر سکے تو شرمندگی کا احساس رکھتے ہیں، پھر ان کی رہنمائی کے لئے ہر جگہ ائمۂ مساجد، مدارس کے اساتذہ اور دوسرے علماء تیار رہتے ہیں اور خاص اس مقصد کے لئے دارالافتاء کا نظم قائم ہے، جس سے اہم سوالات دریافت کئے جاتے ہیں۔

پھر یہ دین سے تعلق ہی کی بات ہے کہ لوگ ضمیر کی آواز پر علماء اور اربابِ افتاء کے پاس آکر اپنی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کو بھی بیان کرتے ہیں، جنھیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ جس پر کسی زبان نے ٹوکا ہے، یہ اَن دیکھی اور اَن کہی غلطیوں کا اعتراف محض خدا کے خوف سے ہوتا ہے، خدا کا یقین اور خدا کی طرف سے نفع ونقصان کا عقیدہ مسلمانوں کے رگ وریشہ میں پیوست ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی متاع ہے، چنانچہ آج دنیا میں مسلمانوں پر جو مظالم روا رکھے جا رہے ہیں، اگر کوئی اور قوم ہوتی تو کب کی ظالموں کے سامنے سپر انداز ہو چکی ہوتی اور اپنے مذہب سے بچا کھچا تعلق بھی منقطع کر لینے پر آمادہ ہو جاتی، لیکن اُمتِ مسلمہ کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے۔

یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ اُمت ہزار آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گذر کر بھی اپنے دین سے محرومی کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ملک کے ملک تباہ کئے جا رہے ہیں، آگ کا دریا بہایا جا رہا ہے، بہت سے شہر ہیں، جس کا چپہ چپہ اس اُمت کے خون سے سرخرو ہو چکا ہے،

معصوم بچوں کی لاشیں تڑپ رہی ہیں اور کتنی ہی عورتیں اپنے سہاگ سے محروم ہورہی ہیں، غرض جان و مال اور عزت و آبرو ہر چیز دشمنوں کا ہدف ہیں اور اس اُمت کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں ہوتا، ان کے ایمان کی ٹہنی کو جس قدر کاٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی قدر پھیلتی جاتی اور لہلہا اُٹھتی ہے، ان کی غیرتِ دینی کی آگ جتنی بجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، اتنا ہی اس کے شعلے بھڑکتے چلے جاتے ہیں، آزمائشیں اور ابتلائیں ان کو ایک نئے ولولہ اور نئی طاقت سے ہمکنار کرتی ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جس نے مغرب سے مشرق تک دشمنانِ اسلام کو حیرت واستعجاب میں بھی مبتلا کر رکھا ہے اور اس سے زیادہ حسد اور غیظ وغضب میں بھی۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہمارے دشمنوں نے اس بارے میں جو سمجھا ہے اور صحیح سمجھا ہے، وہ یہی ہے کہ جب تک قرآن سے اس اُمت کا رشتہ نہیں ٹوٹے گا، اس وقت تک ان کے ایمان ویقین کا اغوا نہیں کیا جاسکتا اور ان کے اذہان وقلوب زیر نہیں ہوسکتے، کیوں کہ قرآن ایک زندہ اور بے آمیز خدائی کتاب ہے اور جو چیز زندہ اور بے آمیز ہوتی ہے، اسی میں تاثیر ہوتی ہے، مردہ شیر مٹی کے ایک ڈھیر کی طرح ہے، اسی طرح دنیا میں اس وقت جو مذہبی کتابیں موجود ہیں خدا کی طرف سے ان کا دور ختم ہو چکا ہے، وہ زندگی سے محروم ہیں اور انسانی ملاوٹ نے انھیں بے تاثیر کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے یہ فکر وعمل میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کرسکتیں، لیکن قرآن مجید نہایت انقلاب انگیز خدائی پیغام ہے، جو انسانی سماج میں صالح تبدیلیاں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انسان کے اندر مفاسد کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور طاقت پیدا کرتا ہے، اسی لئے اس وقت عالمگیر سطح پر مسلمانوں کو قرآن مجید سے کاٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یہ کوشش سہ رُخی ہے، پہلا رُخ یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کو بدنام کیا جائے اور اسے تشدد اور دہشت گردی پر مبنی قرار دیا جائے، موجودہ امریکی وزیر خارجہ کونڈالیزا رائس پہلے کہہ چکی ہیں کہ اس کتاب میں یقیناً کوئی بات ہے، جس سے اس کے ماننے والوں میں تشدد پیدا ہوتا ہے، امریکہ اور مغربی اقوام نصابی کتابوں سے بعض قرآنی آیات نکال دینے کا مطالبہ کرتی رہی ہیں اور بہت سے مسلم ملکوں نے بے شرمی اور بے حمیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مطالبہ کو قبول بھی کرلیا ہے، یہاں تک کہ سعودی عرب کی طرف سے بھی مغرب کے اس حکم کے سامنے سر جھکا

دینے کی اطلاعات آرہی ہیں، شاید اب دینی مدارس سے بھی اس طرح کا مطالبہ کیا جائے اور پھر نعوذ باللہ خود قرآن مجید کے نسخوں ہی سے ان آیات کے حذف کردینے کی بات کہی جائے، لیکن یقیناً ایسی مذموم کوششیں ناکام و نامراد ہی رہیں گی، واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت دلوں سے کم کردی جائے، چنانچہ بار بار آپ ﷺ کی شانِ گرامی میں گستاخی کا ارتکاب کیا جاتا ہے، امریکہ کی پارلیمنٹ میں آپ ﷺ کا فرضی اسٹیچو اس طور پر نصب ہے کہ ایک ہاتھ میں کتاب ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے، یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے تلوار کے زور سے اپنی کتاب کو منوایا ہے، ڈنمارک کے کارٹون کا فتنہ پہلے بھی اُٹھ چکا ہے اور پھر تازہ فتنے نے سر اٹھایا ہے، موجودہ پوپ کا معاندانہ بیان چند ہی دنوں پہلے آچکا ہے، گویا اسلام کی توہین اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ایک تسلسل ہے، جو مغربی اقوام کی طرف سے جاری ہے، اس کا مقصد جہاں اپنے جذبۂ عناد کی تسکین ہے، وہیں مسلمانوں کو مشتعل کرنا اور اس اشتعال کو شدت پسندی کا نام دے کر ان کو بدنام کرنا بھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کی تہہ میں ایک اور ناپاک مقصد بھی کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی بات بار بار کہی جاتی ہے تو کان اس کے سننے کا عادی ہوجاتا ہے، مسلمانوں کو ایسی باتوں کے سننے کا عادی بنادیا جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت و حرمت کا جو جذبۂ بیکراں اس اُمت کے اندر رکھا گیا ہے — کہ اس کے لئے آپ ﷺ کے نام پر اپنی رگِ گلو کا کٹادینا اور اپنی اولاد اور جگر کے ٹکڑوں کو بھی نثار کردینا ایک خوش بختی اور سعادت ہے — کو آہستہ آہستہ کم اور ختم کردیا جائے، جیسا کہ یہودیوں نے عیسائیوں کے ساتھ کیا ہے، مسلمان تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہیں، مگر عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ خدا کا بیٹا اور خدائی میں شریک سمجھتے ہیں، اس کے باوجود صورتِ حال یہ ہے کہ آج یورپ میں ایسے ناول لکھے جاتے ہیں، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہایت ناشائستہ باتیں کہی جاتی ہیں، ایسی فلمیں بنائی جاتی ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ صرف یہ کہ ایسے ناول اور ایسی فلم کے بارے میں عالم

عیسائیت کی طرف سے کوئی مؤثر صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی، بلکہ اس کا شمار مغرب کے مقبول ناولوں اور فلموں میں ہوتا ہے، یہود جنھوں نے ہمیشہ انبیاء کی پاکیزہ سیرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے، یہی کیفیت مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ جب ان کے دل میں قرآن لانے والے رسول ﷺ کی عظمت باقی نہیں رہے گی تو قرآن کی عظمت کیوں کر باقی رہے گی؟

تیسرا رُخ یہ ہے کہ اُمت کو علماء سے کاٹ دیا جائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کو قرآن مجید کی حفاظت اور اس کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے، ان ہی کی وجہ سے قرآن اور قرآن کی لائی ہوئی شریعت سے مسلمانوں کا رشتہ قائم ہے، یہی گروہ ہے جو الحاد و بد دینی کے مقابلہ سد راہ بنا ہوا ہے، یہی لوگ ہیں جو مغرب سے اُٹھنے والے فکری و تہذیبی ارتداد کے مقابلہ میں کھڑے ہیں، ان ہی کی کوششوں سے اُمت میں غیرتِ ایمانی باقی ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اُمت کو ان سے جڑے رہنے کا حکم دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمین میں علماء ان ستاروں کی طرح ہیں، جنھیں دیکھ کر خشکی و تری کی تاریکی میں منزل کا راستہ دریافت کیا جاتا ہے، اگر یہ ستارے ٹوٹ جائیں تو لوگ راستہ سے بھٹک جائیں (مسند احمد عن انسؓ، مجمع الزوائد: ۱۲۱/۱)، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم بنو یا متعلم یعنی علم حاصل کرنے والے یا علماء کی بات سننے والے یا ان سے محبت رکھنے والے اور پانچویں نہ بنو، یعنی علم اور اہل علم سے بغض رکھنے والے، کہ ہلاک ہوجاؤ گے (طبرانی عن ابی بکرۃ: حوالۂ سابق) آپ ﷺ نے عالم کو عابد پر ستر درجہ افضل قرار دیا (مجمع الزوائد: ۱۲۲/۱)، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جو شخص بڑے کا احترام نہ کرے اور چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور عالم کا مرتبہ شناس نہ ہو وہ ہم میں سے نہیں ہے (مسند احمد، حوالۂ سابق)، حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عالم کے ساتھ منافق ہی استخفاف یعنی بے وقعتی کا سلوک کرسکتا ہے (حوالۂ سابق)، آپ ﷺ نے اسے قیامت کی علامتوں میں سے قرار دیا ہے کہ لوگ علماء کی طرف سے بے پرواہ ہوجائیں (طبرانی عن ابی مالک اشعریؓ، حوالۂ سابق)، ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ علماء کو الگ کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ میں نے تم کو اس لئے اپنے علم کا حامل نہیں بنایا تھا کہ تم کو عذاب دوں، اس لئے جاؤ میں نے تمہاری مغفرت کردی۔ (طبرانی عن ابی موسیٰ اشعریؓ، حوالۂ سابق: ۱۲۶/۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات اسی لئے ہیں کہ اُمت ہمیشہ علماء سے مربوط رہے، تا کہ کوئی گروہ انھیں راہ حق سے ہٹا نہ سکے اور آج مسلمانوں میں جو کچھ دینی تعلق پایا جاتا ہے، وہ اسی کا نتیجہ ہے، اس لئے عالمی سطح پر دینی مدارس اور علماء کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مدارس کو بے ثبوت دہشت گردی کا اڈہ کہا جاتا ہے، علماء کے بارے میں مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ اُمت پر بوجھ ہیں، انھیں قدامت پرست، نامعقول، دقیانوسی، عصری تقاضوں سے نابلد اور جاہل قرار دیا جاتا ہے، تا کہ مسلمانوں میں ان کی کوئی وقعت باقی نہ رہے، ابھی رمضان المبارک شروع ہونے سے پہلے فتویٰ اور مفتی سے متعلق 'کوبرا پوسٹ' کے تعاون سے 'اسٹار نیوز' نے جو پروگرام دکھایا، اس کی نوعیت یہ ہے کہ کچھ سازشی لوگوں نے خوشامد کر کے ہدیہ، تحفہ اور مدرسہ کی اعانت کے نام پر بہ اصرار رقمیں دیں، انھیں فتویٰ وہی دیا گیا جو ان مسائل کے بارے میں دیا جاتا ہے اور روپیہ پیش کرنے والوں کی گفتگو کو حذف کر کے صرف پیسے لینے اور فتویٰ دینے کا منظر دکھایا گیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ پیسے دے کر اپنی ''مرضی کے فتوے'' حاصل کئے گئے، جو بالکل خلافِ واقعہ ہے۔

ان کوششوں کا مقصد علماء کو بدنام کرنا، انھیں بے وقعت بنانا، ان کے اعتبار و اعتماد کو مجروح کرنا اور مسلمانوں کو ان سے کاٹنا ہے، کیوں کہ اگر اس اُمت کا رشتہ علماء سے ٹوٹ جائے تو قرآن سے ان کا رشتہ کاٹنے اور دین و شریعت کا انھیں باغی بنانے میں چنداں دشواری نہیں ہوگی، روس میں جب اشتراکی نظام آیا تو مسلم علاقوں میں یہی حرکت کی گئی، پہلے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ علماء و مشائخ کو خوب بدنام کیا گیا، مدارس اور خانقاہوں کے بارے میں پروپیگنڈے کئے گئے، یہاں تک کہ بڑی تعداد میں علماء و مشائخ شہید کئے گئے، اسلامی شعائر کی بے حرمتی کی گئی اور یہ سب کچھ روسی فوجیوں نے نہیں کیا؛ بلکہ ان نسلی مسلمانوں نے بھی کیا جن کو دین سے باغی بنا دیا گیا تھا اور جب عوام علماء سے کٹ گئے تو انھیں الحاد و دہریت میں مبتلا کرنا کوئی دشوار نہیں رہا، اس لئے مسلمانوں کو خوب چوکنا رہنا چاہئے، ایسی سازشوں سے باخبر رہنا چاہئے اور کبھی بھی دشمنوں کا آلۂ کار نہیں بننا چاہئے؛ کیوں کہ حالات بہت نازک ہیں اور ان کے مقابلہ کے لئے فراستِ ایمانی مطلوب ہے!

۱۳، ۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۶ء

❑ ❑ ❑ ❑